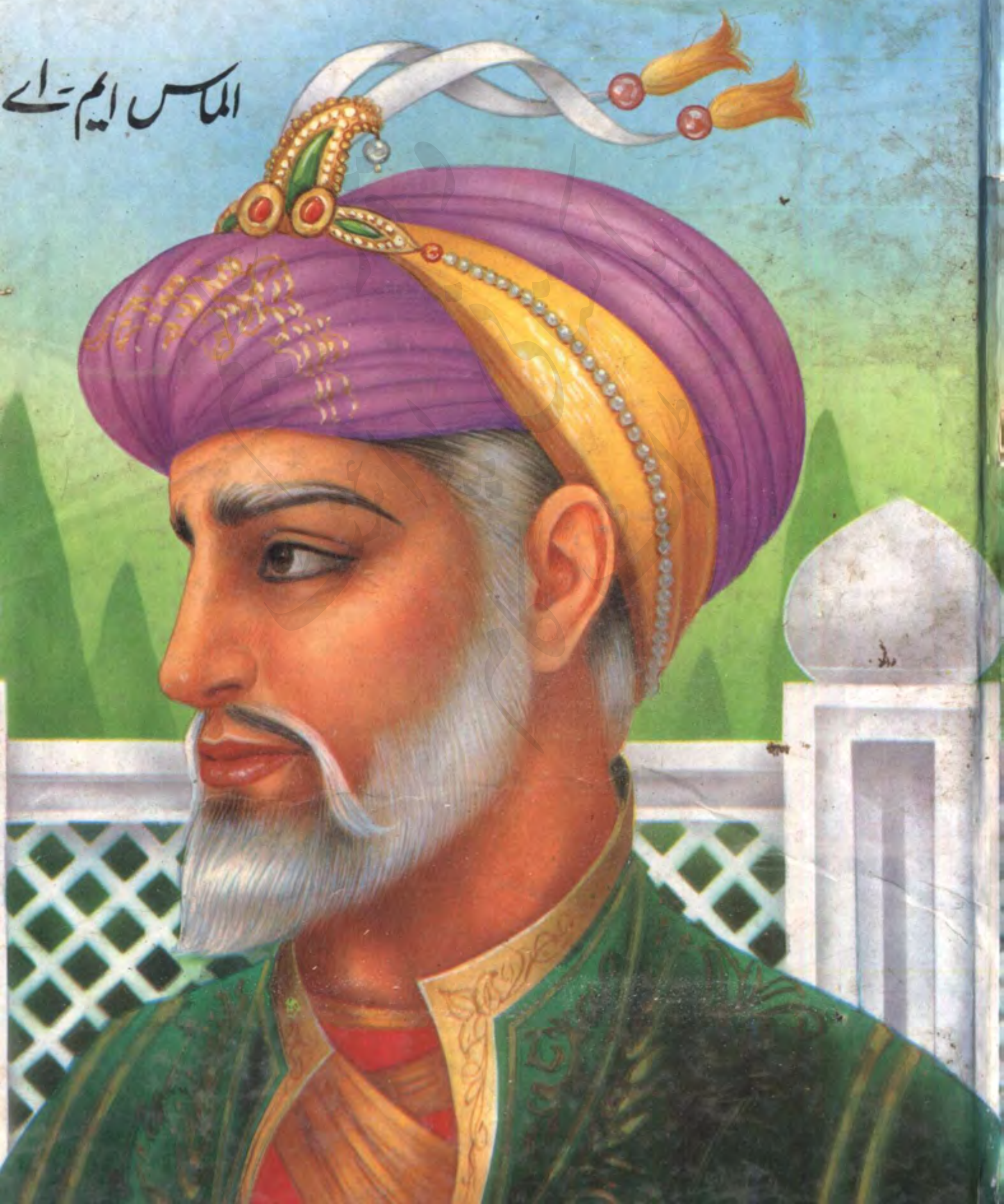
اورنگ زیب عالمگیر



المکس ایم۔ اے

غریب شہر

سلطنت مغلیہ کے بانی ظہیر الدین بابر کی برصغیر میں آمد سے پہلے یہاں پر سلاطین غزنہ، سلاطین غوریہ، خاندان غلاماں، خلجی خاندان، تغلق خاندان، سید خاندان اور لودھی خاندان کی حکمرانی تھی۔ یہ تمام خاندان مسلمان تھے اور ان میں سلطان محمود غزنوی سلطان شہاب الدین غوری، سلطان التمش، رضیہ سلطان، سلطان بلبن، سلطان جلال الدین خلجی، سلطان محمد تغلق، سید مبارک شاہ، سکندر لودھی جیسے جلیل القدر سلطان اور حکمراں پیدا ہوئے مگر ان کی حکومتوں کو اسلامی سلطنت نہیں کہا جا سکتا بلکہ وہ سب مسلمان حکومتیں تھیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت اور مسلمانوں کی حکومت میں نمایاں فرق ہے کیونکہ اسلام کے نزدیک محض قیام حکومت کوئی معیار نہیں۔ اگر اسلام کا مقصد صرف حکومت قائم کرنا ہوتا تو خلیفہ دوم حضرت عمر کے دور خلافت میں مسلمانوں کے قدم برصغیر کی خاک کو چھو چکے تھے اور انہیں آگے بڑھنے سے روکنے والا کوئی نہ تھا مگر خلیفہ دوم نے اس بات کی اجازت نہ دی کہ مسلمان برصغیر پر قبضہ کریں یا قیصر و کسریٰ کی مملکتوں کو پامال کر ڈالیں وہ جانتے تھے کہ ممالک عجم کی جگمگاتی تہذیبیں اور اسلامی ثقافت کا میل جول، اسلامی نظریات کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔

پس اگر یہ کہا جائے کہ مندرجہ بالا مسلمان حکمرانوں نے مسلمان حکومتیں تو قائم کر لیں مگر وہ اسلامی سکونت قائم نہ کر سکے تو غلط نہ ہو گا۔ یہی بات سلطنت مغلیہ پر بھی صادق

آتی ہے۔ اس لیے کہ خاندان مغلیہ کی حکومت کے قیام کا مقصد محض قیام حکومت تھا اور مغل حکمرانوں اور شہنشاہوں نے کبھی بھی اسلامی نظریاتی حکومت قائم کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ ایک نظریاتی اسلامی حکومت میں شہنشاہیت اور آمریت کی کوئی گنجائش نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی سلطانی اور شہنشاہی کے دور میں انصاف اور رواداری کا دور دورہ رہا۔ پل تعمیر ہوئے۔ مسجدیں بنائی گئیں اور فلاح عامہ کے دیگر کام انجام دیئے گئے مگر اسلام میں ایک نظریاتی مملکت کا تصور یہ تو نہیں۔ چنانچہ ہوا وہی جس کا اندیشہ خلیفہ دوم کو تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ عربی اور عجمی تہذیبیں خلط ملط ہوئیں مسلمان حکمرانوں نے غیر مسلم عورتوں سے بیاہ رچائے اور جب ان سے شاہی اولاد ہوئی تو خون کا رنگ بدلا، روح کی خوشبو میں فرق پڑا دین مفلوج اور مسموم ہوئے۔ حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں رہی مگر روح اسلامی پرواز کر گئی۔ مغل شہنشاہوں کی شان و شوکت تو عیاں ہے مگر اسلام کی شان و شوکت میں اضافہ ہونا تو الگ رہا وہ اپنی اصلیت بھی قائم نہ رکھ سکا۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں آج بھی برصغیر کی وہ تواریخ داخل تدریس ہیں جو انگریزوں نے ہندوؤں کے گٹھ جوڑ سے ترتیب دی تھیں۔ گزشتہ ایک صدی سے برصغیر کی اسلامی تاریخ کو دانستہ طور پر جس انداز میں مسخ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے وہ علمی بد دیانتی کی بدترین مثال ہے۔ اس سلسلہ میں سرہنری ایلیٹ نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے ہی مسلم تاریخ کے اہل ماخذوں (یعنی عربی، فارسی) کو انگریزی میں منتقل کرنا شروع کر دیا تھا اس ضمن میں اس نے شاہی کتب خانہ اور نواب ضیاء الدین کے کتب خانہ سے خوب استفادہ کیا۔ یہ کام ایلیٹ کے بعد ڈاؤسن نے جاری رکھا اور ۱۸۷۷ء میں اس کی تکمیل ہوئی اس ضخیم کتاب کی ترتیب کے پیچھے جو مقاصد کار فرما تھے وہ کسی سے چھپی ہوئی بات نہیں۔ ایلیٹ نے تو دیباچہ میں صاف لکھ دیا کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلم عہد کو اس طرح سیاہ رنگ میں پیش کیا جائے کہ اس پس منظر میں عوام پر برطانوی دور کی فیاضیاں اور برکتیں آشکارا ہوں۔ چنانچہ اس نے قدیم ماخذوں کے ان حصوں کو ملک کی ثقافت اور تہذیب و تمدن پر روشنی ڈالتے تھے جان بوجھ کر نکال دیا گیا اور جنگ و جدل کو اپنے مخصوص انداز میں ترجمہ کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برصغیر کا مسلم عہد محض قتل و غارت کی خونی داستان بن کے رہ گیا۔

ایلیٹ نے اس دور کے ہندو مورخین پر بھی اپنی ناراضگی کا اظہار کیا ہے کہ انہوں نے برصغیر میں "مسلم عہد" کی تعریف کیوں کی۔ اس نے انہیں اس بات پر اکسایا کہ وہ مسلم عہد کو گھناؤنا رنگ دینے میں انگریزوں کا ہاتھ بٹائیں۔ اس سے زیادہ بدقسمتی یہ ہے کہ تاریخ کے سلسلہ میں بعد میں جو کام ہوا اور جو درسی کتب لکھی گئیں وہ تمام تر ایلیٹ اور ڈاسن کی ترتیب دی ہوئی کتاب پر مبنی ہیں۔ ہمارے مرتبین کی اس کوتاہی نے یہ اثر چھوڑا کہ اس طرح ترتیب دی گئی تاریخ جب بچوں کو پڑھائی گئیں تو وہ اپنی عظیم الشان روایات سے نفرت کرنے لگے۔ یہ غلط تاثرات ہماری تاریخ میں اس طرح سما گئے ہیں کہ تاریخ کو ان سے پاک کرنا نہایت مشکل ہو گیا ہے۔

کون انکار کر سکتا ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ اس قدر درخشاں ہے کہ اگر ہمارے نونہالوں کو صحیح تاریخ پڑھائی جائے تو ان میں فکر و عمل کی تحریک پیدا ہونا کچھ زیادہ مشکل نہیں اور اس سے قوم کی قسمت بھی پلٹ سکتی ہے۔ اس کے برعکس تاریخ سے غفلت برتنا اور یہ کہہ کر کہ "تاریخ مردہ لوگوں کی داستانیں ہیں" تاریخ سے منہ پھیر لینا یا غلط تاریخی واقعات پر خاموش یا مطمئن ہو کر بیٹھ جانا۔ ہمارے قومی شعور اور خود اعتمادی کے لیے انتہائی مضر ہے۔

دور مغلیہ میں اورنگ زیب عالمگیر کا دور اس سے پہلے کے شہنشاہوں کے مقابلہ میں بلا شبہ اس اعتبار سے بہتر تھا کہ اس دور میں اسلامی خطوط اپنائے گئے مگر بغاوتوں اور سازشوں نے انہیں مہلت نہ دی کہ باقاعدہ اسلام کا نظام حکومت قائم کیا جا سکتا اورنگ زیب کا اپنے بیٹوں کو یہ وصیت کرنا کہ۔

"میرے بعد قتل و غارت کرنے کے بجائے اتفاق سے رہنا"۔

ظاہر کرتا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر جیسے متقی انسان نے بھی اپنی اولاد کو یہ نصیحت اس وجہ سے کی کہ اس کا خاندانی تخت و تاج تیموری محفوظ رہے۔ بہرحال اورنگ زیب عالمگیر ایک مدبر اعلیٰ دماغ جنرل' با انصاف اور روادار حکمران ہونے کے باوجود ایک مطلق العنان شہنشاہ اور ایک انسان بھی تھا اور اس کا یہ ناول اس نقطہ نظر پر مبنی ہے۔

شہنشاہ شہاب الدین محمد شاہ جہاں نے امراء اور وزراء کو مخاطب کیا۔

"کیا کسی کو معلوم ہے کہ ہم نے آج کا دربار خاص کیوں بلوایا ہے؟"

سب درباری خاموش رہے کسی نے جواب نہیں دیا۔

شہنشاہ نے ایک امیر کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے دریافت کیا۔

"پنج ہزاری امیر۔ تم بتاؤ۔ آج کا دربار کیوں بلوایا گیا ہے؟"

امیر کو مجبوراً" بولنا پڑا۔

"ظل سبحانی۔ آپ کی عقل کی گہرائی تک یہ غلام کیسے پہنچ سکتا ہے۔ میں جواب دینے سے قاصر ہوں عالی جاہ"۔

اب شہنشاہ نے قاضی القضاۃ کی طرف دیکھا۔

"محترم قاضی۔ آپ کو تو میرے دل کا حال ضرور معلوم ہو گا؟"

قاضی القضاۃ نے سر کو ذرا سا خم کر کے فرمایا۔

"ظل اللہ۔ دلوں کے بعید تو صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ انسان کی کیا مجال کہ وہ کسی کے دل کا حال جان سکے"۔

"درست فرمایا قاضی محترم"۔ شہنشاہ بولا۔ "دلوں کا حال اور غیب کی بات کا علم صرف اس خدائے بزرگ و برتر کو ہے جو خلاق عالم ہے اور جس کے قبضہ قدرت میں ہم سب کی جانیں ہیں۔ اب ہم اس بات کا اظہار خود کریں گے کہ اس اجلاس کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ سلطنت مغلیہ کے تمام وفادار جانتے ہیں کہ تخت و تاج ہند کے وارث یعنی ہمارے چاروں شہزادے بڑی تیزی سے جوانی کی حدود کی طرف بڑھ رہے ہیں ظاہر ہے کہ

ہم اپنے ورثہ میں صرف ایک تخت اور ایک تاج چھوڑیں گے اور ان شہزادوں میں سے صرف ایک شہزادہ ہی آئندہ کا شہنشاہ ہند بنے گا۔ اب آپ اپنی اپنی رائے دیجئے کہ تمام شہزادوں میں کون شہزادہ اس اعزاز کا اہل ہے اور کیوں؟"

دربار خاص میں اور زیادہ سناٹا چھا گیا۔ کس میں ہمت تھی کہ کسی ایک شہزادے کا نام لے کر باقی تین شہزادوں کی دشمنی مول لے۔ تھوڑی دیر بالکل سناٹا رہا پھر سرگوشیوں کا آغاز ہوا اور اشاروں ہی اشاروں میں درباری ایک دوسرے کو اپنا مقصد سمجھانے کی کوشش کرتے رہے مگر بولنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی۔

آخر شہنشاہ نے اس خاموشی اور سکوت کو بھی خود ہی توڑا۔

"ہم دیکھ رہے ہیں کہ درباری کسی ایک شہزادے کا نام لیتے ہوئے ہچکچا رہے ہیں۔ ہمارے وفادار اپنے دل میں کسی قسم کا خوف نہ لائیں اور جسے جو شہزادہ زیادہ پسند ہو اور اس کے خیال میں اس مرتبہ کا اہل ہو وہ بے دھڑک اس کا نام پیش کر دے"۔

شہنشاہ نے دیکھا کہ درباری اب بھی اپنی زبان کھولنے پر آمادہ نہیں ہیں تو اس نے قاضی القضاۃ کو ایک بار پھر مخاطب کیا۔

"قاضی القضاۃ ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کو دوبارہ زحمت دے رہے ہیں کیا ہم امید کریں کہ آپ اپنی پسند کے کسی شہزادے کا نام لے کر دوسرے درباریوں میں یہ ہمت پیدا کریں گے وہ اپنی اپنی پسند کے شہزادوں کا نام پیش کر سکیں"۔

قاضی القضاۃ پر پھر مصیبت آ گئی مگر قاضی مختلف مقدمات کے فیصلہ کے دوران اسی طرح کی مشکلات سے دو چار ہوتا تھا بلکہ ان مشکلات کا ایک حد تک عادی ہو گیا تھا۔ اس لیے اس نے شہنشاہ اور درباریوں کے سامنے ایک سہل اور آسان جواب پیش کیا۔

"ظل سبحانی۔ اللہ آپ کی عمر دراز کرے اور آپ کا سایہ ہم پر قیامت تک قائم رہے۔ کسی شہزادے کی ولی عہدی کے سلسلہ میں سب سے بڑا معیار اس شہزادے کی ذاتی قابلیت اور اہلیت ہے لیکن اس وقت کسی شہزادے کو اس معیار پر نہیں جانچا جا سکتا ہے اس لیے کہ ابھی خدا کی رحمت سے حضور پر نور خود حیات ہیں اور شہزادے کے انتخاب میں ظل سبحانی کی رائے بھی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس لیے میں عالی جاہ سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ صرف یہ فرمائیں کہ انہیں کس شہزادے سے زیادہ محبت ہے۔

اگر حضور اعلیٰ اپنی محبت کا اظہار فرما دیں تو بندگان عالی کو فیصلہ کرنے میں زیادہ آسانی ہو گی"۔

قاضی القضاۃ نے اپنی ذہانت سے خود پر آتی ہوئی بلا کو شہنشاہ پر ڈال دیا۔ درباری قاضی کی بات سے بہت خوش ہوئے اور ایک امیر نے فورا" تائید کرتے ہوئے کہا۔

"عالی جاہ۔ قاضی القضاۃ نے ہم سب کے دل کی ترجمانی کی ہے۔ ظل سبحانی صرف یہ فرمائیں کہ وہ کس شہزادے سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ باقی فیصلہ ہم خود کریں گے"۔

اب شہنشاہ مخمصے میں پھنس گیا۔

اس واقعہ کا تعلق برصغیر میں سلطنت مغلیہ کے عظیم شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے پوتے اور نور الدین محمد جہانگیر کے بیٹے ابو المظفر شہاب الدین محمد صاحبقران شاہجہاں بادشاہ غازی کے دربار کا ہے۔ جن شہزادوں کی طرف اس واقعہ میں اشارہ کیا گیا ہے وہ شاہجہاں کے چار بیٹے شہزادہ دارا' شہزادہ شجاع' شہزادہ اورنگ زیب اور شہزادہ مراد ہیں۔

تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے قارئین یہ بھی جانتے ہیں کہ شہنشاہ شاہجہاں کو بیٹوں میں سب سے زیادہ محبت بڑے بیٹے داراشکوہ سے تھی اور اس محبت کی بنا پر شاہجہاں چاہتا تھا کہ اس کے امیرو وزیر اس کی زندگی ہی میں دارا شکوہ کو ولی عہد سلطنت تسلیم کر لیں تاکہ بعد میں کوئی جھگڑا نہ ہو سکے۔ چنانچہ اس وقت وہ دربار خاص میں اپنے امیروں اور وزیروں سے اپنی اس خواہش کی تصدیق کرانا چاہتا تھا۔

درباریوں کو بھی معلوم تھا کہ شاہجہاں بڑے شہزادے داراشکوہ کو اپنا ولی عہد تصور کرنا چاہتا ہے مگر درباری بادشاہ سے زیادہ چالاک تھے۔ وہ اپنے منہ سے داراشکوہ کا نام لیکر دوسرے شہزادوں کی مخالفت مول لینے پر تیار نہ تھے۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ سب سے بڑا ہونے اور شہنشاہ کی محبت کے زور پر داراشکوہ ہی مستقبل کا شہنشاہ ہند ہو گا مگر یہ سب محض ایک امکان تھا اس لیے کہ بادشاہی اور مطلق العنانی دراصل جنگل کی حکومت ہوتی ہے اور اس میں جنگل ہی کا قانون چلتا ہے۔

ہمارے مذہب اسلام میں اگرچہ جمہوریت ہے اور حکومت الہیہ میں باہم مشورت کا حکم دیا گیا ہے مسلمانوں کے پہلے چار خلفائے عظام اسی حکم کے تحت منتخب ہوئے تھے مگر امیر شام حضرت امیر معاویہؓ کے وقت میں خلافت' بادشاہی اور ملوکیت میں تبدیل ہو گئی تو

یہاں بھی وہی جنگل کا قانون چل نکلا اور جو شہزادہ زیادہ طاقتور ہوتا وہ باپ کے مرنے پر تلوار کے زور پر تخت و تاج کا وارث بن جاتا تھا۔

اسی لیے اسلامی تاریخ میں پہلے چار خلیفہ حضرت ابوبکرؓ' حضرت عمر فاروقؓ' حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی کرم کا دور خلافت' "خلافت راشدہ" کے نام سے موسوم ہے پھر ان کے بعد جتنے خلیفہ ہوئے وہ دراصل مسلمان بادشاہ' شہنشاہ اور سلطان تھے مگر انہوں نے خود کو امیرالمومنین اور خلیفتہ المسلمین کہلوانا شروع کر دیا۔ چنانچہ خلافت امیہ ہو کہ بغداد کی خلافت عباسیہ یا مصر کی فاطمی خلافت اور ترکوں کی عثمانی خلافت حقیقت میں یہ سب مسلمان بادشاہتیں تھیں جنھوں نے اپنی عظمت کے لیے "خلافت" کا سہارا لیا تھا۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور یاد رکھنے کی ہے۔ وہ یہ کہ اگرچہ یہ تمام بادشاہتیں تھیں لیکن بنو امیہ' بنو عباس' بنو فاطمہ اور عثمانی بادشاہوں یا خلیفاؤں نے غیر مسلموں خاص کر عیسائیوں اور بت پرستوں کے خلاف زبردست جہاد کیا اور نور اسلام کو ایک طرف چین کی سرحد تک پہنچایا تو دوسری طرف مسلمانوں نے افریقہ' ایشیا اور یورپ کے ایک بڑے حصہ کو نور اسلام سے منور کیا۔ پس مسلمان بادشاہوں اور سلطانوں کی اسلام کے لیے کی گئی یہ خدمت کبھی نہیں بھلائی جا سکتی۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ اب ہم پھر اپنی اصل کہانی کی طرف آتے ہیں۔ ذکر تھا مغل شہنشاہ شاہجہاں کا جو اپنے امیروں کو اعتماد میں لے کر اپنے بڑے بیٹے دارا شکوہ کو اپنا ولی عہد مقرر کرنا چاہتا تھا مگر اس کے امیر و وزیر اس معاملہ میں اس سے بھی دس قدم آگے تھے چنانچہ ذہین اور عقلمند قاضی القضاۃ نے شاہجہاں کا سوال اسی پر الٹ دیا۔ قاضی نے شاہجہاں سے سوال کیا تھا کہ وہ یہ فرمائیں کہ انہیں اپنے کس بیٹے سے زیادہ محبت ہے۔

شاہجہاں اس سوال پر چکرا کے رہ گیا۔ وہ درباریوں کی رائے کا سہارا لے کر داراشکوہ کو ولی عہد نامزد کرنا چاہتا تھا لیکن درباریوں نے اسے امتحان میں ڈال دیا اب اگر وہ یہ کہتا کہ اسے دارا سے زیادہ محبت ہے تو درباری اسے داراشکوہ کو ولی عہد نامزد کرنے کا مشورہ دیتے اور عوام میں یہ بات پھیل جاتی کہ شہنشاہ نے درباریوں پر زور دے کے داراشکوہ کو ولی عہد مقرر کر دیا ہے اور اگر وہ کسی اور شہزادے سے محبت کا اعلان کرتا ہے

تو اس سے ایک تو دارا کی دل آزاری ہو گی دوسرے یہ کہ اس کا مقصد فوت ہو جائے گا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ شہنشاہ شاہجہاں اپنی جوانی میں بڑی سوجھ بوجھ اور عقل و فراست کا مالک تھا۔ پس اس نے قاضی القضا کو جواب دیا۔

"محترم قاضی القضاۃ اگر ہم یہ کہیں کہ ہمیں سب سے زیادہ محبت اپنے چھوٹے بیٹے شہزادہ مراد سے ہے تو آپ کس شہزادے کو ولی عہد نامزد کرنے کا مشورہ دیں گے؟"

قاضی القضاۃ نے بغیر کسی انتظار کے جواب دیا۔

"ظل سبحانی اگر آپ کو شہزادے مراد سے دوسرے شہزادوں کے مقابلہ میں زیادہ محبت ہے تو میرا یہ جواب ہے کہ شہزادہ مراد ہی ولی عہد سلطنت ہونے کا اہل ہے اس لیے کہ ہم شہنشاہ کی پسند کے خلاف سوچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

ایک دوسرے امیر نے اس کی ہاں میں ہاں ملا دی۔

"میں قاضی القضاۃ کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں شہزادہ مراد ہی ولی عہد سلطنت ہونے کا اہل اور حقدار ہے۔"

شہنشاہ شاہجہاں پریشان ہو گیا۔ وہ چاہتا کیا تھا اور ہو کیا گیا۔ آخر اس نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد کہا۔

"ہم اپنے وفاداروں کے شکرگزار ہیں کہ وہ ہماری محبت اور رائے کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں لیکن مسئلہ اس طرح نہیں حل ہو سکتا۔ ہم اس مسئلہ کو ایک اور طرح سے حل کر دیں گے اور اس کا فیصلہ آج ہو گا۔ آج شام پھر دربار خاص منعقد ہو گا لیکن اس کا اجلاس اس دربار خاص میں نہیں بلکہ اس کے برابر والے ہال میں ہو گا۔ آپ سب لوگ وہاں جمع ہوں گے۔"

"جو حکم عالی جاہ"۔ کا نعرہ قاضی القضاۃ نے بلند کیا اور سب نے اس کی تائید کی پھر سب رخصتی سلام کر کے باہر جانے لگے تو شہنشاہ نے انہیں روکا۔

"ایک بات کا خاص خیال رہے" شہنشاہ کی آواز سن کر سب کے قدم رک گئے اور انہوں نے پلٹ کے دیکھا۔

شاہجہاں نے اپنی بات پوری کی۔

"اس بات کا خیال رہے کہ اس وقت کے اجلاس اور اجلاس میں ہونے والی

کارروائی کا ذکر کسی سے نہ کیا جائے۔ خاص کر شہزادوں کو یہ ہرگز نہ معلوم ہونے پائے کہ آج ولی عہد سلطنت کی نامزدگی کے بارے میں کوئی بات ہوئی تھی اور آج شام کو بھی یہی مسئلہ پھر پیش ہو گا؟"

"ہم اپنی زبانوں پر تالے لگالیں گے عالی جاہ"۔

شام کو پھر دربار خاص لگا۔ مگر یہ دربار اس ہال میں نہیں لگا جہاں دربار خاص منعقد ہوتا تھا بلکہ شہنشاہ شاہجہاں کے حکم کے مطابق دربار ہال کے برابر والے چھوٹے ہال میں لگایا گیا۔ صبح والے تمام امرا اور وزرا دوبارہ جمع ہوئے۔ شہنشاہ کے لیے اس چھوٹے ہال میں بھی عالی شان مسند لگی تھی سب نے اپنی اپنی نشستیں سنبھال لیں تو شہنشاہ شاہجہاں نے فرمایا۔

"ہم نے صبح کو کہا تھا کہ شہزادوں کے بارے میں ہم آج کسی نتیجے پر پہنچیں گے اور اسی لیے یہ دربار لگایا گیا ہے۔ ہم اس وقت ایک ایسا کھیل' کھیل رہے ہیں جو بظاہر ایک بچگانہ حرکت معلوم ہو گی مگر اس ترکیب سے ہم شہزادوں کی اہلیت اور ذہانت کا صحیح اندازہ لگا سکیں گے"۔

درباریوں میں سے کوئی بھی نہیں سمجھ سکا کہ شہنشاہ کونسا معمہ پیش کر رہے ہیں۔ یہاں بھی قاضی القضاۃ نے بولنے میں پہل کی۔

"عالی جاہ۔ ہم نے پہلے ہی عرض کیا تھا کہ ہم آپ کی عقل کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتے اب پھر عرض کرتے ہیں کہ آپ نے اس وقت جو کچھ فرمایا ہے وہ ہماری عقل و دانش سے بہت اونچا ہے۔ ہم بالکل نہیں سمجھ سکے کہ شہنشاہ کیا کرنا چاہتے ہیں اور کونسا کھیل ہمیں دکھانا چاہتے ہیں؟"

شہنشاہ شاہجہاں نے تھوڑی سی وضاحت کی۔

"ہم اس وقت چاروں شہزادوں کو یہاں بلوائیں گے اور انہیں حکم دیں گے وہ سب دربار خاص میں جائیں اور اپنی پسند کی کسی نشست پر بیٹھ جائیں۔ شہزادوں کو معلوم ہے کہ دربار خاص میں ہمارا کون امیر یا وزیر کس نشست پر بیٹھتا ہے۔ بس ہر شہزادہ اپنی اپج' سمجھ' دانش اور ذہانت کے مطابق کوئی نہ کوئی نشست سنبھال لے گا۔ اب یہ ہمارا اور آپ کا کام کہ ہم اندازہ لگائیں کہ ہمارا کون شہزادہ کس ذہن کا مالک ہے۔ اس بچگانہ کھیل کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آپ ولی عہدی کے لیے کوئی فوری فیصلہ کریں بلکہ یہ بات اپنے ذہن میں رکھیں اور جب ہم کسی وقت ولی عہدی کا فیصلہ کریں تو اسے اس کھیل کے میزان پر تولیں"۔

شہنشاہ کی اس وضاحت سے درباریوں کی سمجھ میں آگیا کہ شہنشاہ دراصل اپنے شہزادوں کی ذہانت کا امتحان لینا چاہتا ہے تاکہ اسے فیصلہ کرنے میں کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔ اس وضاحت کے بعد شہنشاہ نے چاروں شہزادوں کو اپنے حضور طلب کیا شہزادے شہنشاہ کی اس اچانک طلبی سے کچھ پریشان سے ہو گئے۔ ان کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ شہنشاہ نے آج تک تمام شہزادوں کو ایک ساتھ کبھی پہلے نہیں طلب کیا تھا۔

شہزادے آئے مگر سہمے سہمے۔ ڈرے ڈرے۔ وہ شہنشاہ کو سلام کرکے چپ چاپ نظریں نیچی کر کے کھڑے ہو گئے۔

شہنشاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہمیں اپنے شہزادوں کے چہرے پر پریشانی کی لکیریں نظر آ رہی ہیں۔ فکر کی کوئی بات نہیں ہے دراصل ہمارے درباری آج تمام شہزادوں کو ایک ساتھ دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لیے انہیں طلب کیا گیا ہے"۔

شہزادوں کو اطمینان ہوا تو انہوں نے نظریں اٹھا کر شہنشاہ باپ اور درباریوں کو دیکھا۔

اس وقت شہنشاہ نے ان کے لیے دوسرا حکم صادر کیا۔

"شہزادوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم دربار خاص کے بجائے اس وقت اس چھوٹے ہال میں اجلاس کر رہے ہیں ہمارا دربار خاص اس وقت بالکل خالی ہے۔ شہزادوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ خاص دربار ہال میں جائیں اور وہاں کسی ایک نشت پر جس پر وہ چاہیں بیٹھ جائیں"۔

سب شہزادوں نے کمال حیرانی سے شہنشاہ باپ کا چہرہ دیکھا۔

شہنشاہ نے فرمایا۔

"تم حیران کیوں ہو رہے ہو۔ ہم نے جو حکم دیا ہے اسے بجالاؤ؟"

شہنشاہ کے اس حکم پر محی الدین اورنگ زیب نے سوال کیا۔

"شہنشاہ بابا۔ ہم دربار خاص میں جس نشست پر بیٹھیں گے پھر وہ شخص جب دربار میں آئے گا تو وہ کہاں بیٹھے گا۔ کیا وہ ہمیں اٹھا دے گا؟"

"ہرگز نہیں"۔ شہنشاہ نے فرمایا۔ "تم جس نشست پر بیٹھ جاؤ گے تمہیں وہاں سے کوئی نہیں اٹھائے گا۔ یہ ہمارا حکم ہے"۔

کسی دوسرے شہزادے نے کوئی سوال نہیں کیا۔

شہنشاہ نے حکم دیا۔

"اب تم چاروں دربار خاص میں جاؤ اور جس کا جہاں جی چاہے وہاں بیٹھ جائے"۔

سب شہزادے سر جھکائے ہوئے برابر والے دربار خاص میں داخل ہوئے انہوں نے دربار کی نشستوں پر نظر دوڑائی سامنے کی طرف ایک قدرے بلند جگہ پر شہنشاہ شاہجہاں کا نیا، نیا بنوایا ہوا تخت طاؤس پورے آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا۔ تخت کے دائیں ہاتھ پر وزیراعظم سلطنت مغلیہ کی خوبصورت نشست تھی اور بائیں طرف ویسی ہی ایک نشست سپہ سالار افواج شاہی کی نشست تھی۔ ایک تیسری نشست اس کے ساتھ لگی تھی جس پر دوسرے ممالک سے آئے ہوئے سفیریا بھارت کے والیان ریاست بیٹھتے تھے۔

اورنگ زیب اور مراد ابھی نشستیں دیکھ ہی رہے تھے کہ دارا شکوہ نے آگے بڑھ کر وزیراعظم کی نشست پر قبضہ کر لیا اور شجاع سپہ سالار کی نشست پر بیٹھ گیا مراد کو مہمان والیان ریاست کی نشست پسند آگئی اور اس نے اس طرف قدم بڑھائے۔

اب شہزادہ محی الدین اورنگ زیب باقی رہ گیا تھا جسے اپنے لئے نشست کا انتخاب کرنا تھا مگر وہ نہایت اطمینان سے کھڑا دربار ہال اور نشستوں پر طائرانہ نظریں ڈال رہا تھا۔ اس کے سکون سے تو یہ ظاہر ہو رہا تھا جیسے اسے کسی نشست پر بیٹھنا ہی نہیں ہے۔

اورنگ زیب کے تینوں بھائی جو اپنی اپنی پسندیدہ نشستوں پر بیٹھ چکے تھے وہ بڑی دلچسپی اور تجسس بھری نظروں سے اورنگ زیب کو دیکھ رہے تھے۔ ممکن ہے کہ وہ دل ہی دل میں اس بات پر خوش بھی ہو رہے ہوں کہ اورنگ زیب نے نشست کے انتخاب میں تاخیر کر کے خود اپنا ہی نقصان کیا ہے اور اب اسے کسی کم درجہ کے امیر کی نشست پر بیٹھنا پڑے گا۔

پھر بیٹھے ہوئے شہزادوں نے دیکھا کہ اورنگ زیب کے پیروں میں حرکت ہوئی اور وہ

نشستوں کے درمیانی راستہ پر آہستہ آہستہ یوں آگے بڑھنے لگا جیسے چہل قدمی کر رہا ہو۔ سب بھائیوں کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے بھائیوں پر کوئی توجہ نہ دی اور آگے ہی آگے بڑھتا رہا پھر اس نے قدم روک کر پہلے اپنے بھائیوں پر نظریں ڈالیں اس کے بعد سامنے کی طرف دیکھا۔ اس کے سامنے شہنشاہ شاہجہاں کا تخت طاؤس اپنی پوری رعنائیوں سے جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔

اورنگ زیب چند لمحوں تک تخت طاؤس کو گھورتا رہا۔ بھائیوں کی نظریں اب بھی اس پر جمی ہوئی تھیں اور ان کے تجسس میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہو گیا۔ اسی وقت اورنگ زیب نے تخت طاؤس کی طرف قدم بڑھائے۔ وہ گنگا جمنی سیڑھیوں کے پاس پہنچا۔ سیڑھیاں چڑھیں۔ پلٹ کر بھائیوں کو دیکھا پھر بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ تخت طاؤس ر بالکل اس طرح بیٹھ گیا جیسے شہنشاہ شاہجہاں بیٹھتا تھا۔

دارا' شجاع اور مراد کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔ انہیں اورنگ زیب کی اس حرکت پر غصہ بھی آیا دارا کو تو اتنا طیش آیا کہ وہ نشست سے کھڑا ہوا اور چیخ کر بولا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے اورنگ زیب؟"

اورنگ زیب نے اسے تیز نظروں سے گھورا اور جواب دیا۔

"کیا ہوا۔ کیسی بدتمیزی؟"

دارا پھر چیخا۔

"شہنشاہ بابا کے تخت پر بیٹھ گئے اور پوچھتے ہو کیسی بدتمیزی۔ کیا تم نہیں جانتے کہ شہنشاہ بابا کی نشست پر بیٹھنا نہ صرف بدتمیزی ہے بلکہ جرم بھی ہے؟"

اورنگ زیب مسکرایا۔ بولا۔

"تم وزیراعظم کی نشست پر بیٹھ گئے۔ میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا؟"

"مگر میں نے شہنشاہ بابا کے تخت پر بیٹھنے کی تو جرات نہیں کی؟" دارا شکوہ نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اورنگ زیب کے لبوں پر اب تک مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے جواب دیا۔

"اس میں بگڑنے یا تاؤ کھانے کی قطعی ضرورت نہیں۔ جس میں جتنی جرات اور حوصلہ ہوتا ہے وہ اسی کے مطابق قدم اٹھاتا ہے۔ آپ کی نظر وزیراعظم کی نشست تک

پہنچی اور آپ اس پر قابض ہو گئے۔ میرے حوصلے نے تخت طاؤس پسند کیا اور میں یہاں آ بیٹھا"۔

داراشکوہ اور زیادہ جل بھن گیا۔ اس نے کہا۔

"اچھا آنے دو شہنشاہ بابا کو۔ پھر تمہیں اپنے حوصلے کی سزا ملے گی"۔

اسی وقت شہنشاہ شاہجہاں اپنے تمام بڑے بڑے امرا اور وزراء کے ساتھ دربار ہال میں داخل ہوا۔ اس کی پہلی نظر ہی تخت طاؤس پر پڑی جس پر شہزادہ اورنگ زیب نہایت اطمینان اور کمال بے خوفی سے بیٹھا ہوا تھا۔ شاہجہاں کے قدم جیسے زمین نے پکڑ لئے وہ حیران حیران نظروں سے اورنگ زیب کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے تصور میں بھی نہ تھا کہ کوئی شہزادہ تخت طاؤس پر بیٹھنے کی ہمت کرے گا۔

داراشکوہ نے فوراً" اعتراض کیا۔

"دیکھا شہنشاہ بابا۔ اورنگ زیب کتنا بدتمیز ہے۔ آپ کے تخت پر چڑھ کے بیٹھ گیا ہے"۔

شاہجہاں کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اورنگ زیب بول پڑا۔

"شہنشاہ بابا آپ نے فرمایا تھا کہ دربار خاص میں جس کا جس نشست پر جی چاہے بیٹھ جائے۔ سب اپنی اپنی پسند کی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ مجھے تخت طاؤس پسند آیا بس میں یہاں بیٹھ گیا۔ دارا بھائی اعتراض کیوں کر رہے ہیں؟"

شاہجہاں استعجاب میں ڈوبا کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ مین نہ آ رہا تھا کہ کیا کرے یا کیا کہے۔ آخر اس نے شہزادوں کا جھگڑا ختم کرنے کے لیے کہا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ دارا بیٹے۔ تم خاموش رہو"۔

پھر شاہجہاں نے پلٹ کے اپنے درباریوں کو دیکھا۔ وہ سب بھی حیرت کے سمندر میں اب تک غوطے لگا رہے تھے۔ وہ کبھی تخت طاؤس پر براجمان اورنگ زیب کو دیکھتے اور کبھی دوسرے شہزادوں پر نظریں ڈالتے۔ شاہجہاں کو اپنی طرف مخاطب دیکھ کر وہ سب با ادب ہو گئے۔

شاہجہاں نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

"شہزادوں کی نشستیں دیکھیں آپ نے؟"

"جی عالی جاہ۔ دیکھ لیں"۔ قاضی القضاۃ نے جواب میں عرض کیا۔

اس کے بعد شہنشاہ نے کسی اور سے سوال کیا اور نہ کسی امیر نے خود بولنے کی کوشش کی وہ کچھ دیر خلاؤں میں گھورتا رہا پھر حکم دیا۔

"دربار برخاست کیا جاتا ہے"۔

اتنا کہنے کے بعد شہنشاہ بغلی دروازے سے جو محل کے زنانخانہ میں کھلتا تھا' اندر چلا گیا۔ درباریوں نے بھی ایک ایک کر کے اپنے گھروں کی راہ لی۔ یا تو وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی خاموش خاموش واپس ہوئے تھے یا پھران کی سمجھ میں یہ بات نہ آ سکی تھی کہ شہنشاہ پر اچانک خاموشی کا دورہ کیوں پڑ گیا ہے اور وہ بغیر کوئی فیصلہ کئے محل میں کیوں واپس ہو گیا ہے۔

شہنشاہ شاہجہاں نے چاروں شہزادوں کا امتحان لینے کا اس لیے فیصلہ کیا تھا تاکہ اسے یہ اندازہ ہو سکے کہ کس شہزادے میں کتنی ذہانت اور جرات ہے۔ اس کے ساتھ شاہجہاں یہ بھی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ شہزادوں کو امور سلطنت سے کس حد تک دلچسپی ہے دربار میں سب سے بلند مرتبہ آصف خاں تھا جو شاہجہاں کا خسر تھا۔ مغل سلطنت کے وزیراعظم کا عہدہ بھی اسی کے پاس تھا۔

وزیراعظم آصف خاں کی مسند شہنشاہ کے دائیں جانب پہلی مسند تھی۔ شاہجہاں کو داراشکوہ سے سب سے زیادہ پیار تھا اور وہ دل سے چاہتا تھا کہ دارا کو تمام امراء ولی عہد تسلیم کر لیں مگر یہ بات وہ اپنی زبان سے نہیں کہنا چاہتا تھا۔ اس کی یہ خواہش تھی کہ دارا' وزیراعظم آصف خاں کی نشست پر بیٹھ جائے تاکہ وہ امرا سے کہہ سکے کہ دارا نے چونکہ دربار میں سب سے اونچی مسند پسند کی ہے اس لیے وہ ولی عہد بننے کے قابل ہے۔

دارا زیادہ ذہین تو نہ تھا مگر شہنشاہ کے اس امتحان سے اس کی سمجھ میں یہ آیا تھا کہ شہنشاہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون شہزادہ دربار کی سب سے اعلی مسند پر بیٹھتا ہے۔ دارا کی نظر میں سب سے اعلیٰ مسند وزیراعظم آصف خاں کی تھی اس لیے وہ جب دربار ہال میں گیا تو دوڑتا ہوا آصف خاں کی مسند پر چڑھ کے بیٹھ گیا۔

دارا کے بعد شاہ شجاع اور مراد نے بھی اپنی اپنی پسند کے مطابق مسندیں سنبھال لیں۔ اب باقی اورنگ زیب رہ گیا تھا۔ وہ ہال میں داخل ہونے کے بعد ایک طرف خاموشی

سے کھڑا ہو گیا۔ پھر جب تمام شہزادے مسندیں سنبھال چکے تو تخت شاہی طرف بڑھا اور بڑے اطمینان سے تخت پر بیٹھ گیا۔ اس کی اس جرات یا حرکت پر دارا بہت چراغ پا ہوا۔ اس نے شہنشاہ سے اس کی شکایت بھی کی مگر اسے کچھ حاصل نہ ہوا۔

شہنشاہ شاہجہاں جب امرا و وزراء کے ساتھ دربار خاص میں پہنچا تو اورنگ زیب کو تخت شاہی پر قابض دیکھ کر ششدر رہ گیا اس کے تصور میں بھی نہ تھا کہ اس کا کوئی بیٹا تخت شاہی پر بیٹھنے کی جرات کر سکتا تھا وہ اس سلسلہ میں اورنگ زیب کو تنبیہہ نہ کر سکتا تھا کیونکہ اس نے خود ہی اعلان کیا تھا کہ جو شہزادہ جس مسند پر چاہے وہاں بیٹھ جائے۔

شہزادے اورنگ زیب کے تخت شاہی پر بیٹھنے سے شاہجہاں فوراً اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کے تمام بیٹوں میں اورنگ زیب کو تخت شاہی حاصل کرنے کی سب سے زیادہ خواہش ہے اور وہ اس کا اہل ہے کیونکہ اس میں حصول اقتدار کے لیے جرات بھی موجود ہے۔

دوسرا واقعہ

اس واقعہ کو ایک ہی سال گزرا تھا کہ ایک اور ایسا واقعہ پیش آیا جس نے یہ ثابت کر دیا کہ شہزادہ اورنگ زیب صرف ذہین ہی نہیں بلکہ اس میں شجاعت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل اس طرح ہے۔

جس زمانہ میں شاہجہاں لاہور میں مقیم تھا۔ ان ایام میں شہنشاہ اکثر اوقات شالامار باغ میں ہاتھیوں کی لڑائی دیکھا کرتا تھا۔ انہی دنوں بنگال کے ضلع دار نے چالیس عدد جنگی تربیت یافتہ ہاتھی شہنشاہ کی خدمت میں ارسال کئے تھے اور ان ہاتھیوں کی بہت زیادہ تعریف و توصیف کی تھی۔ ایک دن شہنشاہ دریچہ میں بیٹھا ہاتھیوں کی لڑائی دیکھ رہا تھا چاروں شہزادے بھی اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار تماشہ دیکھ رہے تھے۔

سامنے دو ہاتھی گتھم گتھا ہو رہے تھے کہ اچانک ان میں ایک ہاتھی شاید شکست کھا کر بھاگا۔ اس ہاتھی کا رخ شہزادوں کی جانب تھا اس لیے شہزادے گھبرا کر ادھر ادھر گھوڑے بھگانے لگے مگر شہزادہ اورنگ زیب جس کی عمر اس وقت صرف چودہ سال تھی، نہایت اطمینان سے اپنے گھوڑے پر جما بیٹھا رہا۔ اس نے اپنی جگہ سے ذرا بھی جنبش نہ کی جہاں تک کہ بھاگتا ہاتھی اس کے قریب سے نکل گیا۔

دوسرا ہاتھی جس نے اس ہاتھی کو مار بھگایا تھا وہ اس کے تعاقب میں آرہا تھا۔ اس

نے شہزادے کو راستے میں کھڑا دیکھا تو اپنے حریف کو چھوڑ کر شہزادہ کی طرف متوجہ ہوا۔ شہزادے کے ہاتھ میں نیزہ تھا اس نے اس نیزے سے ہاتھی پر حملہ کر دیا۔ ہاتھی نیزے کا زخم کھا کر ایک لمحے کے لیے اپنی جگہ رک گیا مگر دوسرے ہی لمحے ہاتھی نے شہزادے پر حملہ کر دیا اور اپنی سونڈ کی ضرب سے شہزادے اور گھوڑے دونوں کو نیچے گرا دیا شہزادہ بڑی تیزی سے زمین سے اٹھا، لپک کے اپنا نیزہ اٹھایا اور نیزہ تان کر ہاتھی کی طرف بڑھا۔ اس اثنا میں اور لوگ بھی وہاں پہنچ گئے اور ہاتھی دوسری طرف مڑ گیا۔

شہنشاہ شاہجہاں یہ منظر دیکھ کر بے انتہا پریشان ہو گیا تھا وہ اسی پریشانی کے عالم میں دریچہ سے اتر کر نیچے آ گیا۔ شہزادہ آہستہ آہستہ نہایت اطمینان سے شاہجہاں کی طرف چلا۔ اعتماد خاں ناظر شہزادے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اعتماد خاں شہزادے کے نانا آصف خاں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا اس لئے شہزادے کا رشتہ دار تھا اور بدحواس ہو کے شہزادے کی مدد کو پہنچا تھا۔

اعتماد خاں نے شہزادے کو آہستہ چلتے دیکھا تو چیخ کے بولا۔

"شہزادے آپ سستی نہ کیجئے۔ خطرے سے جلد دور ہو جائیے؟"

شہزادے نے اطمینان سے جواب دیا۔

"اگر ہاتھی یہاں ہوتا تو میں جلدی بھی کرتا۔ اب پریشانی کی کیا بات ہے؟"

بہرحال جب اورنگ زیب، شہنشاہ کے قریب پہنچے تو اعلیٰ حضرت نے ایک لاکھ روپے شہزادے پر نچھاور کئے پھر فرمایا۔

"بابا خدا کا شکر ہے کہ خیریت سے معاملہ گزر گیا۔ اگر خدانخواستہ کچھ اور ہو جاتا تو کیسی رسوائی ہوتی؟"

اورنگزیب کو اس وقت اپنے دوسرے بھائیوں پر سخت غصہ تھا جو اس کی مدد کرنے کے بجائے اسے ہاتھی کے سامنے چھوڑ کر دور دور بھاگ گئے تھے۔ پس اس نے شہنشاہ کو بظاہر مسکراتے ہوئے مگر بہت جل کے جواب دیا۔

"شہنشاہ بابا۔ اگر کچھ اور پیش آتا تو اس میں رسوائی کی کوئی بات نہ تھی۔ رسوائی تو اس سلوک میں ہے جو دوسرے بھائیوں نے میرے ساتھ کیا"۔

یہی نہیں بلکہ اورنگ زیب نے یہ مشہور مصرعہ بھی پڑھا۔

"پردہ پوش بادشاہاں مرگ است"

"موت بادشاہوں کی پردہ پوشی کرتی ہے۔ اس میں کیا رسوائی ہے"۔

اس واقعہ کو عبدالحمید لاہوری نے اپنی تصنیف بادشاہ نامہ میں قدرے اختلاف سے لکھا۔ ان کے بیان کو بھی قارئین کی دلچسپی کے لیے درج کیا جا رہا ہے۔ عبدالحمید لاہوری نے اسے اس طرح بیان کیا ہے۔

شہنشاہ شاہجہاں قلعہ آگرہ کے دریچہ سے ہاتھیوں کی لڑائی کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ دو ہاتھی جن میں ایک کا نام "سدھاکر" اور دوسرے کا نام "صورت سندر" تھا' کو لڑائے جانے کا شہنشاہ نے حکم دیا۔ سدھاکر اور صورت سندر کی لڑائی شروع ہوئی سدھاکر نے صورت سندر کو مار بھگایا۔ اس وقت سدھاکر نے صورت سندر کو بھاگتے دیکھ کر قریب کھڑے شہزادے اورنگ زیب پر حملہ کر دیا۔ شہزادے نے اپنے نیزے سے مردانہ وار ہاتھی کے سر پر زخم لگائے نوکروں نے ہاتھی کو ڈرانے کے لیے آتشبازی چرخی وغیرہ چھوڑی مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے شہزادے کے گھوڑے کو اپنے دانتوں سے ٹکر مار کر گرا دیا۔

شہزادہ اورنگ زیب بروقت جست کر کے رکاب سے کود پڑا شاہ شجاع نے دھوئیں اور بھیڑ میں بمشکل اپنا راستہ بنا کر ہاتھی پر نیزے سے حملہ کیا لیکن اس کا گھوڑا چمکا اور اس کو نیچے گرا دیا۔ جے سنگھ کا گھوڑا بھی بھڑک گیا۔ اس وقت شکست خوردہ ہاتھی صورت سندر لڑنے کے لیے پھر لوٹ آیا اور سدھاکر شہزادوں کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔

یہ واقعہ ۲۸ مئی ۱۶۳۳ء کا ہے۔ اس وقت شہزادے اورنگ زیب کی عمر صرف ۱۴ سال تھی۔ شہنشاہ نے شہزادے کو پانچ ہزار سکہ طلائی اور بہت سے دوسرے تحائف جن کی مجموعی قیمت ۲ لاکھ روپے ہوتی ہے' تحفتہ دیئے۔

اس بیان میں شاہ شجاع کا ذکر ہے کہ اس نے اورنگ زیب کی مدد کرنے کی کوشش کی تھی مگر دارا اور مراد کا ذکر نہیں ہے اس لیے پہلا بیان بھی درست سمجھا جا سکتا ہے جس میں شہزادے اورنگ زیب نے بھائیوں کی بے وفائی اور بزدلی کا شکوہ کیا ہے۔

ہم نے شہزادے اورنگ زیب کے بچپن کے دو واقعات بیان کئے ہیں۔ اس میں پہلے کے واقعہ سے اورنگ زیب کی ذہانت اور تخت دہلی حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار ہوتا ہے جبکہ دوسرے واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شہزادہ اورنگ زیب بچپن ہی سے نہایت جری اور جوانمرد تھا۔ اس کے ساتھ اس نے شہنشاہ کو برجستہ جواب دے کر اپنے

"حاضر جواب" ہونے کا بھی ثبوت فراہم کر دیا ہے۔

مورخوں اور تاریخ دانوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ جب کسی اہم تاریخی شخصیت کا خاکہ لکھنا شروع کرتے ہیں تو اس کی ابتدا اس کی پیدائش سے کرتے ہیں مگر میں مورخ نہیں بلکہ تاریخ کا ایک طالب علم ہوں اور تاریخ کو قصے کہانیوں اور ناول کی صورت میں قاری کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ اسے "ایک پنتھ دو کاج" کہا جاتا ہے یعنی اس کے دہرے فائدے ہیں میرا مقصد قاری کو تاریخ کے گھمبیر اور اہم واقعات کو کہانی یا ناول کے ہلکے پھلکے اسلوب میں زبان اور بیان کی تمام تر خوبیوں کے ساتھ سنانا ہوتا ہے اور وہ بفضل خدا پورا ہو رہا ہے۔ دوسری طرف قاری اپنی تاریخ پڑھنے سے باغی ہے۔ وہ کہانی اور افسانہ تو پڑھ سکتا ہے مگر تاریخ کی خشک تحریر سے گھبراتا ہے۔

شکر ہے کہ میرے ناول تفصیلی نہیں ہوتے بلکہ ہلکے پھلکے رواں دواں اور زبان کی چاشنی میں لپٹے ہوئے ہیں اور قاری کو یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وہ تاریخ کے انتہائی خطرناک' خوفناک اور خونی مناظر پڑھ رہا ہے بلکہ وہ ان ناولوں کو ہلکا پھلکا ادب سمجھ کر پڑھتا ہے اور اس طرح میں تاریخی واقعات کو اس کے ذہن پر مرتسم کرتا چلا جاتا ہوں۔

اسی لیے میں ناول کا آغاز ہیرو کی پیدائش سے نہیں بلکہ کسی مکالمے یا قصہ سے کرتا ہوں اورنگ زیب عالمگیر کے سلسلہ میں ان دو قصوں کے بیان کے بعد میں تاریخ دانوں کے نقش قدم پر چلتا ہوا اس کی پیدائش پر آتا ہوں مگر اورنگ زیب کی پیدائش سے پہلے قارئین یہ ضرور جاننا چاہیں گے کہ اس کا کس خاندان سے تعلق تھا اور اس کے آباؤ اجداد میں کون کون نامور اور مشہور اشخاص ہوئے ہیں۔ چنانچہ میں اس کا آغاز اس کے جدامجد سے کرتا ہوں پھر ان کے بیٹوں اور پوتوں کے مختصر حالات کے بعد میں عظیم مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی پیدائش پر آؤں گا۔

ظہیرالدین بابر

برصغیر پاک و ہند میں مغل شہنشاہیت کا بانی ظہیرالدین محمد بابر تھا۔ بابر کا شجرۂ نسب باپ کی طرف سے مشہور فاتح امیر تیمور گورگاں سے ملتا تھا اور والدہ کی طرف سے بابر کا تعلق قہرالٰہی چنگیز خاں سے تھا۔ بابر نے خود کو ہمیشہ تیموری کہا اور منگولوں سے اپنے تعلق کو

باعث عار سمجھتا تھا مگر اہل ہند شمال مغرب سے آنے والوں کو مغل یا منگول کہتے تھے۔ اس لیے بابر کے خاندان کو مغل اور سلطنت کو سلطنت مغلیہ کے نام سے پکارا گیا۔

ظہیر الدین بابر نے صرف بارہ ہزار کے لشکر سے ہندوستان پر حملہ کیا اس کا مقابلہ افغان شہنشاہ ہند ابراہیم لودھی سے پانی پت کے میدان میں ہوا۔ افغان لشکر ایک لاکھ سے زیادہ تھا مگر بابر ایک تجربہ کار جنرل تھا پھر اس کے ساتھ توپ خانہ بھی تھا جس کی ہلاکت خیزی سے اہل ہند اس وقت تک واقف نہ تھے چنانچہ ۱۵۲۶ء کو پانی پت میں لڑی جانے والی پہلی جنگ میں ظہیر الدین بابر فاتح ہوا اور ابراہیم لودھی میدان جنگ میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس طرح ہند کی شہنشاہیت کا تاج ابراہیم لودھی سے ظہیر الدین بابر کے سر پر آگیا۔

بابر نے ۲۶ دسمبر ۱۵۲۶ء کو اپنے سر پر ہند کی شہنشاہیت کا تاج رکھا تھا مگر صرف چار سال بعد اسی تاریخ کو یعنی ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء کو موت نے یہ تاج اس کے سر سے چھین لیا۔

ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ بابر کو سلطان ہند ابراہیم لودھی کی والدہ نے جسے بابر نے اپنی پناہ میں لے لیا تھا' زہر دلوایا تھا جس کے اثر سے وہ گھل گھل کر ختم ہو گیا۔

بابر کی شخصیت بڑی دل آویز اور دلچسپ تھی۔ ایک طرف تو وہ ایک تجربہ کار جنرل تھا دوسری طرف وہ مناظر قدرت کا دلدادہ' شعر و سخن کا شائق' یاروں کا یار اور شراب و افیون سے بھی شوق رکھتا تھا۔ اپنی ہر فتح کو منجانب اللہ کہتا' ایک ترکی زبان میں دیوان اور تزک بابری اس کی تصانیف ہیں وہ مذہبی رواداری اور انسان دوستی کا قائل تھا۔ اس نے ہند میں راجپوتوں کی طاقت کو جنگ کنواہہ میں ختم کر کے رکھ دیا۔ اس جنگ سے پہلے اس نے شراب سے توبہ کر لی تھی اور اس کی پابندی بھی کرتا رہا۔

اولاد سے اتنی محبت تھی کہ جب اس کے بیٹے ہمایوں کی بیماری سے حالت بہت خراب ہوئی تو اس نے خدا سے دعا مانگی کہ وہ ہمایوں کے بدلے اسے دنیا سے اٹھا لے۔ چنانچہ اس کی موت کا ایک سبب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس نے خود کو ہمایوں پر نثار کر دیا۔

نصیر الدین ہمایوں

بابر نے مرتے وقت ہمایوں کو نصیحت کی تھی کہ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ چنانچہ اس نے اپنی سلطنت کے کئی اہم علاقے بھائیوں میں تقسیم کر دیئے مگر

بھائیوں نے احسان ماننے یا اس کا دست و بازو بننے کے بجائے "برادران یوسف" کا سلوک کیا۔ ہمایوں نہایت کمزور طبیعت کا مالک تھا۔ شگون اور ستاروں کی چالوں پر یقین رکھتا تھا مگر ستارے ہمیشہ اس کے خلاف چلتے تھے۔ اس نے اگرچہ ایک نیک اور شریفانہ زندگی گذاری مگر عمر بھر پریشان رہا۔ بابر نے اس کے لیے ایک بڑی سلطنت چھوڑی تھی مگر اس نے سلطنت کو بھائیوں میں بانٹ کر سخت غلطی کی۔ بھائیوں نے اسے کسی وقت فائدہ نہیں پہنچایا بلکہ اسے نقصان ہی پہنچاتے رہے۔

ہمایوں کی بدقسمتی تھی کہ اسی زمانے میں شیر شاہ سوری جیسا بیدار مغز اور اولوالعزم جنرل اس کے مقابلہ پر آگیا۔ شیر شاہ سوری نے اپنی جنگی چالوں سے نہ صرف ہمایوں کو میدان جنگ میں کئی بار شکست دی بلکہ اسے ہندوستان سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ شیر شاہ میں جس قدر پھرتی تھی' ہمایوں اس کے مقابلہ میں اتنا ہی ست اور آرام طلب تھا۔ مغل شہنشاہ عام طور سے شراب اور افیون کے رسیا ہوتے تھے۔ ہمایوں افیون کھانے کا کچھ زیادہ ہی عادی تھا اور اس افیون نے اسے ست و کاہل بنا دیا تھا۔

مگر ہمایوں میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں۔ بابر کی طرح وہ علم و ادب سے شغف رکھتا تھا کتابیں پڑھنے کا اس قدر شائق تھا کہ جب وہ جان بچا کر ایران بھاگ رہا تھا' اس وقت بھی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ بھائیوں نے اسے اتنی تکالیف دیں مگر وہ انہیں ہمیشہ معاف ہی کرتا رہا۔ وہ احسان فراموش نہیں تھا۔ نظام سقہ نے جب اسے ڈوبنے سے بچا کر دوسرے کنارے پہنچایا تو اس کے حصہ میں ہمایوں نے اسے ایک دن کی بادشاہت عطا کر دی تھی۔

ہمایوں نماز روزے کا بھی پابند تھا اذان کی آواز سنتا تو چلتے ہوئے رک جاتا تھا۔ اس کی موت بھی اذان سنتے ہوئے ہی واقع ہوئی تھی۔ وہ سیڑھیوں سے اتر رہا تھا کہ اذان کی آواز سنائی دی۔ اس کے قدم اک دم رک گئے مگر سنگ مرمر کی سیڑھیوں سے پیر پھسلے تو لڑھکتا ہوا نیچے پہنچا اور یہی حادثہ اس کی موت کا باعث بن گیا۔ ہمایوں ذاتی طور پر بڑا دلیر اور ثابت قدم تھا۔ اس نے گجرات کی جنگ میں ایک منجھے ہوئے جنرل کی طرح اپنے لشکر کی کمان کی مگر شیر شاہ سوری کے مقابلہ پر وہ اپنی صلاحیتوں کا صحیح طور پر استعمال نہ کر سکا پھر اس کا مد مقابل اس سے کہیں زیادہ تجربہ کار سپہ سالار ثابت ہوا جس نے ہمایوں کو پورے ہندوستان میں بھگائے رکھا۔

ہمایوں کی ناکامی کی اصل وجہ تو اس کے خود بھائی تھے۔ جنہوں نے مصیبت کے وقت اس کا ساتھ دینا تو الگ بات ہے خود اس کی جڑیں کاٹنے میں لگے رہے اور یہ اس قدر بھولا اور با مروت تھا کہ اگر کوئی بھائی اس کے قابو بھی آ جاتا تو اسے فوراً" معاف کر دیتا۔ اگر شاہ ایران جس کی ایک بیٹی سے اس نے شادی کر لی تھی' ہمایوں کو ایرانی لشکر فراہم نہ کرتا تو ہمایوں دوبارہ تخت و تاج حاصل نہ کر سکتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ہمایوں نے اپنا مذہب بھی تبدیل کر لیا تھا۔

جلال الدین محمد اکبر

جس وقت مغل شہنشاہ ہمایوں اپنے مد مقابل شیر شاہ سوری کے خوف سے ایران کی طرف بھاگنے کی فکر میں تھا تو سندھ کے مقام امرکوٹ میں ملکہ حمیدہ بانو کے بطن سے ہمایوں کا پہلا بیٹا اکبر پیدا ہوا۔ ہمایوں اور اس کے ساتھیوں کو بہت خوشی ہوئی۔ ہمایوں اس وقت خالی ہاتھ تھا جب امراء اسے مبارک باد دینے آئے تو اس کے اپنے خالی ہاتھ ہونے پر معذرت کی اور وعدہ کیا کہ دن پلٹنے پر وہ انہیں انعام و اکرام سے مالا مال کر دے گا۔ اکبر چودہویں شب کو پیدا ہوا تھا اس لیے اس کا پہلے نام بدر الدین رکھا گیا۔

ہمایوں کے دن جلدی نہ پلٹ سکے ۔ شیر شاہ کا لشکر اس کے تعاقب میں تھا چنانچہ اسے بے سرو سامانی کے عالم میں ایران بھاگنا پڑا۔ اس کی مجبوری اور بدحواسی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے لخت جگر کو بھی ساتھ نہ لے جا سکا اور اسے مستونگ میں چھوڑ کر ایران روانہ ہو گیا۔ ننھے اکبر کو مستونگ سے ہمایوں کے بھائی اور اکبر کے چچا عکسری کے پاس پہنچا دیا گیا جہاں اس کی چچی سلطانہ خانم نے اسے بڑی شفقت سے پرورش کیا۔

پھر جب ہمایوں ایران سے واپس آیا اور اس نے قندھار اور کابل پر حملہ کر کے عسکری کو شکست دے کر بھگا دیا تو اکبر اپنے باپ کے پاس پہنچا۔ اسی وقت اس کا نام بدر الدین سے بدل کر جلال الدین محمد اکبر رکھا گیا۔ اسی زمانہ میں ایک موقعہ پر جب ہمایوں کابل سے باہر گیا ہوا تھا تو عسکری نے کابل پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ ہمایوں فوراً" کابل واپس آیا اور اس نے قلعہ کو گھیر لیا۔ اس وقت ظالم چچا نے ننھے اکبر کو قلعہ کی فصیل پر کھڑا کر دیا۔ ماہم انگہ شہزادے کی دایہ تھی۔ اس نے اکبر کو سینے سے لگا لیا اور چیخنا شروع کر دیا۔

ہمایوں کا توپ خانہ قلعہ پر گولہ باری کر رہا تھا۔ اتفاق سے کسی توپچی کی نظر شہزادے اور ماہم انگہ پر پڑی اس نے فوراً" گولہ باری بند کر کے ہمایوں کو اطلاع دی اس طرح اکبر کی جان بچ گئی۔

یہ شاید اکبر کی خوش قسمتی تھی کہ شیر شاہ سوری کالنجر کے قلعہ پر حملہ کے دوران توپ کے ایک گولے کے خیمے کے پاس پھٹنے سے شدید زخمی ہو کر انتقال کر گیا اور ہمایوں کو ہند واپس آنے کا موقعہ مل گیا۔ ہمایوں بڑی شان سے واپس آیا۔ شیر شاہ کے بیٹے کچھ زیادہ اہل ثابت نہ ہوئے۔ ہمایوں نے یک بار پھر ہند کا تخت و تاج حاصل کر لیا۔

ہمایوں نے اکبر کے لیے بڑے بڑے استاد او اتالیق مقرر کئے مگر اکبر تعلیم کے معاملہ میں اس قدر نکما ثابت ہوا کہ حروف تہجی یعنی الف۔ ب سے آگے نہ پڑھ سکا اور تمام عمر جاہل رہا۔ مگر جسمانی تربیت اور جانوروں پر قابو پانے میں اسے بڑی مہارت حاصل تھی۔

ہمایوں نے اکبر کو کم عمری ہی میں پنجاب کا گورنر اور بیرم خاں کو اس کا اتالیق مقرر کر دیا تھا۔ اکبر اپنے اتالیق بیرم خاں کی معیت میں سکندر سوری کے خلاف جنگ میں مصروف تھا۔ کہ اسے باپ کے اچانک وفات پانے کی اطلاع ملی۔ بیرم خاں نے فوراً" گورداسپور کے مقام پر کلانور میں ایک سادی سی تقریب میں اکبر کو اس کے آبائی تخت پر بٹھا دیا۔ خود بیرم خاں نائب السلطنت مقرر ہوا۔

اکبر کی تخت نشینی کے وقت ہند اور خاص کر سلطنت دہلی کے حالات بڑے دگرگوں تھے۔ مغل سلطنت کا سب سے بڑا دشمن سکندر سوری اگرچہ شکست کھا چکا تھا مگر اس نے اطاعت قبول نہ کی تھی اور شمالی پنجاب میں اس کے کئی مضبوط قلعے موجود تھے۔ مشرق اور مشرق بعید میں بھی سوری شہزادے حکمراں تھے۔ مالوہ باز بہادر کے قبضہ میں تھا۔ راجپوتوں نے الگ سر اٹھایا تھا۔ جنوبی ہند بھی شمال ہی طرح طوائف الملوکی میں مبتلا تھا وہاں کی مسلمان ریاستوں کی دشمن وجے جگر کی ہندو سلطنت تھی مگر وہ آپس میں بھی برسرپیکار رہتے تھے۔

مسلسل خانہ جنگی نے ملک کی اقتصادی حالت تباہ کر کے رکھ دی تھی۔ دہلی اور آگرہ میں قحط پڑ گیا تھا اور طاعون کی وبا بھی انسانی زندگیوں کو چاٹ رہی تھی۔ چنانچہ اکبر کو سکندر سوری کی مہم ترک کر کے مشرق میں عادل شاہ کے جرنیل ہیموبقال کے مقابلہ پر جانا پڑا جس نے دہلی کے گورنر تردی بیگ کو شکست دے کر دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ بیرم خاں

نے امرا کے تمام بزدلانہ مشورے رد کر دیئے اور ہیمو بقال سے مقابلہ کے لیے مغل لشکر کو پانی پت کے مشہور میدان کی طرف روانہ کیا۔

مغلوں کے مقابلہ میں افغانوں کا لشکر کثیر تعداد میں تھا جن میں پندرہ سو جنگی ہاتھی بھی تھے۔ اس طرح اکبر کی تخت نشینی کے صرف آٹھ ماہ بعد مغلوں اور افغانوں میں پانی پت کی دوسری جنگ ہوئی جس میں پہلے افغانوں کے لشکر نے مغل میمنہ اور میسرہ کو دبایا مگر ہیموبقال جو ہاتھی پر سوار تھا' کی آنکھ میں ایک تیر لگا اور وہ بے ہوش ہو کر ہودج میں گر گیا۔ افغان لشکر سمجھا کہ ہیمو مارا گیا اس لیے فوج میدان چھوڑ بھاگی اور افغانوں کی دوبارہ حکومت کا خواب پھر کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

اکبر نے جب اٹھارویں سال میں قدم رکھا تو اس کے دماغ میں ایک آزاد بادشاہ اور شہنشاہ بننے کا خیال پیدا ہوا۔ اس نے بیرم خاں کو جو اس کا محسن تھا نائب السلطنت کے عہدے سے معزول کر کے سلطنت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ بیرم خاں نے بہت ہاتھ پیر مارے مگر اس کی ایک نہ چلی۔ بیرم خاں کے اثر سے آزاد ہوتے ہی وہ اپنی دائی ماہمہ انگہ کے زیر اثر آ گیا یہ اثر چار سال تک قائم رہا اس عہد کو اکبر کا "زنانہ عہد حکومت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اس زنانہ دور حکومت میں ماہم انگہ کے بیٹے ادھم خاں نے بہت ادھم مچایا۔ اکبر نے تنگ آ کر ادھم خاں کو قلعہ کی دیوار سے سر کے بل نیچے پھنکوا کے ختم کرا دیا۔ اکبر اگرچہ ان پڑھ تھا لیکن بڑا ذہین تھا اس کی ذہانت نے اسے خود سر اور مطلق العنان بنا دیا۔ وہ اگرچہ ماں اور باپ دونوں طرف سے مسلمان تھا مگر اسلامی روایات کے وہ یکسر خلاف تھا۔ اس نے راجپوتوں سے اس قدر ربط و ضبط پیدا کیا کہ ان کے رنگ میں خود رنگ گیا اور ہندوؤں کے طور طریق اختیار کر لئے پھر "دین الٰہی" کے نام سے ایک نیا مذہب رائج کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

یہ کہا جاتا ہے اور سچ ہی کہا جاتا ہے کہ اکبر نے مذہب اسلام کو جس قدر نقصان پہنچایا اتنا نقصان کافروں اور بے دینوں نے بھی نہیں پہنچایا تھا۔ اکبر صبح کو سورج کی پوجا کرتا اور لوگ (خاص کر ہندو) اسے دیوتا کی طرح پوجتے تھے۔ اس کفر و شرک کے باوجود اس نے راجپوتوں کو زیر کیا اور ان کے بل بوتے پر فتوحات حاصل کر کے اکبر اعظم بن گیا۔ ہمایوں کے عہد حکومت تک برصغیر میں اسلام کا جو چرچا تھا اکبر نے اپنے اعمال سے اسے

سخت نقصان پہنچایا یہ اکبر کی خوش قسمتی تھی کہ اسے برصغیر کے بہترین دماغوں' دانشوروں اور سالاروں کا تعاون حاصل تھا۔ ٹوڈرمل' بیربل' فیضی' ابو الفضل' عبدالنبی اور راجہ مان سنگھ وغیرہ ایسے عالی دماغ لوگ تھے جو اکبر کی عظیم سلطنت کے ستون بنے ہوئے تھے۔

آخر اکبر پچاس سال حکومت کرنے کے بعد تیرسٹھ (۶۳) سال کی عمر میں اس جہان فانی سے ۱۶۰۵ء میں کوچ کر گیا۔

نور الدین محمد جہانگیر

اکبر عمر کے چھبیس سال تک بے اولاد رہا پھر اس نے آگرہ کے قریب سیکری کے علاقہ میں ایک بزرگ سلیم چشتیؒ کی خدمت میں حاضری دی۔ اس سے پہلے وہ خواجہ غریب نواز چشتی اجمیری کی درگاہ پر بھی کئی بار حاضری دے چکا تھا۔ ایک دفعہ تو سخت دھوپ میں وہ پاپیادہ اجمیر گیا تھا۔ بہرحال بزرگوں کی دعاؤں سے اللہ نے اسے ایک چاند سا بیٹا دیا اکبر نے سیکری کے بزرگ سلیم چشتی کے نام پر بچہ کا نام سلیم رکھا اور اسے شیخو بابا کے نام سے مخاطب کرتا تھا۔

شہزادہ سلیم خوبصورت اور قوی ہیکل جوان نکلا۔ جس وقت اکبر دکن میں مصروف تھا اور شہزادہ سلیم اس کا جانشین تھا' اس وقت شہزادے نے بنارس جا کر باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور شاہ کا لقب اختیار کر کے امرا میں جاگیریں تقسیم کرنے لگا۔ اکبر نے دکن سے واپس آ کر سلیم کے خلاف سخت اقدام کیا۔ سلیم بھی لشکر لے کر مقابل ہوا مگر شکست کھا گیا۔ اکبر کے دو اور بیٹے تھے جن کے نام مراد اور دانیال تھے مگر کثرت مے نوشی کے باعث وفات پا گئے تھے اور سلیم ہی اکیلی اولاد رہ گیا تھا اس لیے اکبر نے اسے معاف کر دیا۔

ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ اکبر اور جہانگیر میں محل کی ایک کنیز کی وجہ سے جنگ ہوئی تھی۔ کنیز کا نام انار کلی تھا۔ شہزادہ سلیم اس پر عاشق ہوا اور اسے اپنی ملکہ بنانے کا ارادہ کیا۔ اکبر اس کی اس حرکت پر ناراض ہوا اور کنیز کو دیوار میں چنوا دیا یا ایک خفیہ راستے سے اسے قلعہ سے ہمیشہ کے لیے فرار کرا دیا۔ مگر یہ روایت غلط اور افسانہ ہے جسے مشہور ادیب و ڈرامہ نگار امتیاز علی تاج کے ڈرامہ "انار کلی" سے بڑی شہرت ملی۔

اکبر کی بیماری کے دوران ہی خان اعظم عزیز کوکہ اور راجہ مان سنگھ نے کوشش کی کہ اکبر کے بعد شہزادہ سلیم کے بجائے شہزادے سلیم کا سترہ سالہ بیٹے خسرو کو تخت نشین کیا جائے۔ خسرو راجہ مان سنگھ کا بھانجا اور خان اعظم عزیز کوکہ کا داماد تھا مگران کی کوششیں بار آور نہ ہو سکیں اور خود اکبر نے اپنی بیماری کے دوران سلیم کو بلا کر اس کے سر پر شاہی پگڑی رکھنے اور کمر میں ہمایونی تلوار لٹکانے کا اشارہ" حکم دیا۔

اکبر کے بہت سے امرا نے بھی خسرو کی مخالفت کی تھی کیونکہ خسرو اپنے دادا اکبر کی طرح شرک اور الحاد کی طرف مائل تھا جبکہ شہزادہ سلیم سے امرا کو اسلام کے عروج کی توقع تھی چنانچہ نور الدین جہانگیر نے شہنشاہ نہ ہوتے ہی "زنجیر عدل" لٹکانے کا حکم دیا۔ یہ زنجیر خالص سونے کی تھی اس کا ایک سرا قلعہ کے ایک برج سے بندھا تھا اور دوسرا سرا دریائے جمنا کے کنارے ایک مینار سے باندھا گیا تھا۔ اس سے ساٹھ گھنٹیاں آویزاں تھیں تاکہ فریادی زنجیر کھینچ کر بادشاہ سلیم اپنی فریاد سے آگاہ کر سکے۔

جہانگیر نے بارہ احکامات بھی جاری کئے جنہیں وہ دستور العمل کہتا تھا۔ ان احکامات کے ذریعہ محصولات کی معافی' رہزنی کے خاتمہ' امتناع شراب' متروکہ جائیداد کو اصل وارثوں تک پہنچانے' اعضا کاٹنے کی سزا کی منسوخی' جائیداد پر قبضہ کی روک تھام' شفاخانوں کی تعمیر' جمعرات اور اتوار کو جانوروں کی ذبح پر پابندی اور خیراتی اداروں کے لیے جائیداد اور جاگیروں کی بخشش کا اہتمام' قیدیوں کی رہائی اور قدیم ملازمین کو بحال رکھنے کے حکم نامے جاری کئے تھے۔

جہانگیر نے شراب کی منادی کرا دی تھی مگر خود مے نوشی میں مبتلا ہو گیا اور عمر کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہوتا گیا پھر جب اس نے شیر افگن کی بیوی مہرالنساء نور جہاں سے شادی کی تو خود کو شراب اور ملکہ نور جہاں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ جہانگیر نے نور جہاں کے پہلے شوہر شیر افگن کو ایک سازش کے ذریعہ قتل کرا دیا تھا مگر یہ غلط ہے۔ جہانگیر کا دامن اس الزام سے پاک ہے۔

جہانگیر کے عہد میں شہزادہ خسرو کی بغاوت ایک اہم واقعہ ہے۔ اس کا مختصر حال کچھ اس طرح کہ شہزادہ خسرو کو تخت پر بٹھانے کی سازش ناکام ہو گئی تھی اور جہانگیر نے اسے اور دوسرے سازشیوں سے درگزر کیا تھا مگر شہزادہ خسرو کے دل میں خود شہنشاہ بننے اور باپ کے خلاف بغاوت کے جذبات پوری طرح موجزن تھے۔ پس ایک شام وہ دادا کے مزار

پر جانے کا بہانہ کر کے قلعہ سے نکلا اور پنجاب کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ صرف تین سو پچاس سوار تھے۔ جب وہ متھرا پہنچا تو حسین بیگ تین ہزار سواروں کے ساتھ اس سے آملا اس طرح اس کی فوج میں اضافہ ہوتا گیا۔ ترن تارن کے مقام پر سکھوں کے گرو ارجن نے اسے مالی امداد دی اور اس کی کامیابی کی دعا کی لیکن جب شہزادہ خسرو لاہور پہنچا تو وہاں کے گورنر دلاور خاں نے اس کی اطاعت سے انکار کر دیا۔ شہزادے نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔

جہانگیر کو اطلاع ملی تو اس نے فوراً" فرید بخاری کو شہزادے کے تعاقب میں روانہ کیا اور خود بھی دوسرے دن لشکر لے کر لاہور کی طرف چلا۔ شہزادے کو شہنشاہ کے آنے کی خبر ملی تو وہ گھبرا گیا اور کسی طرف نکل جانے کی فکر کرنے لگا مگر شاہی فوج نے اسے بھیرووال میں گھیر کر شکست سے دوچار کیا۔ خسرو نے چاہا کہ وہ کابل یا بنگال کی طرف بھاگ نکلے۔ بنگال میں اس وقت خسرو کا ماموں راجہ مان سنگھ گورنر تھا مگر وہ اس شش و پنج میں تھا کہ دریائے چناب پار کرنے سے پہلے ہی گرفتار کر لیا گیا۔

جہانگیر لاہور پہنچ چکا تھا۔ شہزادے خسرو کو اس کے سامنے کامران کی حویلی میں پیش کیا گیا۔ شہزادہ اس وقت پابہ زنجیر تھا اور خوف کی وجہ سے اس کے آنسو رواں تھے۔ اس دفعہ جہانگیر نے اسے معاف نہ کیا اور اس کی آنکھوں میں گرم سلائی پھروا کر اندھا کر دیا پھر جب محبت پدری بیدار ہوئی تو جہانگیر نے خسرو کا علاج کرایا جس سے اس کی ایک آنکھ میں بینائی پیدا ہوئی۔

اس کے بعد جب جہانگیر کا دوسرا بیٹا شہزادہ خرم جو شاہجہاں کے نام سے مشہور ہوا۔ دکن جانے لگا تو جہانگیر نے خسرو کو اس کے ساتھ دکن بھیج دیا۔ ایک افواہ یہ بھی ہے کہ خرم نے اسے اپنا تخت شاہی کا رقیب سمجھتے ہوئے ختم کر دیا مگر جہانگیر نے تزک جہانگیری میں لکھا ہے خسرو کا انتقال درد قولنج سے ہوا۔ واللہ اعلم

شہزادہ خسرو نہایت حسین و جمیل تھا اور دردمند دل رکھتا تھا۔ اس کی اعلیٰ صفات کی وجہ سے لوگ اس سے محبت کرتے تھے مگر ہوس اقتدار نے آخر اس کا خاتمہ کر دیا اس کی لاش کو دکن سے لا کر الہ آباد میں دفن کیا گیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ خسرو کو الہ آباد میں قید کیا گیا تھا جہاں اس کی نیک اور صابر بیوی ایک زمانہ تک اس کی خدمت کرتی رہی۔ خسرو کا مقبرہ الہ آباد میں ہے اور راقم الحروف کو اس کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کا اکثر موقع ملا

تھا کیونکہ میں دو سال الہ آباد (بھارت) میں مقیم رہا تھا۔

شہنشاہ جہانگیر کے عہد حکومت میں ملکہ نور جہاں کا بھی ایک عہد ہے۔ نور جہاں کے بیوہ ہونے کے بعد جب اس کی شادی جہانگیر سے ہوئی تو اس کی عمر ۳۴ سال تھی۔ مگر اس کے سامنے کسی اور کا چراغ نہ جلتا تھا۔ نور جہاں خوبصورت اور صاحب جمال خاتون تھی۔ نہایت نفاست پسند' بیدار مغز اور اعلیٰ تعلیم اور شائستگی کا پیکر تھی۔ فن کارانہ مزاج اور سخن آرائی نے مل کر اسے قدرت کا ایک شاہکار بنا دیا تھا۔ نور جہاں صرف نازک اندام حسینہ ہی نہ تھی بلکہ وہ مضبوط قلب و جگر کی مالک تھی۔ جہانگیر جو شراب کا رسیا ہوتا تھا نور جہاں اتنا ہی اس کے حواسوں پر چھاتی چلی گئی۔ معاملہ فہم اتنی کہ ملکی انتظامی معاملات کی گتھیاں چٹکیوں میں سلجھا لیتی تھی۔ جہانگیر کے ساتھ شکار پر جاتی تھی اس نے کئی شیر شکار کئے تھے۔ جس وقت مہابت خاں نے شہنشاہ کو حراست میں لیا تو نور جہاں فوراً" ہاتھی پر سوار ہوئی حالانکہ نواسی اس کی گود میں تھی پھر بھی اس نے کمان سنبھالی اور شہنشاہ کو بچانے کی جرات مندانہ کوشش کی۔

نور جہاں کے اقتدار کی وجہ سے اس کے بھائی اور باپ کو اعلیٰ عہدے حاصل ہوئے ملکہ کا بھائی آصف خاں کا مرتبہ تمام امرا سے بلند تھا۔ نور جہاں شہنشاہ سے بھی بہت زیادہ محبت کرتی تھی۔ جہانگیر کے انتقال کے بعد وہ اٹھارہ سال زندہ رہی اور شوہر کی قبر میں نئی نئی اختراعات کیں۔ کس کی ٹٹی اور چاندنی کا فرش اس کی ایجاد ہیں۔

جہانگیر کی جگہ دراصل نور جہاں حکومت کرتی تھی۔ قدیم امرا اس کے خلاف تھے اور ان میں گروہ بندیاں کا آغاز ہو گیا تھا۔ نور جہاں نے پہلے شہزادہ خرم کو آگے بڑھایا مگر جب شیر افگن سے اس کی بیٹی لاڈلی بیگم کی شادی جہانگیر کے چھوٹے بیٹے شہریار سے ہوئی تو نور جہاں نے شہریار کو مغل تخت و تاج کا وارث بنانے کی کوشش کی۔ اس سے شہزادہ خرم باغی ہو گیا۔

شراب خوری کی وجہ سے جہانگیر کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی جہاں تک کہ کشمیر سے واپسی پر اس پر دمہ کا سخت دورہ پڑا اور ۲۸ اکتوبر ۱۶۲۷ء کو اس نے راجوری کے مقام پر وفات پائی۔ اس کی لاش لاہور لائی گئی اور شاہدرہ کے قریب دلکشا باغ میں دفن ہوا۔ جہانگیر نہایت دلچسپ اور رنگا رنگ طبیعت کا مالک تھا۔ دربار اکبری میں بے شمار علماء اور فضلاء جمع ہو گئے تھے ان سے جہانگیر نے استفادہ کیا۔ اس میں جمالیاتی ذوق کی کمی نہ

تھی۔ اس نے مختلف مقامات پر خوبصورت باغات لگوائے۔ کشمیر سے اسے جیسے عشق تھا۔

جہانگیر کی صحت کو مے نوشی نے گھن لگا دیا۔ اس نے پندرہ سال کی عمر میں شراب پینا شروع کیا پھر اس میں اس قدر زیادتی ہوئی کہ وہ جام اٹھانے کے بھی قابل نہ رہ گیا بہرحال اس کے دور میں فن مصوری نے بہت ترقی کی۔ کسی حد تک امن و امان بھی رہا اس نے سلام کرتے وقت سجدے کی حد تک جھکنے کی ممانعت کرا دی۔ جہانگیر کی تاریخ کا سیاسی پہلو اگرچہ دلچسپ ہے مگر اس کی اصل خوبی ثقافتی ترقی میں مضمر ہے۔

شہاب الدین محمد شاہجہان

مغل خاندان میں سب سے زیادہ وجیہہ شہزادہ خرم ہی تھا جو بعد میں شاہجہاں کے نام سے ہند کی شاہی مسند پر بیٹھا۔ اس نے تعلیم بھی حاصل کی لیکن اس کا جھکاؤ جسمانی تربیت کی طرف زیادہ تھا۔ خرم بروز جمعرات ۵ جنوری ۱۵۹۲ء لاہور میں پیدا ہوا۔ اس کی ماں ماڑ واڑ کے راجپوت خاندان کی راجکماری تھی۔ شاہجہاں کا باپ بھی ایک راجپوت رانی جس کا نام مریم زمانی رکھا گیا تھا۔ کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ کہتے ہیں شہزادہ خرم کو چار سال' چار ماہ اور چار دن کی عمر میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے استاد کے سامنے بٹھایا گیا۔ مغل شہزادے عام طور سے اس عمر سے تعلیم کی ابتدا کرتے تھے۔

شہزادہ خرم تیسرا بیٹا تھا' جہانگیر کا ایک بیٹا خسرو باپ سے باغی ہو گیا تھا دوسرا بیٹا شہزادہ پرویز حد درجہ نکما اور ہمہ وقت شراب میں مدہوش رہتا تھا اس لیے جہانگیر کو خرم سے امیدیں تھیں۔ جہانگیر کے عہد کی تمام فتوحات خرم کے مرہون منت تھیں اور یہ دراصل خرم ہی کے کارنامے تھے۔

شہزادہ خرم وزیراعظم آصف خاں کا داماد تھا اور وہ سب سے زیادہ مغل تخت کا اہل بھی تھا اس لیے آصف خاں اسے تاجدار ہند بنانا چاہتا تھا۔ اس کے مقابلہ پر وزیراعظم آصف خاں کی بہن ملکہ نور جہاں کا داماد شہزادہ شہریار' خرم کے بھائی خسرو' دانیال اور ان کی اولادیں تھیں۔ خرم کا سب سے بڑا دشمن شہریار تھا جسے اپنی ساس ملکہ نور جہاں کی حمایت حاصل تھی۔

جہانگیر کا انتقال لاہور میں ہوا تھا۔ نور جہاں نے فوراً" شہریار کو اطلاع بھجوائی کہ وہ

جتنی زیادہ فوج جمع کر سکتا ہو جمع کرے اور اپنی بادشاہی کا اعلان کر دے۔ آصف خاں اپنے داماد خرم کے لیے کوشاں تھا۔ اس نے اپنی کامیاب سیاسی چال سے ملکہ نور جہاں کی بساط سیاست الٹ دی۔ آصف خاں نے ایک طرف سے تو شہزادہ خرم کو جو دکن میں تھا جہانگیر کی موت کی اطلاع بھجوائی دوسری طرف بھمبر پہنچ کے باغی شہزادے خسرو کے بیٹے دارا بخش کو تخت پر بٹھا دیا۔

اب لاہور کے قریب آصف خاں اور شہریار کے لشکر میں جنگ ہوئی۔ شہریار نے شکست کھائی اور گرفتار ہو گیا۔ شہزادہ خرم بڑی تیزی سے آگرہ پہنچ رہا تھا ایک بیان کے مطابق خرم کے حکم پر یا پھر خود آصف خاں نے اپنے داماد کا راستہ صاف کرنے کی خاطر تمام شہزادوں کے قتل کا منصوبہ بنایا اور اس منصوبے پر فوراً" عمل کیا۔ آصف خاں نے دارا بخش جو بلاقی کہلاتا تھا' شہریار جو نا شلافی کے نام سے مشہور تھا اور شہزادے دانیال کے دونوں بیٹوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اب خرم کے لیے میدان بالکل صاف تھا۔ وہ بڑی شان سے آگرہ میں داخل ہوا اور ۴ فروری ۱۶۲۸ء کو ابو المظفر شہاب الدین محمد صاحبقراں ثانی شاہجہاں کے لقب سے سریر آرائے سلطنت ہوا۔

ملکہ نور جہاں نے سیاست سے کنارہ کشی کا اعلان کر دیا۔ شاہجہاں نے ملکہ کے لیے دو لاکھ سالانہ کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ نور جہاں نے اپنی بیٹی لاڈلی بیگم کے ساتھ بقیہ زندگی لاہور میں گذار دی اب وہ سادہ زندگی گذارتی تھی اور خیراتی کاموں میں حصہ لیتی تھی۔ جہانگیر کا مقبرہ لاہور میں بنا تو نور جہاں بھی لاہور میں دفن ہوئی اور آصف خاں کو بھی لاہور میں دفن کیا گیا۔ ان تینوں کے مقبرے لاہور شاہدرہ میں اس وقت بھی موجود ہیں۔ نور جہاں اور آصف خاں کے مقبرے اجڑے ہوئے ہیں جبکہ مقبرہ جہانگیر لاہور کی بہترین عمارتوں میں شمار ہوتا ہے۔

احیائے شریعت

مغل شہنشاہ اکبر نے اپنے مشرکانہ اور غیر شرعی طریقوں سے اسلام کی روایات کو شدید نقصان پہنچایا تھا اگر خدانخواستہ جہانگیر بھی باپ کی روش پر چلا ہوتا تو پھر نہ جانے اس کا کیا انجام ہوتا لیکن جہانگیر نے اکبر کی بہت سی بدعات کو قانوناً" ممنوع قرار دیا۔ اس نے اسلام کی حفاظت کا بھی عہد کیا تھا مگر وہ اس سلسلہ میں کوئی قدم نہ اٹھا سکا۔ اب اس مقولہ کے تحت کہ

"اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند"

(جو کام باپ نہ کر سکا وہ بیٹے نے کر دکھایا)

جہانگیر کے بعد شاہجہاں نے واقعی کچھ عملی اقدام کیے۔ دربار میں حاضری کے وقت بادشاہ کو کسی نہ کسی طور "سجدہ" کرنا اب تک چلا آ رہا تھا اگرچہ جہانگیر نے بھی اس کی ممانعت کی تھی۔ شاہجہاں نے سلام کے اس طریقہ کو یکسر بدل دیا۔ شاہجہاں شہزادگی کے زمانہ ہی سے حضرت مجدد الف ثانی کی تحریک احیائے شریعت سے متاثر تھا اور شرعی قوانین کو جاری کرنے کا خواہش مند تھا اس لیے اس نے تخت نشیں ہوتے ہی بادشاہ کو سجدہ کرنے کی رسم سلام کو بند کرا دیا اور صرف زمین کو ہاتھ سے چھونے کا طریقہ رائج کیا۔

سلام کے اس نئے طریقہ کا یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سلام کرنے والا پہلے اپنے دائیں ہاتھ سے زمین کو چھوتا پھر ہاتھ کی پشت کو چومتا تھا۔ چونکہ اس میں بھی "سجدہ" کا شبہ شامل تھا اس لیے شاہجہاں نے اس طریقہ کو بھی ختم کرا دیا اور چہار تسلیم کا طریقہ رائج کرایا اس میں سر کو ذرا خم کر کے پیشانی' آنکھوں اور بازوؤں کو چھونا شامل تھا۔ صوفیائے کرام اور سادات کو اس سے بھی مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ وہ محض اسلامی سلام کہتے تھے۔

شاہجہاں نے سرکاری تحریروں میں سن ہجری لکھنا قانوناً" رائج کیا جہانگیر کے وقت تک ہندوانہ تہواروں اور رسموں کا اعلان زیادہ ہوتا تھا مگر شاہجہاں کے زمانہ میں اسلامی تہواروں پر دھوم دھام کا رواج ہوا۔ جس میں زکوۃ اور خیرات کی تقسیم ہوتی اور مقدس مقامات کو نذرانے بھیجے جاتے۔ مسلمان خواتین کی غیر مسلموں سے شادیاں بند کر دی گئیں مگر غیر مسلموں کے ساتھ رواداری کا رویہ برقرار رکھا اور انہیں بڑے بڑے مناصب دئے جانے کا رواج بھی برقرار رہا۔

شاہجہاں کی شادی اور اولادیں

شاہجہاں کے محل میں اس کی کئی بیویاں تھیں جو ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ شاہجہاں کا عقد ایران کے مشہور شاہ اسماعیل صفوی کے پوتے مظفر حسین مرزا کی لڑکی سے

ہوا تھا جو قندھاری بیگم کے لقب سے مشہور تھیں۔ اس کے بطن سے ایک لڑکی بھی پیدا ہوئی تھی جس کا نام پرہیز بانو بیگم تھا لیکن جو عروج شاہجہاں کی ملکہ ممتاز محل کو حاصل ہوا‘ اس کو کوئی اور بیگم نہ پہنچ سکی۔ چنانچہ:۔

۱۔ ارجمند بانو ۲۔ نواب علیا بیگم
۳۔ نواب قدسیہ بیگم ۴۔ تاج محل
۵۔ ممتاز محل ۶۔ تاج بی بی
۷۔ ممتاز الزمانی بیگم

یہ ساتوں نام اس خوش نصیب ہستی کے ہیں جسے تاریخ ممتاز محل کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ ممتاز محل کو آٹھواں نام شاہجہاں کی تخت نشینی کے وقت دیا گیا تھا اور وہ نام تھا ”ملکہ زماں“۔

تاریخ میں جہانگیر اور نور جہاں کی محبت کا بہت چرچا ہے مگر شاہجہاں کو ممتاز محل سے جس قدر محبت تھی اس کی مثال دنیا میں نہیں مل سکتی۔ جہاں تک نور جہاں اور ممتاز محل کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں اگر یہ کہا جائے کہ ممتاز محل کو نور جہاں پر کئی اعتبار سے فوقیت تھی تو کچھ غلط نہ ہو گا جیسا کہ مندرجہ ذیل باتوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

۱۔ نور جہاں کا بچپن تنگ دستی اور غربت میں گزرا تھا جبکہ ممتاز محل کے باپ بھائی امیر و وزیر تھے۔ خود نور جہاں نے بھی ممتاز محل کی پرورش کی تھی۔

۲۔ نور جہاں کے قدو قامت سے ممتاز محل کا قدو قامت ہندوستانی مذاق کے مطابق زیادہ موزوں تھا کیونکہ نور جہاں ایک طرح سے خالص ایرانی تھی۔ اس کی پیدائش اس وقت ہوئی تھی جب اس کا باپ ہندوستان میں داخل ہوا تھا۔ مگر ممتاز چونکہ آصف خاں کی بیٹی اور نور جہاں کی بھانجی تھی اس لیے اس نے ہندوستانی قدو قامت اور رنگ روپ پایا تھا جس میں ملاحت اور صباحت شامل ہوتی ہے۔

۳۔ نور جہاں کی پہلی شادی شیر افگن سے ہوئی تھی اس کے قتل کے بعد وہ شہنشاہ جہانگیر کی ملکہ بنی تھی جبکہ ممتاز محل جب شاہجہاں سے بیاہی گئی تو وہ کنواری تھی۔

۴۔ نور جہاں کے بطن سے کوئی شہزادہ پیدا نہیں ہوا جبکہ ممتاز محل نے اورنگ زیب عالمگیر جیسے عظیم شہنشاہ کو جنم دیا تھا۔

۵۔ ممتاز محل نے مرنے کے بعد جو مقام پایا وہ ہندوستان اور ایران کی کسی شہزادی کو

حاصل نہیں ہو سکا۔ شاہجہاں نے ممتاز محل کی یاد میں ”تاج محل“ جیسی یادگار عمارت تعمیر کرائی جو دنیا کے عجائبات میں شامل ہے اور جس کی نفاست اور الحاقت کو دنیا کی کوئی عمارت نہیں پہنچتی۔

ممتاز محل کی ماں کا نام دیوانجی بیگم تھا۔ اس خوش نصیب ماں کے بطن سے یہ ہونہار لڑکی ۱۵۹۲ء میں پیدا ہوئی اور نہایت امیرانہ ٹھاٹ باٹ سے اس کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ حسن کے اعتبار سے تو وہ ایک آسمانی حور یا ستارہ تھی۔ اعلیٰ تعلیم و تربیت نے اس کے حسن میں سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ شہنشاہ جہانگیر حسن کا بہت بڑا معتبر تھا۔ اس نے ممتاز محل کا اپنے بیٹے شاہجہاں کے لیے انتخاب کیا اور اس گوہر شاہوار کی شادی ۹ ربیع الاول ۱۰۰۱ھ بمطابق ۱۶۱۲ء جمعہ کو شاہجہاں کے ساتھ ہوئی جس کی عمر اس وقت بیس سال گیارہ ماہ ہو چکی تھی۔

چونکہ اس کتاب کا مرکزی کردار شہنشاہ عالمگیر ہے اور ممتاز محل اس شہنشاہ کی والدہ محترمہ تھیں اس لیے اگر اس محترم اور معظم خاتون کی رنگا رنگ شادی کا تھوڑا سا حال بیان کر دیا جائے تو قارئین کی دلچسپی کا باعث ہو گا۔

بزم شادی

شادی کی محفل وزیر جہانگیر اعتماد الدولہ میرزا غیاث بیگ کے محل پر بڑے تزک و احتشام سے منعقد ہوئی اور شہنشاہ جہانگیر نے دولھا دلھن کے متعلق تمام رسومات نہایت خندہ پیشانی سے پوری کیں۔ وہ شادی کے تمام کاموں میں شریک رہا۔ جہانگیر نے نکاح کے وقت نوشہ کے عمامہ پر موتیوں کا ہار باندھا اور پانچ لاکھ روپے کے مہر پر نکاح پڑھا گیا۔

شادی کے بعد ممتاز محل ہمیشہ شاہجہاں کے ساتھ رہی۔ شاہجہاں نے ایک دم کے لیے بھی اس کی جدائی گوارہ نہ کی۔ دکن کی لڑائیوں میں بھی ممتاز محل اس کے ساتھ تھی۔ شاہجہاں اہم معاملات میں ممتاز محل سے مشورہ کرتا۔ ممتاز محل کی رائے ہمیشہ صائب ہوتی تھی۔ دکن میں جب تک یہ دونوں رہے ان کی زندگی سکون و اطمینان سے گزرتی رہی لیکن اسی دوران نور جہاں نے اپنی بیٹی لاڈلی بیگم جو شیر افگن سے تھی‘ کی شادی جہانگیر کے دوسرے شہزادے یعنی شہریار سے کرا دی جس کے نتیجے میں بھائی بھائی اور باپ بیٹے میں تفرقہ پڑ گیا۔ خود گھر میں اس کے باپ اعتماد الدولہ اور آصف الدولہ سے ملکہ کا اختلاف پیدا

ہو گیا۔

نور جہاں اپنے داماد شہریار کو شہنشاہ بنانا چاہتی تھی جبکہ اس کا بھائی آصف الدولہ اپنے داماد شاہجہاں کے سر پر شاہی تاج رکھنا چاہتا تھا۔ پھر جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ آصف خان نے اپنے حسن تدبیر سے تخت کے خواہش مند تمام شہزادوں کو ختم کرا دیا اور شاہجہاں شہنشاہ ہند بن گیا۔

تخت نشینی کے بعد شاہجہاں نے دو لاکھ اشرفیاں ملکہ کو بطور انعام عطا کیں اور دس لاکھ روپے سالانہ کی جاگیر اس کے لیے مقرر کی پھر ایام جشن نور زریں پچاس لاکھ روپے کے زیورات ممتاز محل کے لیے منظور کیے۔ اس کا سالانہ وظیفہ بھی دو لاکھ کر دیا گیا۔ عہد شاہجہانی میں ممتاز محل کو وہی عزت اور مرتبہ حاصل تھا جو دور جہانگیری میں نور جہاں کو حاصل تھا۔ شاہجہاں نے مہر سلطانی بھی ممتاز محل کے حوالے کر دی تھی۔ آخر اس نے یہ خدمت اپنے باپ سے متعلق کر دی جو سلطنت کا وزیراعظم تھا۔ آصف جاہ کا منصب نو ہزاری ہو گیا اور اسے پچاس لاکھ سالانہ کی جاگیر بھی دی گئی۔

۱۶۳۱ء میں شاہجہاں، دکن میں برہانپور میں خان جہاں لودھی کی سرکوبی کے لیے خیمہ زن تھا تو ممتاز محل درد زہ میں مبتلا ہوئی۔ وہ چوبیس گھنٹے اس درد میں مبتلا رہی پھر دوسری شب اس کے لڑکی پیدا ہوئی مگر ملکہ ممتاز محل کی بے چینی دور نہ ہو سکی اور وہ شاہجہاں کی موجودگی میں ایک دردناک وصیت کے بعد ۳۹ سال کی عمر میں وفات پا گئی۔

مصرعہ تاریخ یہ ہے۔

جا کے ممتاز محل جنت باد

۱۰۴۰ ہجری

ممتاز محل کی وفات سے شاہجہاں کو سخت صدمہ پہنچا جسے وہ تمام عمر نہ بھلا سکا۔ ممتاز محل کو برہانپور میں امانتاً" دفن کیا گیا پھر دوسرے سال اس کی لاش بحفاظت شہزادہ شجاع اور ممتاز محل کی اتالیق ستی النساء خانم اکبر آباد لے آئیں اور تاج گنج کے باغ کے صحن میں دفن کی گئی پھر جب مقبرہ تاج محل تیار ہو گیا تو اصل مقبرہ کی قبر میں دفن کیا گیا۔

شاہجہاں کی اولادیں

شاہجہاں کی کئی بیویاں تھیں مگر ممتاز محل ہی وہ واحد بیوی تھی جس کے بطن سے شاہجہاں کی چودہ اولادیں ہوئیں سوائے ایک ایرانی بیوی قندھاری بیگم کے۔ اس بیوی سے پرہیز بانو بیگم نام کی ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی باقی کسی اور بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ نور جہاں نے اپنے داماد شہریار کے لیے جہانگیر اور شاہجہاں میں ان بن کرا دی تھی جس سے شاہجہاں اور ممتاز محل کو بہت تکالیف اٹھانا پڑی تھیں لیکن شاہجہاں اور ممتاز محل نے نور جہاں سے جو ممتاز محل کی سگی پھوپھی تھی اپنے ساتھ کی گئی بدسلوکی کا بدلہ نہیں لیا بلکہ نور جہاں کو پورے احترام سے لاہور میں رہنے کی اجازت دی اور بیس لاکھ روپے سالانہ کا وظیفہ ان کے لیے مقرر کر دیا۔ ممتاز محل کے اس سلوک سے اس کی نیک طبیعت کا پتہ چلتا ہے۔

ممتاز محل نے اپنی زندگی میں سینکڑوں مجرموں کے قصور معاف کرانے کی کوشش کی۔ سینکڑوں قرضداروں کے قرض ادا کیے۔ ہزاروں لاوارث لڑکوں اور لڑکیوں کی شادیاں کرائیں ان کے وظیفے مقرر کرائے۔ لاکھوں ننگے بھوکوں کی پرورش کا سامان کیا۔ کسی دوسری بیگم نے ایسی نیکیاں نہ کی تھیں۔

ممتاز محل کے بطن سے آٹھ لڑکے اور چھ لڑکیاں پیدا ہوئیں جن کی ترتیب اس طرح ہے۔

۱۔ حور النساء بیگم ۸ صفر ۱۰۲۲ ہجری کو آگرہ میں پیدا ہوئیں۔ اس نے تین سال ایک ماہ بعد انتقال کیا۔

۲۔ جہاں آرا بیگم ۲۱ صفر ۱۰۲۲ ہجری کو پیدا ہوئیں۔

۳۔ داراشکوہ اجمیر میں ۲۹ صفر ۱۰۲۴ ہری میں پیدا ہوا۔

۴۔ شاہ شجاع اجمیر میں ۱۸ جمادی الاخر ۱۰۲۵ ہجری میں پیدا ہوا۔

۵۔ روشن آرا بیگم ۔ برہانپور (دکن) میں دو رمضان المبارک ۱۰۲۶ ہجری میں پیدا ہوئی۔

۶۔ اورنگ زیب عالمگیر ۵ ذیلقعد ۱۰۲۷ ہجری کو پیدا ہوا۔

۷۔ امیر بخش ۱۱ محرم ۱۰۲۹ ہجری کو پیدا ہوا اور ۱۰۳۱ ہجری کو برہانپور میں انتقال کیا۔

۸۔ ثریا بیگم۔ ۲۰ رجب ۱۰۳۰ ہجری پیدا ہوئی اور سات سال کی عمر میں فوت ہو گئی۔

۹۔ ایک اور لڑکا پیدا ہوا جو چند روز بعد مر گیا۔

۱۰۔ مراد بخش قلعہ رہتاس میں ۲۵ ذوالحجہ ۱۰۳۳ ہجری میں پیدا ہوا۔

۱۱۔ لطف اللہ۔ ۴ صفر ۱۰۳۴ ہجری کو پیدا ہوا اور آٹھویں سال مر گیا۔

۱۲۔ شہزادہ دولت افزا۔ ۱۰۳۷ ہجری میں پیدا ہوا اور اسی سال انتقال کیا۔

۱۳۔ صبیعہ قدسیہ۔ دس رمضان ۱۰۳۹ ہجری میں پیدا ہوئی اور اسی سال رحلت کر گئی۔

۱۴۔ گوہر ارا بیگم (آخری لڑکی) ۱۷ ذی قعد ۱۰۴۰ ہجری برہانپور میں پیدا ہوئی اسی زچگی میں ممتاز محل نے انتقال کیا۔

شاہجہاں کی ایک اور بیوی کا کئی تاریخوں میں نام اور تھوڑا سا حال ملتا ہے جو اس طرح ہے۔

اعزاز النساء بیگم

یہ بیگم پہلے اکبر آبادی بیگم کے نام سے یاد کی جاتی تھیں پھر اعزاز النساء بیگم کا خطاب پایا۔ یہ بیگم شاہجہاں بادشاہ کی معزز بیگمات میں سے ہیں۔ شاہجہاں کی ممتاز محل سے شادی کرنے سے اعزاز النساء بیگم بڑا کڑور دورہ رہا تھا۔ ممتاز محل سے شادی کے بعد بھی اس بیگم کے اعزاز میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ممتاز محل کا درجہ خاص تھا۔ اس کے باپ آصف خاں کے وزیر سلطنت ہونے کی وجہ سے ممتاز محل کو ساری سلطنت پر اقتدار حاصل تھا۔ ممتاز محل کے حسن ذاتی اور صفات اعلیٰ نے اسے بادشاہ کی نظروں میں سب سے زیادہ بلند درجہ حاصل تھا لیکن اعزازی بیگم کے ذاتی صفات حسن اخلاق اور ہر ایک سے مناسب برتاؤ نے اسے بہت ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ خود ممتاز محل بھی جو اس کی حریف تھی وہ بھی اعزازی بیگم کے اخلاق اور ملنساری کی فریفتہ تھی۔

اکثر ایسا ہوتا کہ دونوں یعنی اعزازی بیگم اور ملکہ ممتاز محل بادشاہ کے حضور مل کے بیٹھ جاتی تھیں تو قطبین کا منظر پیش نظر ہوتا یا پھر جیسے چاند کے پاس زہرہ و مشتری جمع ہو

جائیں۔ اعزازی بیگم حسن و جمال میں کچھ کم نہ تھیں۔ ان میں اگرچہ ملنساری اور اعلیٰ اخلاق کی صفات موجود تھیں لیکن وہ حد درجہ کی غیور تھیں۔ انہیں اپنی خود داری اور ذاتی تمکنت کا بڑا خیال رہتا تھا۔ اعزازی بیگم کے محل میں ہر بات ایک حد کے اندر رہتی تھی۔ کوئی بھی اونچی آواز سے نہ بول سکتا تھا۔ وہ خود بھی نرم لہجہ اور دبی آواز میں بات کرتی تھیں۔ وہ ہر کام کے لیے وقت کی پابند تھیں۔ شاعری نظم و نثر میں بڑی قابلیت کی مالک تھیں۔ خط نستعلیق میں اچھی مہارت حاصل تھی۔

اعزازی بیگم کے بطن سے ایک لڑکا ہوا تھا مگر تین سال کا ہو کر انتقال کر گیا وہ ممتاز محل کی اولاد کو اپنی اولاد سمجھتیں۔ بچے بھی ان کا ادب اپنی سگی ماں کی طرح کرتے تھے۔ چنانچہ ممتاز بیگم کے انتقال کے بعد اس کے جو بچے چھوٹے تھے، اعزازی بیگم نے ان کی دیکھ بھال میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا تھا۔ یہ ایسی باتیں تھیں جو اعزازی بیگم کو بادشاہ اور محل کی دوسری خواتین میں قابل احترام بنائے رکھتی تھیں۔

ممتاز محل کے بعد اگر بادشاہ کسی بیگم پر کچھ توجہ دیتے تھے تو وہ صرف اعزازی بیگم تھیں ورنہ ممتاز محل کی محبت نے بادشاہ کو سب سے لا تعلق کر دیا تھا۔ اعزازی بیگم کی طبیعت رشک و حسد سے بالکل پاک تھی ممتاز محل جب کبھی بادشاہ سے روٹھ جاتی تو وہ اعزازی بیگم ہی تھیں جو دونوں طرف سے گفت و شنید کرتیں اور درمیان پڑ کر بڑی خوبی اور خلوص سے ان کے درمیان صلح و صفائی کراتی تھیں۔ ان کے اس خلوص اور ادا سے شاہجہاں اور ممتاز محل دونوں کو ان کا والا و شیدا بنا دیا تھا۔ ایسے موقعہ پر ممتاز محبت بڑے پیار سے ان کے گلے میں باہیں ڈال کر بچوں کی طرح جھول جاتی تھی۔

اعزازی بیگم شاہی، محلات کے قواعد کی خود پابند تھیں اور اپنے ملازمین کو بھی کسی طرح کی بے قاعدگی کی اجازت نہ دیتی تھیں اس طرح ان کا ہر ملازم اور ملازمہ قواعد کی پابندی کا نمونہ پیش کرتا تھا۔

پیدائش

سلطنت مغلیہ کا آخری عظیم فرمانروا اورنگ زیب عالمگیر ۲۴ اکتوبر ۱۶۱۸ء مطابق ۱۵

ذی قعد ۱۰۲۷ ہجری گجرات کے ایک مقام دوحد میں پیدا ہوا۔ یہ شہنشاہ جہانگیر کا دور حکومت تھا اور اس کا بیٹا شہزادہ خرم معہ اپنی لاڈلی اور چاہتی بیگم ممتاز محل کے شہنشاہ کے ہمرکاب تھا دوحد کا مقام مالوہ اور احمد آباد کی سرحد پر واقع تھا اور ۱۵ ذیقعد کی شب جب اورنگ زیب پیدا ہوا تو شاہی لشکر اس مقام پر ٹھہرا ہوا تھا۔

اس وقت کیسے معلوم تھا کہ ضدی اور خود سر شہزادہ خرم کا یہ تیسرا بیٹا سلطنت مغلیہ کا آخری عظیم شہنشاہ ہو گا بلکہ برصغیر کی تاریخ میں عظمت و استقلال اور فقر و شہنشاہی کا ایک نیا باب رقم کرے گا۔ بچہ کی پیدائش کے وقت شہزادہ خرم (شاہجہاں) برابر کے خیمہ میں موجود تھا۔ بچے کی آواز سن کر وہ تیز قدموں سے اس خیمہ میں داخل ہوا جسے زچہ خانہ کے طور پر استعمال کیا گیا تھا تو سب سے پہلے اس کی نظر چاہتی بیوی کے مسکراتے چہرے پر پڑی۔

"ولی عہد کو تیسرا بیٹا مبارک ہو"۔ ممتاز محل نے پر مسرت لہجے میں شہزادے کو بیٹے کی پیدائش کی نوید سنائی۔

"تم کو بھی مبارک ہو جان خرم" اور شہزادے نے چاہا کہ دایہ کے ہاتھوں میں کپڑے سے لپٹی ہوئی گوشت پوست کی اس پوٹلی کو چھین کر اپنے سینے سے لگا لے۔ مگر ممتاز محل نے اسے اشارے سے منع کر دیا۔

پھر شہزادہ ایک ہزار اشرفیوں کی تھیلی اٹھائے تیز تیز قدموں سے شہنشاہ کے عالی شان خیمے میں اس انداز سے داخل ہوا کہ پہرے پر کھڑے چاروں محافظ دبک کر ایک طرف ہو گئے اور شہزادہ اسی عالم بے خود اور سرشاری میں شہنشاہ کے سامنے پہنچ گیا۔

"خرم۔ کیا ہوا تجھے؟" شہنشاہ نے حیران نظروں سے اسے دیکھا۔

"ابا حضور کی خدمت میں تیسرے غلام کی نوید مسرت پیش کرنے حاضر ہوا ہوں" خرم نے ہکلاتے ہوئے مشکل سے الفاظ ادا کئے اور ہزار اشرفیوں سے بھری تھیلی شہنشاہ کے قدموں میں رکھ دی۔

شہنشاہ جہانگیر مسکرایا اس نے نظریں گھما کر ملکہ نور جہاں کو دیکھا۔ ملکہ کے چہرے پر بھی مسرت کی لکیریں چمک اٹھی تھیں۔

"مبارک ہو تمہیں"۔ شہنشاہ نے آہستہ سے کہا۔

"اس خانہ زاد کا نام تجویز فرمایا جائے ابا حضور؟" شہزادے نے التماس کیا۔

"اورنگ زیب"۔ شہنشاہ نے چند لمحوں کے توقف کے بعد فرمایا۔

پھر ایک درباری شاعر طالب علی کلیم نے اورنگ کی پیدائش کی تاریخ لکھی۔ چنانچہ اس کی تاریخ تھی۔

"آفتاب عالم تاب"

۱۰۲۷ ہجری

اس کے ساتھ ہی ایک اور مورخ محمد علی کنبوہ نے عمل صالح میں اورنگ کی پیدائش کی تاریخ ایک اور لکھی ہے جو یہ ہے۔

"گوہر تاج ملوک اورنگ زیب"

دوحد کا مقام اس وقت غالباً ویران سا تھا اس لیے شاہی قافلہ وہاں زیادہ دن نہ ٹھہرا اور نام رکھنے کی رسم ادا کرتے ہی وہاں سے چل پڑا۔ اگلی منزل مالوہ کے صدر مقام اجین میں ہوئی وہاں اورنگ زیب کا جشن ولادت منایا گیا۔ جہانگیر نے اس خوشی کے موقعہ پر اپنے امراء میں انعامات تقسیم کیے۔

اس سلسلہ میں تعجب کی بات یہ ہے کہ خافی خاں نے اپنی تصنیف منتخب اللباب میں اورنگ زیب کی تاریخ کا سال پیدائش ۱۰۲۸ ہجری لکھا ہے اور غالباً خافی خاں کی تقلید میں ظفر نامہ کے مصنف نے بھی یہی غلطی کی ہے جبکہ محمد صالح کنبوہ اور تزک جہانگیری میں یہ پیدائش ۱۰۲۷ ہجری بیان کی گئی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ محمد صالح کنبوہ' شاہجہاں کے درمن سے وابستہ تھا اور وہ ۱۰۷۵ ہجری تک زندہ رہا تھا۔

منتخب اللباب اور ظفر نامہ کی غلطی کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اگر اورنگ زیب کا سال پیدائش ۱۰۲۸ ہجری تسلیم کیا جائے شاہجہاں کا چوتھا بیٹا امیر بخش ۱۱۔ محرم ۱۰۲۹ ہجری میں پیدا ہوا تھا۔ محرم کا مہینہ اسلامی مہینوں میں پہلا مہینہ ہے جس کے گیارہویں دن اورنگ زیب کے چوتھا بھائی (اس کا تیسرے سال انتقال ہو گیا تھا) کا پیدا ہونا ممکن نظر نہیں آتا کیونکہ ۱۵ ذیقعد سے ۱۱ محرم تک مشکل ے تین ماہ ہوتے ہیں اس کے تین ماہ کے اندر اندر دو بچوں کا پیدا ہونا کس طرح ممکن ہے ہاں دو بچے ایک ساتھ تو ہو سکتے ہیں مگر تین ماہ سے کم عرصہ میں دوسرا بچہ پیدا نہیں ہو سکتا۔

اس سلسلہ میں ممتاز محل کے بطن سے پیدا ہونے والی چودہ اولادوں (آٹھ لڑکے اور چھ لڑکیاں) کی ترتیب اور فہرست پچھلے صفحات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ فہرست انتہائی مستند ہے اس لیے اسے اردو اسلامی تاریخی ناولوں کے خالق علامہ عبدالحلیم شرر لکھنوی نے اپنی کتاب المحدرات میں درج کی ہے جسے کسی صورت رد نہیں کیا جا سکتا (المحدرات کی ایک کاپی راقم الحروف کی ذاتی لائبریری میں موجود ہے)۔

اب ہم آگے بڑھتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ اورنگ زیب کی تاریخ نہیں بلکہ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک تاریخی ناول ہے۔

شہزادہ خرم کا باپ کے حضور ایک ہزار اشرفی کی نذر گذارنا اور بادشاہ کا اس کی فرمائش پر نوزائیدہ بچہ کا نام رکھنا ان باتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کی پیدائش تک شہزادہ خرم اور اس کے باپ شہنشاہ جہانگیر میں کسی قسم کا اختلاف نہ تھا لیکن اورنگ زیب کی پیدائش کے صرف چار سال بعد ہی شہزادہ خرم اور جہانگیر میں ایسے شدید اختلافات پیدا ہوئے جس نے خرم کی زندگی اجیرن کر دی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ شہزادہ خرم کو باپ کی مخالفت اور سرکشی کی وجہ سے چار سال تک تلنگانہ' اڑیسہ' بنگال' جون پور اور دکن کے جنگلوں کی خاک چھاننا پڑی۔ شاہی فوجیں اس کے تعاقب میں رہیں اور خرم معہ اپنے اہل و عیال کے ایک جگہ سے دوسری جگہ جان بچاتا اور چھپتا پھرتا رہا۔ اس مصیبت اور شدید پریشانی کے زمانہ میں اس کی واحد رفیق اس کی محبوب بیوی ممتاز محل تھی۔ آخر جب شہزادہ خرم مصائب سے گھبرا گیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ممتاز محل نے شہزادے کو مشورہ دیا تھا کہ وہ بادشاہ سے معافی مانگ لے تاکہ اس کے ولی عہد ہونے کے امکانات روشن ہو جائیں۔

بہرحال صورت کچھ بھی پیش آتی ہو۔ آخر شہزادے نے معذرت کا رویہ اختیار کیا اور ایک قاصد کے ذریعہ شہنشاہ جہانگیر کے حضور اپنی معذرت کا اظہار کیا۔ جہانگیر بھی بیٹے' بہو اور پوتی پوتوں کو مزید سزا نہیں دینا چاہتا تھا اس لیے اس نے شہزادے خرم کو مشروط معافی دینے کا اعلان کیا۔ اس نے خرم کے قاصد کو جواب دیا۔

”خرم کو مطلع کیا جائے کہ مابدولت اسے صرف اس صورت میں معافی عطا کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں دارا اور اورنگ زیب کو بطور یرغمالی ہمارے دربار میں بھیج دے؟“

قاصد نے یہ شاہی حکم شہزادے خرم کو پہنچایا۔ میاں بیوی مختصر سی گفتگو ہوئی اور انہوں نے فوری طور پر اسی قاصد کے ساتھ شہزادے دارا اور اورنگ زیب کو شہنشاہ کے پاس روانہ کر دیا۔ جہانگیر کے پاس خرم کا ایک بیٹا شاہ شجاع پہلے ہی سے تھا۔ شجاع کو ملکہ نور جہاں نے اپنا متبنیٰ بنا لیا تھا۔ پس دو مزید بیٹوں کو اپنے سے جدا کرتے وقت ممتاز محل کے دل پر کیا گزری ہو گی اس کا نقشہ الفاظ میں کھینچنا مشکل ہے۔ ممتاز محل کی صرف اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جس وقت اس کے دونوں بیٹے لاہور روانہ ہوئے تو ممتاز محل ایک سو گز تک ان سواروں کے پیچھے پیدل بھاگتی رہی جو شہزادوں کو لے کر جا رہے تھے پھر شہزادہ خرم اسے سمجھا بجھا کر واپس لایا۔

شہنشاہ جہانگیر ان دنوں لاہور میں قیام پذیر تھا۔ دارا اور اورنگ زیب کو وہیں اس کے حضور پیش کیا گیا اورنگ زیب کی عمر اس وقت آٹھ سال کی تھی دارا اس سے تین سال بڑا تھا۔ ملکہ نور جہاں نے شجاع کے دونوں بھائیوں کو اسی محبت اور خلوص کے ساتھ قبول کیا جیسے اس نے شجاع کو قبول کیا تھا۔

شہزادے خرم کے یہ تینوں بیٹے دو سال تک ملکہ نور جہاں سے وابستہ رہے پھر جب جہانگیر کا انتقال ہوا اور شہزادہ خرم' شاہجہاں کے نام سے تخت سلطنت پر متمکن ہوا تو اس نے تینوں بیٹوں کو لاہور سے آگرہ واپس منگوایا۔ آصف خاں جو شاہجہاں کا خسر اور بچوں کا نانا تھا' شہزادوں کو ساتھ لے کر لاہور سے اکبر آباد (آگرہ) آیا تھا۔ بادشاہ نامہ کے مصنف عبدالحمید لاہوری نے شہزادوں کی واپسی کی بہت تفصیلی داستان بیان کی ہے۔

ممتا کی ماری ممتاز محل کی اس وقت کی خوشی کا عالم دیدنی تھا جب اس نے اپنے بچھڑے ہوئے تین بیٹوں کو اپنے سامنے پایا۔ اس کی چمکیلی آنکھوں سے مسرت کے آنسو ٹپک رہے تھے' ہونٹ لرز رہے تھے اور وہ ایک ایک بیٹے کو باری باری سینے سے لگاتی اور چومتی تھی۔ شہنشاہ شاہجہاں جھروکہ میں بیٹھا ملاپ کا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس زمانہ مغل شہنشاہ محل کے جھروکے میں بیٹھ کے رعیت کو اپنا دیدار کراتے تھے۔ اس میں شہنشاہ کی عظمت کے علاوہ اس کی حفاظت کا بھی ایک پہلو پایا جاتا تھا۔

جس وقت بچوں نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے جھروکے کے سامنے شہنشاہ کو نذریں پیش کیں تو شاہجہاں شفقت پدری سے اس قدر بے چین ہوا کہ جھروکہ سے اٹھ کر

شہزادوں کے پاس آگیا اور ایک ایک کو سینے سے بھینچ بھینچ کے خوب پیار کیا۔ واضح رہے کہ اورنگ زیب کی عمر اس وقت دس سال تھی۔ جب شہزادہ خرم کی تاجپوشی ہوئی اور اس نے شہنشاہ شاہجہاں کا لقب اختیار کیا تو اس نے امرا اور شہزادوں میں انعام تقسیم کئے اور ان کے مشاہرے مقرر کئے۔

اورنگ زیب کو انعام میں ایک لاکھ روپے نقد اور پانچ سو روپے روزانہ خرچ مقرر ہوا۔

اورنگ زیب کے استاد

اورنگ زیب آٹھ سال کی عمر تک تو باپ کے ساتھ دشت و بیاباں میں بھٹکتے رہے ان حالات میں کسی باقاعدہ تعلیم کا تو انتظام ہو ہی نہیں سکتا تھا مگر یہ بھی نہیں ہوا کہ اورنگ اور اس کے بھائی تعلیم سے بالکل نابلد رہے ہوں۔ خرم آخر شہزادہ تھا اور اس کے بادشاہ ہونے کے بڑے روشن امکانات تھے اس لیے بغاوت کے دنوں میں بھی اس کے ساتھ شمشیر زنوں کے علاوہ علماء' و فضلا بھی رہتے تھے چنانچہ خرم کے بیٹے ان سے درس لیا کرتے تھے پھر جب اورنگ زیب اور دارا' بادشاہ کے حضور یرغمال کے طور پر پہنچے اور ملکہ نور جہاں کے دامن سے وابستہ ہوئے تو ان کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام کیا گیا پھر جب دو سال بعد شہزادے خرم کو ہند کا تاج حاصل ہوا اور شہزادے آگرہ کے دربار میں شہزادگی کے اصل روپ میں پہنچے تو انہیں کسی قسم کی کمی محسوس نہ ہوئی اور ان کی تعلیم کے لیے اس وقت بہترین استادوں کا انتخاب کیا گیا۔

ابھی چند سال پہلے میرے ہاتھ ایک نسخہ "علماء قدیم ہندوستان" آیا تھا۔ اس سے میں نے ملاجیون کا نام دیکھا تھا جن کے بارے میں لکھا گیا تھا کہ وہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے استاد تھے۔ مجھے ملاجیون کے نام سے اس لیے دلچسپی پیدا ہوئی تھی کہ وہ میرے سابق ضلع لکھنؤ قصبہ کس منڈی سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے خاندان کے ایک فرد حاجی منصور احمد صدیقی میرے احباب خاص میں سے اس وقت خیاب بلاک اقبال ٹاؤن لاہور میں مقیم ہیں۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ اب سنئے ان بزرگوں اور قابل احترام ہستیوں کے نام جنہیں ہمارے ناول کے ہیرو حضرت اورنگ زیب عالمگیر کے استاد ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ اورنگ زیب کو پڑھانے والے بزرگ علماء میں سعد اللہ خاں' ملا صالح' محمد ہاشم گیلانی' مولوی عبداللطیف سلان پوری' ملا محی الدین' سید محمد قنوجی اور ملا جیون بہت ممتاز تھے ان کے علاوہ شیخ عبدالقوی کو بھی اورنگ زیب کو تعلیم دینے کا فخر حاصل ہوا تھا۔

"میر محمد ہاشم کے بارے میں پادشاہ نامہ کے مصنف عبدالحمید کہتے ہیں۔

"میر صاحب اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے وہ بارہ سال تک حرمین شریفین میں مقیم رہے تھے اور وہاں کے بڑے بڑے اساتذہ سے علم تفسیر اور علم حدیث حاصل کیا تھا۔ علم طب میں بھی وہ مہارت رکھتے تھے جس وقت ہندوستان واپس آئے اور شاہجہاں کی خدمت میں حاضری دی تو بادشاہ بہت خوش ہوا اور انہیں صدارت اور طبابت کے عہدۂ جلیلہ پر فائز فرمایا۔ پھر اورنگ زیب کی تعلیم و تربیت ان کے کاندھوں پر ڈال دی"۔

عام طور سے مشہور ہے کہ اورنگ زیب اپنے استادوں میں سب سے زیادہ انہی میر محمد ہاشم سے متاثر تھا اور اس کی طبیعت میں مذہب سے رغبت اور نیکی کی خوبی میر صاحب کے فیض طبیعت کی وجہ سے تھا تفسیر و فقہ میں اورنگ زیب نے جو اہلیت پیدا کی تھی وہ بھی میر صاحب ہی کا فیض تھا۔ انہوں نے تفسیر بیضاوی پر ایک بہت عمدہ حاشیہ لکھا تھا۔ میر محمد ہاشم ہی اورنگ زیب کے وہ استاد تھے جو مدت العمر تک اورنگ زیب کی ملازمت میں رہے تھے۔

ماثر لامرا کے بیان کے مطابق اورنگ زیب عالمگیر کے مطالعہ میں تصانیف حجتہ الاسلام محمد غزالی' مکتوبات شیخ شرف یحیی و شیخ زین الدین و قطب شیرازی محی وغیرہ رہتی تھیں۔ اورنگ زیب نے ایام شاہزادگی میں قرآن حکیم کے کچھ پارے حفظ کر لئے تھے پھر جب وہ شہنشاہ ہوا تو اس نے پورا قرآن حفظ کر لیا تھا۔ اورنگ زیب کو خط نسخ میں ملکہ حاصل تھا۔ اس نے یہ فن بچپن ہی میں سیکھا اور اس نے ایک بہت خوبصورت قرآن کی کتابت کی تھی پھر اسے سات ہزار روپے کے خرچ سے مزین کرا کر مدینہ منورہ بھجوایا تھا۔

اس کا یہ کارنامہ بحیثیت شہنشاہ ہند واقع ہوا تھا۔

مختصر یہ کہ اورنگ زیب عالمگیر کو خط نسخ، خط نستعلیق و شکستہ میں حد درجہ مہارت حاصل تھی۔ اورنگ زیب عالمگیر کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کلام پاک کے بارے پاکستان کی ایک لائبریری میں محفوظ ہیں۔ انہیں دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ وہ جتنا عظیم شہنشاہ تھا اتنا ہی بڑا خطاط بھی تھا اور اس کے خط میں عمر کے ساتھ ساتھ پختگی پیدا ہوتی گئی تھی۔

شہنشاہ عالمگیر کو فارسی نظم و نثر پر پوری قدرت حاصل تھی اس کے وہ خطوط جو اس نے بادشاہ ہونے کے بعد اپنی اولاد اور امرائے سلطنت وغیرہ کو لکھے تھے وہ اس فارسی زبان کی اہلیت کا کھلا ہوا ثبوت ہیں۔ اس نے اپنی تحریروں میں جا بجا فارسی اشعار یا ان کے مضمون کے اعتبار سے مصرعے لکھے ہیں جو جڑاؤ نگینے کی طرح اس کی تحریر کو نمایاں کرتے ہیں۔

فن سپہ گری میں بھی اورنگ زیب نے اپنے بھائیوں کی طرح کمال حاصل کیا تھا صرف چودہ سال کی عمر میں ہاتھیوں کی لڑائی کے دوران اس نے جس جرات اور استقامت کا ثبوت دیا وہ اس کی سپاہیانہ صلاحیتوں کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ یہ اس کی جرات اور شجاعت تھی جس نے شاہجہاں کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اورنگ زیب کو اس بہادری کے صلہ میں بیش بہا انعام و اکرام سے نوازے۔ چنانچہ ایک روایت کے مطابق شہنشاہ نے شہزادے کو سینہ سے لگانے کے بعد ایک خلعت فاخرہ پہنائی۔ گراں بہا لعل د زمرد کے ٹکڑوں سے مزین تسبیح مروارید عطا کی۔ نیز ایک کرہ الماس سے مرصع، ایک بازو بند مرصع اور الماس، لعل و یاقوت مروارید نگینوں والی انگوٹھیاں، خنجر مرصع باسپول کٹارہ، شمشیر مرصع، سپر مرصع با یراق مرصع و برچھی مرصع وغیرہ تحفہ کے طور پر عطا کئے تھے۔ اس کے علاوہ دو اسپ قپچاق بھی عنائت فرمائے جن میں سے ایک کی آہن طلائی تھی اور اورنگ زیب کو وہ ہاتھی جس کا نام سدھاکر تھا اور جس پر اونگ زیب نے حملہ کیا تھا، وہ بھی بخش دیا گیا تھا۔

شہزادہ اورنگ زیب کی عمر اس واقعہ کے وقت پندرہ سال سے صرف تین دن کم تھی مگر اس واقعہ نے اسے لوگوں اور شہنشاہ کی نظر میں بچہ کے بجائے ایک جوان رہنما کی طرح سمایا تھا۔ شاہجہان نے اورنگ کو اپنے ساتھ رکھنا شروع کر دیا تھا۔ اسطرح کشمیر کے سفر میں دوسرے شہزادے اور شہزادیوں کے ساتھ اورنگ زیب کو شہنشاہ نے خاص طور پر اپنے

ساتھ رکھا تھا۔ ایک روایت کے مطابق اس سفر کے دوران اچھابلی کے قریب اورنگ زیب کو جاگیر کے طور پر "لوکھ بھون" نام کی ایک مشہور بستی عطا کی تھی جہاں اورنگ زیب نے کئی عمارتیں تعمیر کرائی تھیں۔

شہنشاہ شاہجہاں نے ماہ رجب کی تین مطابق ۱۰۴۴ ہجری کو اورنگ زیب کے بالغ ہونے کا رسمی اعلان کیا تھا۔ اس موقعہ پر شہنشاہ نے اورنگ زیب کو دس ہزاری منصب کے ساتھ چار ہزار سوار اپنی رکاب میں رکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ ساتھ علم و نقارہ بھی عطا ہوا تھا اور اعلان ہوا تھا کہ دوسرے شہزادوں کی طرح اورنگ زیب کے لیے بھی سرخ خیمہ نصب کیا جایا کرے۔

شہنشاہ کے ان نوازشات سے اورنگ زیب کس قدر خوش ہوا ہو گا اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اس نے اگرچہ کوئی بڑا معرکہ سر نہ کیا تھا مگر اہل دربار کو یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ اب اورنگ زیب میں اس قدر شجاعت اور اہلیت پیدا ہو گئی ہے کہ اسے بڑی سے بڑی ذمہ داری سونپی جا سکتی ہے۔

سپہ گری کا پہلا مظاہرہ

برصغیر کی اسلامی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے قارئین نے اورنگ زیب کے دادا شہنشاہ جہانگیر کے سلسلہ میں یہ واقعہ ضرور پڑھا ہو گا کہ جس وقت جہانگیر صرف شہزادہ سلیم تھا تو اس نے اپنے باپ یعنی شہنشاہ اکبر کے ایک مشہور و معروف نورتن ابو الفضل کو قتل کرا دیا تھا۔

یہ وہ وقت تھا جب اکبر و جہانگیر یعنی باپ بیٹے میں سخت اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ جہانگیر یعنی شہزادہ سلیم کو اپنے باپ سے جو شکایات تھی وہ کافی حد تک درست تھیں۔ اسے اکبر سے شکوہ تھا کہ اسے چند درباریوں کے کہنے پر نا اہل اور حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے ناقابل سمجھا گیا۔ ان درباریوں میں راجہ مان سنگھ اور ابو الفضل پیش تھے۔ چنانچہ جب شہزادہ سلیم نے اکبر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو اکبر نے ابو الفضل کو دکن سے طلب کیا اور حکم دیا کہ وہ شہزادہ سلیم کے پاس جا کر اسے سمجھائے اور راہ راست پر

لائے۔ ابو الفضل کو دکن سے ایک پیغامبر کے ذریعہ بلوایا گیا تھا۔

اس بلاوے کے جواب میں ابو الفضل نے بادشاہ کو اسی قاصد کے ذریعہ جواب بھجوایا تھا جس میں اکبر کو یقین دلایا گیا تھا کہ وہ شہزادہ سلیم کو ہر حال میں دربار میں پیش کرے گا باغی شہزادہ سلیم اس وقت الہ آباد میں تھا۔ شہزادے کے جاسوس اور حواری اکبری دربار میں موجود تھے انہوں نے فوراً شہزادے کو اطلاع بھجوائی کہ ابو الفضل کو دکن سے بلوایا گیا کہ اکبر اسے نئی ہدایات دے کر آپ کے (شہزادے) پاس بھیجیں نیز یہ کہ ابو الفضل نے اکبر کو یقین دلایا ہے کہ وہ شہزادے کو ہر صورت میں شہنشاہ کے سامنے پیش کرے گا۔

یہ سن کر شہزادے سلیم کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے فوراً بندیل کھنڈ کے بندیلہ سردار راجہ بیر سنگھ جو شہزادے کا حلیف تھا، حکم بھیجا کہ ابوالفضل دکن سے آ رہا ہے جب وہ اس کے علاقہ یعنی بندیل کھنڈ (وسط ہند کا پہاڑی علاقہ) سے گزرے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ راجہ بیر سنگھ نے ابو الفضل کو راستہ میں قتل کر کے اس کا سر شہزادے سلیم کے پاس بھیج دیا۔

اس تاریخی تمہید کا مقصد یہ ہے کہ شہزادہ اورنگ زیب کو جس خطرناک اور باغی دشمن کے خلاف اپنی زندگی کا پہلا معرکہ سر کرنے کے لیے شاہجہان نے منتخب کیا وہ باغی اس خطرناک بندیلہ سردار بیر سنگھ کا بیٹا جھجر سنگھ تھا۔ شاہجہاں کی تخت نشینی کے کچھ دن بعد بندیلہ قبیلہ نے بغاوت کر کے جنوب جانے والے تمام راستوں کو خطرناک بنا دیا تھا۔

اس کا آغاز اسطرح ہوا تھا کہ بیر سنگھ کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا جھجر سنگھ بندیل کھنڈ کے راج سنگھاسن پر بیٹھا تھا۔ یہ پہاڑی علاقہ اپنے دشوار گزار جنگلات اور بے ہنگم پھیلی ہوئی پہاڑی گھاٹیوں کی وجہ سے ناقابل عبور سمجھا جاتا تھا خاص کر برسات کے موسم میں تو اس جنگلی علاقہ سے گزرنا اپنی موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔

جھجر سنگھ کے تعلقات شاہجہاں سے شروع میں نہایت خوشگوار تھے۔ جھجر سنگھ نے ریاست کے امور اپنے بیٹے بکرماجیت کے سپرد کر دئے تھے اور خود شہنشاہ شاہجہاں کے دربار میں رہتا تھا۔ انہی دنوں شاہجہاں کو بندیل کھنڈ میں بدعنوانیوں کی شکایات موصول ہوئیں۔ شاہجہاں نے جھجر سنگھ سے اس کی باز پرس کی۔

جھجر سنگھ چونکہ بندیل کھنڈ سے دور تھا اور اسے وہاں کے صحیح حالات کا علم نہ تھا اس لیے اسے گمان ہوا کہ شاید دربار میں اس کے دشمنوں نے اس کا وقار گرانے کے لیے شاہجہاں سے جھوٹی شکایات کی ہیں۔ چنانچہ پہلے تو جھجر سنگھ نے شہنشاہ کو کوئی جواب نہ دیا مگر جب شہنشاہ کو پھر بندیل کھنڈ میں سنگین قسم کی بدعنوانیوں کی خبر پہنچی تو اس نے جھجر سنگھ کو آڑے ہاتھوں لیا۔

"راجہ جھجر سنگھ۔ تمہیں اور تمہارے بیٹے کو کیا ہوا ہے۔ ہمیں پہلے بھی اس کی بدعنوانی کی اطلاع ملی تھی اور ہم نے تمہیں بتایا بھی تھا مگر تم نے اس کا کوئی تدارک نہیں کیا؟"

راجہ جھجر سنگھ کو یہ زعم تھا کہ شہنشاہ شاہجہاں کی نظروں میں اس کا وقار اس قدر بلند ہے کہ وہ اس سے آنکھ ملا کر بات کر سکتا ہے۔ اس لیے اس نے قدرے سختی سے جواب دیا۔

"ان داتا۔ میرے بیٹے کی جھوٹی شکائتیں کی جا رہی ہیں۔ یہ میرے دشمنوں کی کارستانی ہے۔ میں ان داتا سے درخواست کرتا ہوں کہ ان غلط اطلاعات پر کوئی توجہ نہ دی جائے"۔

شاہجہاں نرم مزاج کا بادشاہ تھا مگر نہ معلوم اسے جھجر سنگھ کا یہ جواب اس قدر ناگوار کیوں گزرا کہ وہ اس پر برس پڑا۔

"راجہ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہمارے مخبر اور جاسوس تمام کے تمام جھوٹے ہیں اور تم جو وہاں سے اس قدر دور بیٹھے ہو، صرف تم سچے ہو۔ تم نے یہ کہنے کی جرات کیسے کی کہ یہ اطلاعات غلط ہیں اور ہم ان پر توجہ نہ دیں"۔

"ان داتا-----" جھجر سنگھ گھبرا گیا۔ "میں سلطنت کا سیوک (خدمتگار) ہوں میرا مطلب تھا-----"۔

"کچھ نہیں۔ ہم تمہاری کوئی بات نہیں سننا چاہتے"۔ شاہجہاں نے اسے درمیان ہی میں ٹوک دیا۔ اب اگر تمہارے بیٹے کی طرف سے کسی قسم کی بھی بدعنوانی کی خبر ملی تو ہم شاہی لشکر کو بندیل کھنڈ میں کارروائی کی اجازت دیں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ جنوب کو جانے والا راستہ تمہارے علاقہ سے گزرتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمہارا بیٹا اس راستہ کو

بند کر دے اور آنے جانے والوں کو پریشان کرے۔۔۔۔"

"ان داتا۔ میرا مطلب یہ تھا۔۔۔۔۔"۔

"کچھ نہیں ۔ خاموش رہو۔۔۔۔" شاہجہاں کو جلال آگیا تھا۔ اس نے جھجر سنگھ کو صفائی کا موقعہ نہیں دیا۔

جھجر سنگھ کو چاہیے تھا کہ وہ دربار کے با اثر سرداروں کے ذریعہ سفارش کراتا اور معاملہ کو دبانے کی کوشش کرتا۔ اس لیے کہ بندیل کھنڈ میں اس کے لڑکے نے کچھ نہ کچھ تو ضرور کیا ہو گا جس کی اطلاعات شاہجہاں کو مخبروں اور پرچہ نویسوں کے ذریعہ ملی تھیں۔ مگر اس اندھے دماغ نے صلح صفائی کے بجائے دوسرا ہی راستہ اختیار کیا۔ جھجر سنگھ دربار سے خاموشی سے اٹھ کے آگیا اور اسی رات شاہجہاں کو اطلاع دیئے بغیر اور اجازت لئے بغیر آگرہ سے بندیل کھنڈ روانہ ہوگیا۔

صبح ہی کو یہ بات پھیل گئی کہ راجہ جھجر سنگھ دارالسلطنت سے بھاگ گیا ہے۔ جب دربار میں جھجر سنگ نہیں پہنچا تو درباریوں کو فکر ہوئی۔ خود شہنشاہ شاہجہاں نے اس کے بارے میں دریافت کیا۔

"آج راجہ نظر نہیں آتا۔ خیر تو ہے؟"

ایک امیر نے دست بستہ عرض کیا۔

"شہر میں یہ افواہ گرم ہے کہ راجہ جھجر سنگھ آگرہ چھوڑ کر بھاگ گیا ہے"۔

شاہجہاں کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ اس نے حکم دیا۔

"شہر کوتوال کو حاضر کیا جائے"۔

کچھ ہی دیر بعد شہر کوتوال ہانپتا کانپتا حضور شاہ میں حاضر ہوا۔

حاجب نے عرض کیا۔

"ظل اللہ ۔ شہر کوتوال حاضر ہے"۔

یہ کہتے ہوئے حاجب نے کوتوال کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ شہر کوتوال دو قدم آگے بڑھ کر دست بستہ کھڑا ہوا۔

شاہجہاں نے نظریں اٹھا کر کوتوال کو دیکھا اور دریافت کیا۔

"گزشتہ رات بندیل سردار راجہ جھجر سنگھ شہر سے بھاگ گیا اور تمہیں اس کی خبر

تک نہیں ہوئی؟"

"عالی جاہ۔ رات گشت کے دوران راجہ سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ کچھ پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ میرے دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ اس کا بیٹا بکماجیت بہت سخت بیمار ہے۔ اسی وقت اطلاع آئی ہے اور وہ دیکھنے کے لیے فوراً" چل پڑا ہے"۔

"تم نے اس سے دریافت کیا تھا کہ آیا اس نے دربار سے اجازت حاصل کر لی ہے؟"

شاہجہان نے ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔

شہر کوتوال کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ گھگیا کے بولا۔

"عالی جاہ۔ غلام سے غلطی ہو گئی۔ میں راجہ کے منصب سے دھوکہ کھا گیا۔ غلام کو معاف فرمایا جائے۔ آئندہ ایسی غلطی نہ ہو گی"۔

شاہجہان نے نرم لہجے میں کہا۔

"خوئے بدرا بہانہ بسیار"۔ (فریبی بہت سے بہانے جانتے ہیں)۔ آئندہ احتیاط کی جائے۔ تمہیں تو اپنے سائیہ سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ تم جا سکتے ہو"۔

کوتوال سلام کر کے دربار سے رخصت ہوا۔ اسے واقعی راجہ جھجر سنگھ فریب دے گیا تھا۔ حالانکہ شہر کوتوال کے فرائض میں یہ بات داخل تھی کہ وہ ہر امیر اور درباری کی نقل و حرکت پر نظر رکھے خاص کر ان لوگوں پر جو دارالسلطنت میں بطور یرغمالی کے رہتے تھے۔ مغل شہنشاہوں کا یہ طریقہ تھا کہ وہ خود سر اور فتنہ پرور والیان ریاست کی اطاعت کی ضمانت طلب کرتے تھے اور یہ ضمانت ریاست کے والی یا اس کے بیٹے کی صورت میں دی جاتی تھی۔ دو میں سے ایک کو حکم دیا جاتا تھا کہ وہ دربار میں (دارالسلطنت) حاضر رہیں۔

جھجر سنگھ اور اس کا باپ بیر سنگھ دونوں ہی مشکوک حکمراں تھے۔ بیر سنگھ کے زمانہ میں جھجر سنگھ ریاست سنبھالتا تھا اور بیر سنگھ شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں بطور یرغمالی کے رہا کرتا تھا۔ پھر جب بیر سنگھ مر گیا تو اس کی جگہ جھجر سنگھ دربار میں اور اس کا بیٹا بکما' جیت ریاست میں رہتا تھا۔

جھجر سنگھ کا دارالسلطنت سے فرار کا واقعہ شاہجہاں کی تخت نشینی کے فوراً" بعد پیش آیا تھا۔ شاہجہاں نے اسے بڑی سختی سے محسوس کیا اور ایک بڑا لشکر فوراً" جھجر سنگھ کی

سرکوبی پر مامور کیا۔ لشکر کو حکم تھا کہ وہ بندیلہ ریاست گھستا چلا جائے اور اس وقت تک قدم نہ روکے جب تک ججھر سنگھ اطاعت کی درخواست نہ کرے۔

ادھر لشکر تیار ہو کر بندیل کھنڈ روانہ ہوا ادھر ججھر سنگھ نے اپنے علاقہ میں پہنچ کے پھر لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ علاقہ گڈھ کا ایک زمیندار بھیم نرائن سب سے پہلے اس کی بربریت کا شکار ہوا۔ ججھر سنگھ نے اسے دھوکہ سے بلوایا اور اسے اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر کے گوٹھ کے قلعہ اور خزانہ پر قبضہ کر لیا۔ ججھر سنگھ کو گڑھ کے خزانہ سے دس لاکھ کی رقم حاصل ہوئی۔

بھیم نرائن کا ایک بیٹا شاہی دربار میں رہتا تھا۔ اسے اپنے باپ کے مارے جانے اور علاقہ کے برباد ہونے کی خبر ملی تو شاہجہاں کے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو گیا۔

"ان داتا۔ انصاف ۔ انصاف۔ ججھر سنگھ نے میرے باپ بھائیوں کو قتل کر کے قلعہ اور خزانہ پر قبضہ جما لیا ہے۔ ان داتا۔۔۔۔"

شاہجہاں کی آنکھیں غصہ سے سرخ ہو گئیں۔

"اس بدبخت کی یہ جرات"۔ شہنشاہ نے کہا۔ پھر اسی وقت ایک فرمان لکھا کر اس لشکر کی طرف روانہ کیا جسے وہ ججھر سنگھ کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا تھا۔

اس فرمان میں درج تھا کہ ججھر سنگھ نے علاقہ گڑھ کے حاکم بھیم نرائن کو قتل کر کے اس کے قلعہ اسد خزانہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ ججھر پر قابو حاصل کرتے ہی گڑھ کا قلعہ اور خزانہ بھیم نرائن کے عزیزوں کو واپس دلایا جائے اور ججھر سنگھ کو آخری بار اپنی بیہودگیوں سے توبہ کا حکم دیا جائے۔

فرمان لے جانے والا قاصد راستہ بھٹک کر شاہی لشکر کے بجائے ججھر سنگھ کے ہاتھ پڑ گیا۔ ججھر سنگھ نے فرمان لے کر پڑھا پھر پھاڑ کے قاصد کے ہاتھ میں دھر دیا۔

"واپس جا اور یہ پھٹا ہوا فرمان اپنے شہنشاہ کو پہنچا دے"۔

یہ کہہ کے ججھر سنگھ نے قاصد کو واپس بھیج دیا بد ذات ججھر سنگھ کے دماغ میں فتور تھا اس لیے اس نے اپنے بیٹے بکرماجیت کو بھی اپنے پاس بلوا لیا۔ ایک بیان کے مطابق ججھر سنگھ اور شاہی لشکر میں ایک جھڑپ بھی ہوئی تھی جس میں طرفین کے بہت سے آدمی کام آئے تھے۔ راجہ ججھر کا بیٹا بکرماجیت بھی اس لڑائی میں کافی زخمی ہوا تھا۔

شہنشاہ شاہجہاں نے یہ محسوس کرتے ہوئے ججھر سنگھ روز بروز خطرناک ہوتا چلا جا رہا ہے اس لیے اس کے خاتمہ کے لیے ایک معقول لشکر بھیجنا چاہیے۔ چنانچہ اس نے بیس ہزار نبرد آزما سواروں پر مشتمل ایک لشکر جرار تیار کرایا اور اس عظیم لشکر کی سرداری پر چار تجربہ کار سالار مقرر کئے جن کے نام عبداللہ خاں بہادر، فیروز جنگ، سید خان جہاں اور خان دوراں۔

جب یہ لشکر سیلاب کی طرح لہراتا ججھر کی سرحد کے قریب پہنچا تو ججھر سنگھ حواس باختہ ہو گیا اور اس نے تلافی مافات کی کوشش شروع کر دی۔ ایک طرف تو اس نے شاہی لشکر میں پیغام بھیجا کہ وہ جہاں ہیں وہی رک جائے اس لیے کہ اس نے اپنا وکیل دربار شاہی میں گفتگو کے لیے بھیج دیا۔ دربار سے حکم آنے کے بعد اگر جنگ کی ضرورت پڑی تو جنگ ہو گی ورنہ جو شہنشاہ کا حکم ہو گا اس پر عمل کیا جائے گا۔

راجہ ججھر کی اس درخواست پر لشکر جہاں تک پہنچا تھا وہیں رک کے دربار کے حکم کا انتظار کرنے لگا۔ راجہ نے دربار شاہی میں جو وکیل بھیجا تھا وہ وہاں پہنچا اور اس نے آصف خاں جو شاہجہاں کا خسر اور ملکہ ممتاز محل کا باپ تھا کے توسط سے دربار شاہی میں راجہ ججھر کی طرف سے معافی کی درخواست پیش کی۔ شاہجہاں کو غصہ تو بہت تھا لیکن درخواست کے ساتھ آصف خاں کی سفارش بھی تھی۔ چنانچہ اس نے ایک ذیلی فرمان جاری کیا۔ جس میں مندرجہ ذیل تین شرطیں قابل ذکر تھیں۔

۱۔ ججھر سنگھ تیس لاکھ روپے بطور ہرجانہ شاہی خزانہ میں داخل کرے۔

۲۔ ججھر سنگھ اپنے بیٹے بکرما جیت کو یرغمالی کے طور پر دربار شاہی میں رکھنے کا اقرار کرے۔

۳۔ خود ججھر سنگھ دکن جا کر خان زماں کے پاس قیام کرے۔

فتنہ خو اور فتنہ پرور راجہ ججھر سنگھ بھلا یہ شرائط کیوں قبول کرتا۔ اس نے بادشاہ کو جواب بھجوانے کے بجائے جنگی تیاریاں شروع کر دیں اور اسلحہ اور سواروں کے ڈھیر لگائے۔

جب شاہجہاں کو راجہ کی طرف سے جواب موصول نہ ہوا بلکہ یہ معلوم ہوا کہ اس نے جنگی تیاریاں شروع کر دی ہیں اور بے شمار فوجیں اور اسلحہ اکٹھا کر لیا ہے تو اس نے

فوری طور پر اپنے چاروں سپہ سالار کو ایک مختصر فرمان جاری کیا۔

"تمام سپہ سالاروں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اس وقت جہاں کہیں موجود ہیں وہیں رک جائیں"۔

اس فوری اور مختصر فرمان کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ جو چار سردار' راجہ ججھر سنگھ کی سرکوبی کے لیے بندیل کھنڈ بھیجے گئے تھے وہ تمام کے تمام سپہ سالار تھے اور سب کے سب ہم منصب اور ہم مرتبہ تھا۔ شاہجہاں کے عقل رسا نے اسے سمجھایا کہ ایک لشکر کے چار ہم پلہ سپہ سالار کسی وقت' کسی بات پر الجھ بھی سکتے ہیں اور ان کا اختلاف شاہی لشکر کی کمزوری اور شکست کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ ان سپہ سالاروں پر ایک ایسا سپہ سالار اعظم مقرر ہونا چاہیے جو ان سب کو اپنے قابو رکھ سکے۔

صاف ظاہر تھا کہ ان سپہ سالاروں کا سپہ سالار اعظم یا تو خود شاہجہاں ہو سکتا تھا یا پھر یہ اعزاز کسی شہزادے کو دیا جا سکتا تھا۔ شہزادوں میں شاہجہاں کا سب سے بڑا بیٹا دارا شکوہ تھا۔ یہ بات سب کو معلوم تھی لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ شاہجہاں نے سپہ سالار اعظم کے لیے محی الدین اورنگ زیب کا انتخاب کیا۔ اورنگ زیب کے انتخاب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ کو اگرچہ دارا سے بے پناہ محبت تھی اگر وہ سپہ گری اور سپہ سالاروں کے لیے دارا کے مقابلہ میں اورنگ زیب کو ترجیح دیتا تھا۔

اس سلسلہ میں کسی امیر کے دریافت کرنے پر شاہجہاں نے اپنے چاروں بیٹوں پر بڑا ایماندارانہ تبصرہ کیا تھا۔ چنانچہ احکام عالمگیری کے مصنف نے بادشاہ کے تبصرے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> اعلیٰ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں بعض اوقات خیال آتا ہے کہ دارا شکوہ نیک لوگوں کا دشمن واقع ہوا ہے۔ مراد بخش کو مے نوشی سے فرصت نہیں اور محمد شجاع میں سیر چشمی کے سوا اور کوئی صفت نہیں۔ مگر اورنگ زیب کے عزم و شعور کا تقاضہ ہے کہ وہ سلطنت کے اس بارگراں کو اٹھائے گا لیکن اس کی فطرت میں زبردست خامیاں بھی ہیں۔

تا دوست کرا باشد میلش بکہ باشد

(ترجمہ) وہ دوست کس کا ہو گا اور اس کا رجحان اس طرف ہو گا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ شاہجہاں کو دارا سے بہت محبت تھی لیکن سلطنت کے بارگراں کو اٹھانے کا اہل وہ صرف اورنگ زیب ہی کو سمجھتا تھا اور شاید یہی وجہ تھی اس نے اورنگ زیب کو سپہ سالار اعظم کے عہدے کے لیے منتخب کیا۔

شاہجہاں نے اپنے چاروں سپہ سالاروں کو اپنے اپنے مقام پر ٹھہرنے کا فرمان جاری کرنے اور قاصدوں کو فرمان کے ساتھ ان کی طرف دوڑانے کے بعد حکم دیا۔

"اورنگ زیب کو فوراً" پیش کیا جائے"۔

حاجب اورنگ زیب کو بلانے کے لیے بھاگا۔ حاجب کی مڈ بھیڑ اچانک شہزادہ دارا شکوہ سے ہو گئی۔ دارا نے اسے گھبرایا ہوا دیکھا تو پوچھا۔

"خیریت تو ہے۔ اس قدر پریشانی کی کیا وجہ ہے؟"

حاجب نے پھولی سانس کے درمیان جواب دیا۔

"عالی جاہ نے شہزادے اورنگ زیب کو فوراً" طلب کیا ہے"۔

"بابا حضور کا مزاج کیسا ہے۔ مسکراہٹ ہے کہ غصہ؟" دارا نے دوسرا سوال کر دیا۔

"غصہ---" اور حاجب جان چھڑا کر پھر بھاگ پڑا۔ شہزادہ دارا مسکراتا ہوا ایک طرف نکل گیا۔

حاجب' اورنگ زیب کو ڈھونڈتا ایک محل سے دوسرے محل میں پہنچا تھا کہ اس کے سامنے شہزادہ مراد بخش آ گیا۔ مراد بلا کا شرابی تھا۔ اس نے حاجب کا ہاتھ پکڑ لیا اور مستی کے عالم میں بولا۔

"کہاں بھاگے جا رہے ہو؟"

"شہزادے اورنگ زیب کو تلاش کر رہا ہوں"۔ حاجب نے مختصر سا جواب دے کر ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

مراد بخش نے اس کا ہاتھ تو چھوڑ دیا مگر ہنس کے کہا۔

"میں سمجھ گیا تم اس سے کوئی حدیث پوچھنے جا رہے ہو"۔

اور حاجب سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

کچھ ہی دیر بعد شہزادہ اورنگ زیب اور حاجب بادشاہ کے حضور دربار میں کھڑے

تھے۔ حاجب کے اورنگ زیب کو شاہی کتب خانہ میں جا پکڑا تھا جہاں وہ کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھا۔

"اورنگ زیب" شاہجہاں نے پورے شاہانہ جلال سے کہا۔

"حکم فرمائیے شاہ بابا۔ اورنگ زیب نے بڑی متانت سے جواب دیا۔

"ہم تمہیں دکن بھیج رہے ہیں؟"

"بہتر ہے شاہ بابا۔۔۔۔"۔

"تمہیں آج ہی روانہ ہونا ہے اورنگ زیب؟"

"میں اس وقت بھی تیار ہوں شاہ بابا"۔

شہنشاہ شاہجہاں نے حیران نظروں سے اورنگ زیب کو دیکھا۔

"تم نے یہ نہیں پوچھا کہ ہم تمہیں کیوں بھیج رہے ہیں؟"

"شاہ بابا"۔ اورنگ زیب نے بڑے استقلال سے کہا۔ "میں شاہ کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔ یہ کام شاہ بابا کے سوچنے کا ہے کہ میں کس کام کا اہل ہوں"۔

"تم نے ٹھیک کہا اورنگ زیب شاہ جہاں بڑی حیرت سے بولا۔ "ہم نے تمہیں سپہ سالاری کا اہل سمجھا اور دکن بھیجے گئے لشکر کا سالار اعظم مقرر کیا ہے"۔

اس انکشاف پر اورنگ زیب کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ مگر اس نے فوراً" خود پر قابو پا لیا اور سنبھل کر کہا۔

"خادم شہنشاہ کی اس کرم نوازی کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ پر میں پوری کوشش کروں گا کہ خود کو اس کے اہل ثابت کر سکوں"۔

"اچھا۔ اب تم جاؤ اور تیاری کرو"۔

شہزادہ سلام کر کے واپس ہوا۔ خوشی کے مارے وہ پھولے نہ سما رہا تھا۔ اتنا بڑا اعزاز تو اس کے تصور سے بھی پرے تھا مگر اسے اس بات پر ضرور تعجب تھا کہ شاہجہاں نے سپہ سالار اعظم کے لیے دارا کا انتخاب کیوں نہ کیا۔

اس سلسلہ میں ایک شبہ یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ شاہجہاں نے یہ حکم شہزادہ دارا کی تحریک اور ضد پر اٹھایا تھا۔ شہزادے اورنگ زیب کے اس تقرر سے پہلے دکن کی صوبیداری پر نامزدگی ہو چکی تھی۔ اس وقت بھی یہی شبہ ظاہر کیا گیا تھا اور بعض درباری

برملا کہتے تھے شہزادہ دارا نے اپنے لیے پنجاب کی گورنری پسند کی ہے اور اورنگ زیب کو دکن کا گورنر نامزد کر دیا ہے تاکہ وہ دارالسلطنت سے دور رہے۔

شہزادہ دارا اگرچہ اورنگ زیب کی مخالفت میں سب کچھ کر سکتا تھا اور اس امکان کو رد بھی نہیں کیا جا سکتا پھر بھی ہم شاہجہاں کی نیت پر اس لیے شبہ نہیں کر سکتے کہ وہ دارا اور اورنگ کی قابلیت اور اہلیت سے پوری طرح واقف تھا۔ اس کے علاوہ خود شاہجہاں اپنے ایام شہزادگی میں وسط ہندوستان میں مشرق سے مغرب تک پھیلے ہوئے بندیل کھنڈ کے اس پہاڑی سلسلے اور خطرناک راستوں سے گزر چکا تھا۔ اس نے یقیناً" یہ سوچا ہو گا کہ دکن کی گورنری ہو یا بندیل کھنڈ کے خوفناک جنگلات' ان کی دشواریوں اور مشکلات سے عہدہ بر آ ہونا دارا جیسے سہل پسند شہزادے کے بس کا روگ نہ تھا۔

دوسری بات وہی تھی جس کا ذکر پہلے کیا گیا ہے کہ شاہجہاں کا یہ خیال تھا کہ اس کے تمام شہزادوں میں اورنگ زیب ہی ایک ایسا جفاکش اور دور اندیش شہزادہ نظر آتا ہے جس میں جہانگیری اور جہانداری کے جوہر موجود ہیں پس اس نے سوچا ہو گا اورنگ زیب کے اس نئے عہدے سے اس کی اہلیت اور نا اہلی کا امتحان ہو جائے گا اور نہیں تو کم از کم جنگ کا عملی تجربہ تو حاصل کر ہی لے گا۔

شہزادہ اورنگ زیب اپنے مختصر جان نثار دستے کے ساتھ بندیل کھنڈ کے علاقہ میں شاہی لشکر سے جا ملا۔ سرداران عالی مقام کو شہزادے کی آمد اور اس کے عہدہ جلیلہ کے بارے میں پہلے ہی علم ہو چکا تھا۔ چنانچہ چاروں سرداروں نے جو بذات خود اپنی اپنی جگہ مکمل سپہ سالار تھے انہوں نے اپنے سپہ سالار اعظم کے شایان شان استقبال کیا اور تعمیل حکم کے لیے اپنی گردنیں خم کر دیں۔

اورنگ زیب نے وہاں پہنچتے ہی سرداروں سے مشورہ کیا ان کے ساتھ چٹانوں' دروں اور جنگلات کے معائنہ کے لیے گیا پھر طے کیا کہ اس نے حکم دیا کہ ایک ہزار بیلدار' ایک ہزار تبر برادر اور پانچ سو درخت کاٹنے والے لشکر آگے بڑھیں ان کی حفاظت کے لیے دو ہزار سواروں کو مقرر کیا گیا۔ انہیں حکم دیا گیا کہ وہ مجوزہ راستے کو درختوں اور چٹانوں سے صاف کریں تاکہ لشکر آگے بڑھ سکے۔

کام شروع ہو گیا اور وہ جنگل جھاڑیاں اور سد راہ چٹانیں ٹوٹنے اور صاف ہونے

لگیں جن کے درمیان سے اکیلا آدمی بھی مشکل ہی سے گذر سکتا تھا۔ اب صورت حال یہ پیدا ہوئی کہ دن بھر میں جتنا راستہ صاف کر کے بنایا جاتا رات کو اتنا راستہ شمعوں کی روشنی میں لشکر طے کرتا۔ وہ صرف راستہ ہی طے نہ کرتا بلکہ راجہ جھجر کے ان شب خون مارنے والے دستوں کا بھی مقابلہ کرتا جو دن کے علاوہ رات میں بھی شاہی لشکر کو آگے بڑھنے سے روکنے پر مامور کیئے گئے تھے۔

اس طرح خوفناک اور خطرناک جنگلات کے اندر راستہ بنتا رہا۔ دشمن کے رات دن حملے جاری رہے اور شاہی لشکر قدم بہ قدم آگے بڑھتا اور راجہ جھجر کے مرکز سے قریب ہوتا گیا۔ اورنگ زیب کو راجہ جھجر کے پایہ تخت تک پہنچنے کے لیے بڑے بڑے جتن کرنے پڑے۔ اورنگ زیب نے اس سے پہلے ہاتھی سے جنگ کی تھی۔ کچھ اور کارنامے بھی اس کے دامن سے وابستہ تھے مگر یہ پہلا موقعہ تھا کہ اسے اپنی اور اپنی فوج کے لیے خوفناک جنگلوں کے درمیان راہ پیدا کرنا پڑی اور انہی خوفناک جنگلوں کے درمیان اسے راتیں بھی بسر کرنا پڑیں۔

قلعہ دیہی سنگھ، راجہ جھجر کا صدر مقام تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے شاہی لشکر کو کتنے دن مشقتوں اور دشواریوں سے گزرنا پڑا اس کا صحیح اندازہ تو کسی جگہ درج نہیں سوائے اس کے کہ شاہی لشکر تمام تر مشکلات کے باوجود بہت جلد قلعہ تک پہنچ گیا راجہ جھجر کو شاید قلعہ تک آنے والے دشوار گزار راستوں پر بڑا اعتماد تھا اور وہ سمجھ بیٹھا تھا کہ شاہی لشکر قلعہ تک پہنچنے کی کوشش میں ناکام ہو کر خود ہی واپس چلا جائے گا۔

لیکن شاہی لشکر کے بیلداروں اور تبرداروں نے کمال کر دکھایا اور ان پہاڑوں میں راستہ بنانے کا جو کام مہینوں کا معلوم ہوتا تھا وہ ہفتوں اور دنوں میں ہو گیا راجہ جھجر کو جب معلوم ہوا کہ شاہی لشکر اس کے قلعہ سے صرف چند سو گز کے فاصلہ پر آ پہنچا ہے تو وہ صرف تھوڑی سی فوج قلعہ کی حفاظت پر چھوڑ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ایک دوسرے قلعہ دہامونی کی طرف کوچ کر گیا۔

شاہی لشکر نے قلعہ دیہی پور کا محاصرہ کر لیا اور تھوڑے مقابلہ کے بعد قلعہ فتح ہو گیا سپہ سالار اعظم شہزادے اورنگ زیب نے حکم دیا کہ آخری فتح تک کہیں آرام نہ کیا جائے گا۔ چنانچہ دوسرے ہی دن شاہی لشکر اسی طرح جنگلوں اور پہاڑوں میں راستہ بناتا

دہامونی کی طرف بڑھنا شروع ہو گیا دہامونی پہنچنے کے لیے لشکر کو پہلے سے زیادہ محنت کرنا پڑی مگر لشکر کے جوانان کوہ شکن نے دہامونی تک راستہ تیار کر لیا اور راجہ جھجر کو اپنی اس پناہ گاہ سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔

جب لشکر نے قلعہ دہامونی کا محاصرہ کر لیا تو راجہ نے ہمت ہار دی اور صلح کے لیے نامہ و پیام شروع کر دیا۔ صلح کی بات چیت شروع ہی ہوئی تھی نہ اورنگ زیب کو اطلاع ملی کہ بہادروں کا ایک دستہ قلعہ کے جنوبی حصہ پر کمندیں پھینک کر اوپر چڑھ گیا ہے اور اس نے قلعہ کے جنوبی دروازہ میں آگ لگا دی ہے۔ جھجر سنگھ اس قیامت خیز خبر سے ایسا گھبرایا کہ رات ہی میں قلعہ چھوڑ کر جنگلوں میں چھپ گیا اور شاہی لشکر نے رات ہی میں قلعہ پر قبضہ کر کے لوٹ مار شروع کر دی۔

خان دوراں کو لوٹ مار کی خبر ملی جس کی اورنگ زیب نے ممانعت کر دی تھی تو وہ فوراً" قلعہ میں پہنچا اور لشکر کو اس حرکت سے منع کیا۔ صبح ہوئی تو خان دوراں نے خزانہ کی تلاش شروع کی۔ لشکریوں نے اطلاع دی کہ قریب ہی جنگل میں ایک کنواں ہے جو چاندی کے برتنوں اور روپیوں سے اوپر تک بھرا ہوا ہے۔ خان دوراں وہاں پہنچا اور کنویں پر قبضہ کیا۔ اس کنویں سے ڈھائی لاکھ نقد اور بیس من چاندی کے برتن برآمد ہوئے۔

شہزادے عالمگیر کو خبر دی گئی کہ جھجر سنگھ معہ اہل و عیال اور سامان کے شاہ پور کی طرف گیا ہے۔ شہزادے نے حکم دیا کہ سید خاں جہاں یہیں ٹھہر کے پوشیدہ دولت کا پتہ لگائیں باقی تین سپہ سالار یعنی خاں دوراں، عبداللہ خاں اور فیروز جنگ، راجہ جھجر سنگھ کا تعاقب جاری رکھیں۔

شاہی لشکر نے جھجر سنگھ کا تعاقب جاری رکھا۔ یہ تعاقب اس قدر سخت تھا کہ جھجر سنگھ کا دن کا چین اور رات کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ وہ ایک رات بھی پوری نیند نہ سو سکا تھا اکثر ایسا ہوا کہ جھجھر سنگھ یہ خیال کر کے کہ شاہی لشکر دو منزل پیچھے ہے، آرام سے لیٹ کے سو گیا مگر اسے چند ہی لمحوں بعد جگا دیا گیا کہ شاہی لشکر کا ہراول دستہ یہاں سے صرف چند میل کے فاصلہ پر ہے اور اسے وہاں سے بھاگنا پڑا۔

جھجر سنگھ کے پاس اس وقت تک بھی دو ہزار سوار اور چار ہزار پیدل کا لشکر تھا جنگی ہاتھیوں کی ایک معقول تعداد بھی اس کے ساتھ تھی مگر اسے شاہی لشکر کو ہراول دستے سے

بھی مقابلہ کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ آخر چاندہ کے مقام پر شاہی لشکر اس کے اس قدر قریب پہنچ گیا کہ اسے مجبور ہو کر میدان میں نکلنا پڑا۔

دونوں طرف سے صفیں ترتیب دی گئیں۔ جنگ شروع ہوئی مگر جھجھر سنگھ میدان میں قدم نہ جما سکا اور اس نے ایک بار پھر راہ فرار اختیار کی اس بار اس نے شاہی لشکر کو دھوکہ دینے کے لیے مال و متاع سے لدے ہوئے ہاتھیوں کو وہیں چھوڑ دیا تاکہ شاہی لشکر رقم بٹورنے میں لگ جائے اور وہ ان سے دور بہت دور نکل جائے اور اس کا تعاقب ختم ہو جائے۔

مگر شاہی لشکر نے اس کا یہ خیال غلط ثابت کر دیا۔ اس نے مال و دولت سے بھرے ہوئے ہاتھیوں کی مطلق پروا نہ کی اور اس کی حفاظت پر ایک دستہ فوج مقرر کر کے جھجھر سنگھ کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔ روانہ کیا ہوئے بلکہ انہوں نے تعاقب جاری رکھا۔ صرف زبانی احکام سے کام لیا اور آگے بڑھ گئے مشہور ہے کہ گونڈہ کا علاقہ خطرناک جنگلات سے بھرا ہوا ہے مگر شاہی لشکر راستہ نہ معلوم ہوتے ہوئے راستہ بناتا اور آگے بڑھتا رہا۔

آخر وہ وقت آ گیا کہ راجہ جھجھر سنگھ کو اپنی باقی ماندہ فوج یہاں تک کہ اپنے بچوں اور اپنوں کو بھی چھوڑنا پڑا اور وہ صرف اپنے بیٹے بکرماجیت کے ساتھ گونڈہ کے جنگل سے نکل بھاگا۔ ایک بیان کے مطابق جب شاہی فوج جھجھر سنگھ کی رانیوں کے پاس پہنچی تو انہوں نے تلواریں بلند کر کے مقابلہ کی کوشش کی۔ رانیوں نے شاہی سواروں پر حملہ بھی کر دیا مگر انہوں نے صرف اپنی مدافعت کی اور انہیں گھیرے میں لے کے ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا۔

اس موقعہ پر خان دوراں نے پکار کر کہا۔

"راجہ جھجھر کی خواتین ہماری' ماں بہنوں کے مانند ہیں۔ ہم انہیں تکلیف نہیں پہنچائیں گے" اس وقت ایک بوڑھی خاتون گھوڑا ایڑھا کر خان دوراں کے پاس پہنچی اور بڑے استقلال سے کہا۔

"اے مغل سردار۔ تم نے ابھی ہمیں اپنی ماں بہنوں کا درجہ دیا ہے۔ کیا یہ سچ ہے یا تم ہمیں فریب دے کر گرفتار کرنا چاہتے ہو"۔

خان دوراں نے فوراً" جواب دیا۔

"اے بزرگ خاتون۔ ہم لوگ مسلمان ہیں اور مسلمان خواتین کو دھوکہ نہیں دیا

کرتے"۔

"ٹھیک ہے۔ مجھے تمہاری بات کا یقین آ گیا"۔ بزرگ عورت نے کہا۔ "اب یہ بتاؤ کہ اگر ہم تمہاری ماں بہن کے برابر ہیں تو کیا تم اپنی ماں بہنوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں ڈالنا پسند کرو گے؟"

"ہرگز نہیں-----" خاں دوراں نے کہا۔ "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ ہتھیار رکھ دیجئے تو آپ ہمارے مہمانوں کی طرح ہمارے ساتھ چلیں گی۔ آپ کے خیمے لشکر سے الگ نصب ہوا کریں گے اور ان پر سخت پہرہ رہے گا۔ میں آپ کو اس بات کا بھی یقین دلاتا ہوں کہ میں سپہ سالار اعظم سے آپ سب کی پر زور سفارش کروں کہ آپ کو اس مقام تک بحفاظت پہنچا دیا جائے جہاں آپ جانا چاہیں"۔

بزرگ خاتون چند لمحے سوچتی رہی پھر پوچھا۔

"تمہارا سپہ سالار اعظم کون ہے میں کیا ان سے مل سکتی ہوں"۔

خان دوراں نے وضاحت کی۔

"معزز خاتون۔ ہمارے سپہ سالار شہنشاہ ہند کے بہادر فرزند اعلیٰ حضرت شہزادے محی الدین عالمگیر ہیں۔ وہ ہم سے ایک منزل پیچھے ہیں۔ ان کے آتے ہی ہم آپ کو ان کے حضور پیش کر دیں گے۔ اس وقت تک آپ ہماری مہمان رہیں گی"۔

"اچھا تو سنو"۔ بزرگ عورت نے کہنا شروع کیا۔ "میں راجہ جھجھر سنگھ کی ماں رانی پاربتی دیوی ہوں اور میرے ساتھ کی یہ تمام عورتیں کسی نہ کسی رشتے سے راجہ کی رشتہ دار ہوتی ہیں۔ نہ ہم تم سے جنگ کرنا چاہتے ہیں اور نہ ہمارا تم سے کوئی جھگڑا ہے"۔

یہ کہتے ہوئے بوڑھی رانی پاربتی دیوی نے تلوار نیچے پھینک دی اور گھوڑے سے اتر آئی۔

خان دوراں اور اس کے ساتھ کے تمام سرداروں نے بھی گھوڑے چھوڑ دیئے۔

خان دوران نے آگے بڑھ کر کہا۔

"معزز ماں۔ میں آپ کے بیٹے کے مانند ہوں۔ میں ایک بار پھر یقین دلاتا ہوں کہ آپ میں سے کسی خاتون کو بھی ذرا تکلیف نہ ہونے پائے گی"۔

راجہ جھجھر کے خاندان کی تمام خواتین نے ہتھیار رکھ دیئے اور مغلوں کی حفاظت میں

آ گئیں۔ راجہ کے جو مرد رشتہ دار تھے انہیں ضرور گرفتار کر لیا گیا۔ روایت ہے کہ جھجر خاندان کی بیگمات کے ساتھ کئی خورد سال بچے بھی تھے اور کچھ خواتین زخمی بھی ہو گئی تھیں۔ خان دوراں نے زخمیوں کو فوراً طبی امداد بھجوائی اور بچوں کا خاص خیال رکھے جانے کا حکم دیا۔

آخر راجہ جھجر خود اپنے انجام کو پہنچا۔ وہ گونڈہ کے جنگلات میں بھٹکتا پھر رہا تھا کہ وہاں کے جنگلیوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ راجہ جھجر سنگھ کے ساتھ اس کا ایک بیٹا بھی تھا۔ جنگلیوں نے ان دونوں کے سر قلم کئے اور سر لے کر شاہی لشکر میں پہنچے۔ خاں دوراں نے سر لانے والوں کو انعام دے کر روانہ کر دیا۔

دوسرے ہی دن شہزادہ اورنگ زیب وہاں پہنچ گیا خان دوراں نے راجہ جھجر سنگھ کے فرار اور اس کے گرانے کی گرفتاری کی پوری تفصیل اور جھجر سنگھ اور اس کے بیٹے کے سر شہزادے کے سامنے پیش کئے۔ شہزادے نے اپنی اس کامیاب مہم پر سجدہ شکر ادا کیا۔ اس نے حکم دیا کہ جھجر سنگھ کی خواتین کو یہ نہ بتایا جائے کہ جھجر سنگھ اور اس کا ایک بیٹا قتل ہو چکا ہے۔ مگر کسی طرح راجہ جھجر کی ضعیف ماں رانی پاربتی دیوی کو بیٹے اور پوتے کے قتل ہونے کی خبر مل گئی۔ راجہ کی دوسری رانیوں نے تو صبر کر لیا مگر پاربتی دیوی اس بڑھاپے میں بیٹے کی موت کا غم برداشت نہ کر سکی۔ وہ یہ خبر سنتے ہی بے ہوش ہو گئی اور ایسی بے ہوشی ہوئی پھر آنکھ نہ کھولی۔

شہزادہ اورنگ زیب نے شاہ بابا کو راجہ جھجر کے ساتھ جنگلوں اور اس کے فرار کے بارے میں تفصیلی خط لکھا باپ بیٹوں کے سروں کے ساتھ دارالسلطنت آگرہ روانہ کر دیا۔ ادھر شہنشاہ شاہجہاں راجہ جھجر کی حرکتوں سے اس قدر پریشان ہو گیا تھا کہ اس نے شاہی لشکر کے پاس خود جانے کا قصد کیا اور ایک بڑے لشکر کے ساتھ اوڑچھا (راجہ جھجر کا صدر مقام) کی طرف روانہ ہوا۔ شاہجہاں ابھی جھانسی کے قلعہ تک پہنچا تھا کہ اس تک وہ قاصد پہنچ گئے جو شہزادے اورنگ زیب کا خط اور راجہ جھجر اور اس کے بیٹے کے سر لے کر آگرہ جا رہے تھے۔

راجہ جھجر کے صدر مقام کو اوڑچھا اور بعض مقامات پر اوندچھہ کہا گیا ہے۔ پہاڑیوں میں گھرا ہوا یہ ایک پر فضا مقام تھا اورنگ زیب نے اپنے خط میں شاہ بابا کو اوڑچھا آنے کی

دعوت دی۔ چنانچہ بادشاہ اس فتح کی خوشیوں میں اضافہ کرنے کے لیے بہ نفس نفیس اوڑچھا گیا تھا جہاں اورنگ زیب نے اس کے حضور ایک ہزار اشرفیوں کی نذر گزاری تھی۔ اس جنگ میں جس قدر اخراجات ہوئے اس کی تفصیل کا تو ذکر نہیں ملتا مگر شاہی لشکر نے اس فتح کے موقعہ پر مختلف مقامات پر دبے اور گڑے ہوئے جو دفینے حاصل کئے اس کی مجموعی قیمت کا اندازہ ایک کروڑ ساٹھ لاکھ روپے لگایا گیا ہے۔

دکن کی طرف روانگی

راجہ جھجر کی بغاوت کے خاتمہ کے بعد شہنشاہ ہند شاہجہان نے دکن یعنی جنوبی ہند کا رخ۔ شاہجہاں اپنے ایام بغاوت میں جنوبی ہند کے بیشتر علاقوں میں قیام کر چکا تھا اور وہاں کے سیاسی اور مذہبی حالات سے پوری طرح آگاہ تھا۔ شاہجہاں کو عادل شاہ اور نظام الملک دونوں والیان حکومت سے پرخاش تھی۔ ایک روایت کے مطابق شاہجہاں اور اورنگ زیب دونوں ایک ساتھ سرونج کے راستے دکن کی طرف بڑھے تھے۔

شاہجہاں نے روانگی سے پہلے دونوں ریاستوں کو الگ الگ خطوط رواز کئے تھے والئ بیجاپور عادل خاں کے نام جو خط بھیجا گیا تھا اس کے خاص خاص نکتے مندرجہ ذیل تھے۔

۱۔ ساہو (مرہٹہ سردار) کو دوسرے مفسدہ پردازوں کے ساتھ نوکری سے نکال دیا جائے۔
۲۔ نظام شاہی قلعوں کو ہمارے حوالے کر دیا جائے۔
۳۔ پہلے کی طرح ہماری اطاعت کا دم بھریں۔

اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمارا لشکر آپ کے ملک پر حملہ آور ہو کر اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔

شاہجہاں نے جو فرمان قطب الملک کے نام جاری کیا۔ اس میں قطب الملک کو بڑی عزت سے مخاطب کیا گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں اپنی ہمسایہ سلطنتوں کو حقیر نہیں سمجھتا تھا اور انہیں تہذیب سے مخاطب کرنے کے بعد اپنا مقصد ظاہر کرتا تھا چنانچہ اس فرمان میں مندرجہ ذیل باتیں قابل ذکر ہیں۔

۱۔ صحابہ کرام کی برائی ریاست کے کسی حصہ میں نہ کی جائے۔

۲۔ ایران کے بادشاہ کے نام کا خطبہ نہ پڑھا جائے بلکہ ہمارے نام کا پڑھا جائے۔

۳۔ اطاعت کے طور پر ہمیں جو رقم دی جاتی تھی اسے روکا نہ جائے۔

قطب الملک کے دربار میں جب شہنشاہ ہند شاہجہاں کا ایلچی پہنچا تو قطب الملک نے اس کا بڑے سفیروں کی طرح شاہانہ استقبال کیا اور شہنشاہ کا فرمان ادب سے پڑھا پھر سفیر سے کہا۔

"اعلیٰ حضرت شہنشاہ ہند کے اس فرمان کا جواب ہم جمعہ کے دن جامعہ مسجد دیں گے۔ شاہی سفیر اس وقت تک ہمارے مہمان رہیں گے"۔

چنانچہ شاہی سفیر کو جواب کے لیے جمعہ تک مہمان خانہ میں قیام کرنا پڑا۔ جمعہ کے دن صبح ہی صبح قطب الملک کا خاص غلام آیا اور اس نے شاہی قاصد کو مطلع کیا۔

"حضور والا جاہ قطب الملک نے سفیر محترم کو مطلع کیا ہے اگر وہ آج جمعہ کے وقت جامعہ مسجد میں تشریف لائیں تو ان کی نوازش ہوگی۔

"والا جاہ سے عرض کی جائے کہ شاہی قاصد جامعہ مسجد میں ضرور آئے گا"۔ شاہی قاصد نے بھی ادب کا جواب ادب میں دیا۔

پس قطب الملک جمعہ کے دن نماز سے کچھ پہلے ہی مسجد میں آ گیا۔ شاہی سفیر وہاں موجود تھا۔ نمازی مسجد میں جمع ہوتے گئے۔ جب نماز کا وقت ہوا اور جامعہ مسجد نمازیوں سے بھری تو قطب الملک منبر کے پاس جا کے کھڑا ہوا اور اس نے شاہانہ انداز میں حکم جاری کیا۔

"میں حکم دیتا ہوں کہ جمعہ کے خطبہ میں بڑے صحابہ کے اسماء گرامی پڑھے جائیں اور ان پر دعا بھیجی جائے۔ دوسرے یہ کہ خطبہ میں شاہ ایران کے بجائے شہنشاہ ہند کا نام پڑھا جائے۔ نیز یہ کہ اب جو سکے ڈھالیں ان پر بادشاہ ہند کا نام مسکوک کیا جائے"۔

پھر قطب الملک نے بہت سے تحفے تحائف دے کر شاہی قاصد کو واپس بھیجا۔

فوج کشی

بادشاہ نامہ کے مصنف حمید خاں کے بیان کے مطابق جب شہنشاہ ہند شاہجہاں جب

نواح دولت آباد میں پہنچے تو انہوں نے خان دوراں' خان زماں اور شائستہ خاں کو مرہٹہ سردار ساہو جی کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا اور انہیں حکم دیا۔

"نظام الملک کے ملک میں گھس جائیں اور تمام مفسدوں کو گرفتار کر کے انہیں سزا دی جائے اور اگر عادل خاں مزاحمت کرے تو اس کی سلطنت کو بھی پامال کر دیا جائے"۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ بیجا پور پر حملہ کا آغاز ساہو جی مرہٹہ کی سرکوبی سے ہوا۔ شائستہ خان احمد نگر پہنچا اور وہاں سے اس نے ساہو جی کے علاقہ پر چڑھائی کی۔ اس پر قبضہ کے بعد شائستہ خان نے اپنے ایک سردار اللہ دادے خاں کو کوکن پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجا اللہ دادے خان پہلے کوکن پر قبضہ پر چازہ' رودولہ' جھولہ' کہتر' راج دھیر' ہنونت اور دھرب کے قلعے فتح کئے اس کے علاوہ اس نے پانچ اور قلعے فتح کئے جو نظام الملک کے عزیزوں کے قبضے میں تھے۔ ان پر قبضہ کے لیے اللہ دادے خان کو سخت لڑائیاں لڑنا پڑیں۔

دوسری سمت شائستہ نے پرگنہ سنگ میز' گلشن آباد' چاند اور انکولہ فتح کئے۔ یہ فتوحات ہو رہی تھیں کہ شہنشاہ نے حکم دیا کہ بیجا پور پر براہ راست حملہ کیا جائے۔ پس سب سے پہلے خان دوراں کی فوج اس طرف متوجہ ہوئی۔ اس نے کلیانی اور نارائن پر قبضہ جما لیا پھر اور آگے بڑھی۔ خان اور ان کی فوج کا حملہ اس قدر شدید ہوتا تھا کہ وہ جدھر سے گزرتی تھی ویرانی پھیلا دیتی تھی۔ اس یلغار میں پچاس کے قریب قصبے اور دیہات برباد ہوئے۔

خان دوراں کی فوج کے علاوہ دو اطراف سے اور حملہ کیا گیا اور پورے ملک میں تباہی اور بربادی پھیلا دی گئی۔ بیجاپوریوں نے کئی مقامات پر مقابلہ کیا مگر اس سیلاب کو نہ روک سکے۔ بیجاپوریوں نے مجبور ہو کر شاہ پور کی جھیل کو کاٹ دیا جس سے ہر طرف پانی کا سیلاب بھی امڈ پڑا۔

خاں دوراں کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے اپنا رخ بدل دیا اور کملا پور اور شولوپور کی آبادیوں کو ڈھیر میں تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی پھیل گئی۔ اب عادل خاں کی تمام اکڑ یوں دھری رہ گئی اور اس نے ابو سعید قاضی اور ابو الحسن کے ذریعہ

شہنشاہ سے معافی کی درخواست کی اور شہنشاہ نے اس کی درخواست کو شرف قبولیت بخشا عادل کو معافی نامہ کے جواب میں جو جواب بھیجا گیا وہ کچھ اس طرح تھا شہنشاہ نے دوستانہ القاب کے بعد اسے لکھا تھا۔

"مابدولت فساد کو پسند نہیں کرتے۔ فوج کشی اس وجہ سے کی گئی کہ تمہاری گردن ضرورت سے زیادہ اکڑ گئی تھی۔ پھر ہم نے تم پر الطاف خسروانہ کی بارش کی اور تمہیں وہ تمام علاقے واپس کئے جاتے ہیں جو تمہارے والد نے مغل حکومت کو دئے تھے اس کے علاوہ ہم تمہیں نظام الملک کی ریاست کے مندرجہ ذیل مقامات عطا کرتے ہیں۔

۱۔ محال انکو اور تمام قطعے جو اس محال میں بنے ہیں۔

۲۔ قلعہ شداد پور اور اس کے متعلقہ محال۔

۳۔ قلعہ پر بندھ اور اس کے متعلقہ پرگنے۔ پرگنہ بھالکی ۔ پرگنہ جیت کوبہ' ولایت کوکن' پرگنہ چاگنہ (یہ پچاس پرگنوں کا مجموعہ تھا)۔

شاہجہاں کے فرمان میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اگر عادل خاں نے معاہدہ کی شرائط کی پابندی کی وہ اور اس کی اولاد اس معاہدہ کو کبھی نہیں توڑے گی۔

شرائط معاہدہ

۱۔ شاہ جی بھونسلہ کو قطعی پناہ نہ دی جائے۔

۲۔ صاحب گو کھنڈہ قطب الملک کو دوست سمجھا جائے اس کی ریاست کی حدود کا احترام کیا جائے اور نظام الملک کی ریاست احمد نگر ان علاقوں کے سوا جو عادل خاں کو دئے گئے ہیں' بادشاہی ملک تصور کیا جائے۔

۳۔ بیس لاکھ روپے نقد ادا کئے جائیں اور وہ دو قلعے جو شاہ جی بھونسلہ کے پاس ہیں مغلوں کو واپس دلوائے جائیں۔

عادل خاں نے اپنی معافی کی درخواست میں یہ التجا کی تھی کہ اسے شہنشاہ کی ایک

تصویر تحفہ کے طور پر بھیجی جائے چنانچہ شاہجہاں نے اپنی ایک تصویر جو موتیوں اور جواہرات سے منڈھی ہوئی تھی عادل خان کو بھیجی تھی۔

شاہجہاں اور دکن کی ان دونوں ریاستوں کے درمیاں جو لڑائی ہوئی اور معاملات نپٹائے گئے اس میں بظاہر اورنگ زیب کا کوئی ہاتھ دکھائی نہیں دیتا لیکن دکن یعنی جنوبی ہند اور رنگ زیب کی گورنری میں دیا گیا تھا اور اگر جھجر سنگھ کا واقعہ پیش نہ آیا ہوتا تو اورنگ زیب بہت پہلے وہاں کا گورنر بن چکا تھا۔ اس لیے یہ کس طرح ممکن اورنگ زیب کو ان لڑائیوں یا معاہدوں سے دور رکھا گیا ہو یا اسے نظرانداز کیا گیا ہو۔ اورنگ زیب کو اب پھر گورنری دی جا رہی تھی اور اسی کو ان دونوں ریاستوں سے معاملات استوار رکھنا تھے اس لیے شہنشاہ نے اورنگ زیب کو ان معاملات سے قطعی بے خبر نہ رکھا ہو گا بلکہ ہر موقعہ پر اسے معاملہ کی اہمیت اور آئندہ کے اقدام کے بارے میں اسے ضرور سمجھایا ہو گا تاکہ اس کی مکمل تربیت ہو سکے۔

اورنگ زیب گورنر دکن

اورنگ زیب کی نیابت دکن (نائب السلطنت یا گورنر) کا اعلان شاہجہاں کے دکن جانے سے پہلے ہی کیا جا چکا تھا مگر اس کی روانگی سے پہلے راجہ جھجر کی بغاوت کا جھگڑا شروع ہو گیا اور اورنگ زیب کو وسطی ہند میں بندیل کھنڈ کی پہاڑیوں میں راجہ جھجر کی سرکوبی کے لیے جانا پڑا تھا راجہ کے جھگڑے اور بادشاہ کے جنوبی ہند جانے کے بعد اورنگ زیب کی گورنری کا از سرنو اعلان کیا گیا۔

ایک روایت کے مطابق ۲۰ صفر ۱۰۴۵ھ میں شاہجہاں نے اورنگ زیب کو دکن کا نائب السلطنت بنانے کا رسمی طور پر اعلان کیا اس روز بادشاہ نے اورنگ زیب کو خلعت فاخرہ پہنائی۔ خنجر مرصع با پھول کٹارہ اور شمشیر مرصع بھی شہزادہ کے سپرد کی۔ ایک سو ترکی گھوڑے اور اسی تعداد میں عراق گھوڑے' ایک مہا سندر نام کا فیل خاصہ اور اس کی مادہ بھی عطا کی۔ شہزادے نے نقد دو لاکھ روپے بھی دیئے گئے۔

یہ حال کسی کتاب میں نہیں ملتا کہ اس تقریب کے موقعہ پر دوسرے شہزادے کہاں

تھے امکان یہ ہے کہ شہزادہ دارا کو پنجاب کی نیابت مل چکی تھی اور وہ وہاں گیا ہوا تھا۔ اسی طرح شجاع اور مراد بھی ادھر ادھر تھے ورنہ ان کا ذکر ضرور ملتا۔ اس بات کا امکان پہلے بھی ظاہر کیا جا چکا ہے کہ شہزادہ اور خاص طور پر اور دوسرے شہزادے عام طور پر اورنگ زیب کو پسند نہیں کرتے تھے۔ شاید اسی خیال کے تحت شاہجہاں نے یہ تقریب دوسرے شہزادوں کی عدم موجودگی میں منعقد کی تھی۔

اورنگ زیب کی رسم گورنری کی ادائیگی کے بعد بادشاہ نے اسے بہت سی نصیحتیں کیں اور جنوبی ہند کے بارے میں اپنے تجربے بیان کر کے اسے پوری طرح آگاہ کر دیا۔ پس شہزادہ دوست احباب' امرا' وزرا اور محلات شاہی کی بزرگ خواتین --خیال رہے کہ اورنگ زیب کی والدہ یعنی ممتاز محل کا انتقال پانچ سال پہلے یعنی ۱۰۴۰ھ میں ہو چکا تھا) سے رخصت ہو کر دوست آباد روانہ ہوا جو اس وقت دکن کا پایہ تخت تھا۔

اورنگ زیب سے پہلے دوسرے شہزادے اس صوبہ دکن کے نائب السلطنت رہ چکے تھے۔ شاہجہاں خود بھی اپنے ایام شہزادگی میں اس بڑے صوبہ کا گورنر ہوا کرتا تھا مگر یہ اعزاز صرف اورنگ زیب کو حاصل ہے کہ وہ تمام شہزادوں سے زیادہ عرصہ تک وہاں کا گورنر رہا تھا۔ اورنگ زیب کی عمر اس وقت صرف اٹھارہ سال تھی دکن کا صوبہ اگرچہ مغل سلطنت کا سب سے بڑا علاقہ تو نہ تھا مگر اسے سب سے اہم اور انتہائی خطرناک حصہ کہا جا سکتا ہے۔

ایک تاریخی تفصیل کے مطابق دکن میں ۶۴ بڑے قلعہ اور چار بڑے صوبے تھے۔ ۵۳ قلعے پہاڑوں پر باقی زمین پر بنے تھے۔

دولت آباد سب سے بڑا صوبہ تھا احمد نگر کی نظام شاہی ریاست اسی صوبہ سے ملحق کر دی گئی تھی۔ اصل دکن یہی تھا اور اورنگ زیب نے یہیں قیام کیا۔

تلنگانہ اس کا دوسرا صوبہ تھا اسے بالا گھاٹ بھی کہا جاتا تھا۔ تلنگانہ ہی اس کا صدر مقام تھا۔

دکن کا تیسرا صوبہ خاندیس تھا۔ باسیر اور برہانپور اس کے دو مشہور شہر تھے۔ باسیر قلعہ تھا اور یہ اپنی مضبوطی کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔

برار کا صوبہ خاندیس کے جنوب مشرق میں واقع تھا۔ یہ دکن کا چوتھا صوبہ تھا۔ ایلچ

پور اس کا صدر مقام اور کاویلی اس کا قلعہ تھا۔ قلعہ باسیر کی طرح کاویل بھی اپنی مضبوطی کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔

فوجی طاقت

اورنگ زیب کی گورنری کے وقت دکن میں چار عظیم مغل سپہ سالار وہاں موجود تھے جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ ان میں سے خان زمان اور خان دوراں نظام الملک کی حدود میں داخل ہو کے کارروائی کر رہے ہیں شائستہ خاں اور خان جہاں کے لیے بادشاہ کا حکم تھا کہ وہ اورنگ زیب کے ساتھ ٹھہریں۔ جب بادشاہ دکن سے واپس ہوا تو اس نے خان جہاں کو دولت آباد میں رکنے کا حکم دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ اس وقت تک یہاں ٹھہرے جب تک خان زماں' جونیر کی فتح سے واپس نہیں آتا۔

شائستہ خاں کی حیثیت شہزادے کے اتالیق کی تھی۔ شائستہ خاں' اورنگ زیب کا اس تمام زمانہ میں اتالیق رہا جس زمانہ تک اورنگ زیب دکن کا گورنر رہا۔ اس دوران اورنگ زیب کو چار بار دربار آگرہ میں جانا پڑا تھا اور شائستہ خاں نے اس کی نیابت کی تھی۔ شائستہ خاں اور خان جہاں دونوں شہزادے عالمگیر کو جواب دہ تھے جبکہ دوسرے دونوں سپہ سالار براہ راست بادشاہ کو جوابدہ تھے اس لیے انہیں نظام الملک کے غیر مفتوحہ علاقے فتح کرنے کا فرض سونپا گیا تھا۔

مگر ان دونوں بزرگ سپہ سالاروں کے لیے بادشاہ کی یہ تاکید تھی کہ وہ شہزادے کی خوشنودی اور اطاعت کا ہمہ وقت خیال رکھیں اور شہزادے کو شکایت کا موقعہ نہ دیں خان زماں نے جنوبی ہند میں ایک بڑا کارنامہ یہ انجام دیا تھا کہ اس نے شاہ جی بھونسلہ جسے مغرور مرہٹہ کا سرکچل کر رکھ دیا تھا جس نے نظام الملک کی آڑ لے کر احمد نگر کے کئی مقامات پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہ عادل شاہ کی شہ پر کئی بار مغل سرحد پر حملہ آور ہو چکا تھا مگر اب وہ نئے معاہدہ کے تحت عادل شاہی پناہ سے محروم ہو گیا تھا۔

خان زماں نے شاہ جی بھونسلہ کو جنگلوں اور ویرانوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ آخر اس قدر تنگ آیا کہ اس نے خان زمان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ شاہ جی بھونسلہ

نے تمام نظام الملکی قلعے جو اس کے اور اس کے آدمیوں کے پاس تھے' خان زماں کے حوالے کر دیئے اس طرح احمد نگر کی تمام ریاست سوائے ان مقامات کے جو بادشاہ نے عادل شاہ کو دیئے تھے دکن میں شامل ہو گئی اور اورنگ زیب کی زیر قیادت دکن کی حدود پہلے سے کہیں زیادہ پھیل گئیں۔

بگلانہ کی جنگ

بگلانہ کی ریاست بادشاہی ملک کے درمیان میں واقع تھی۔ اس کے ایک طرف خاندیس' دوسری سمت گجرات و سورت تھی۔ یہاں کی معتدل آب و ہوا۔ نہریں اور سبزہ زار خاص کر یہاں کے انگور' سنگترہ اور آم کی تو تعریف نہ ہو سکتی تھی۔ اس مناظر قدرت کی بھی کمی نہ تھی۔ ۳۲ پرگنوں اور ۹ قلعوں پر مشتمل یہ ریاست' صدیوں سے اسی طرح چلی آ رہی تھی۔ ہند کے کسی انقلاب نے اس پر اثر نہ ڈالا تھا۔

اب اسے ریاست بگلانہ کی بدقسمتی کہا جا سکتا ہے کہ خاندیس سے جو سڑک گجرات جاتی تھی وہ اس ریاست سے ہو کر گزرتی تھی۔ ظاہر ہے کہ کوئی طاقتور حکمراں یہ گوارہ نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے دو صوبوں یا علاقوں کے درمیان کی سڑک پر کوئی اور قابض ہو۔ چنانچہ جب اورنگ زیب اپنی شادی کے لیے آگرہ گیا تو اس نے باپ سے اس ریاست پر قبضہ کی اجازت حاصل کر لی۔

آگرہ سے واپسی پر اورنگ زیب نے اپنے دو سرداروں کو بلایا۔ ان میں ایک محمد طاہر صوبیدار برہان پور تھا اور دوسرا مالوجی تھا۔ اورنگ زیب نے دونوں کو مخاطب کیا۔

"اگر تم سے کہا جائے کہ بگلانہ پر قبضہ کرو تو تمہیں کس قدر لشکر کی ضرورت ہو گی؟"

طاہر خاں صوبیدار نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔

"اگر گورنر بہادر مجھے تین ہزار سوار اور کچھ پیادے عطا فرمائیں تو میں بگلانہ پر قبضہ کرنے کے قابل ہو جاؤں گا"۔

اورنگ زیب نے مالوجی سے دریافت کیا۔

"تمہارا کیا خیال ہے مالوجی۔ اگر یہ مہم تمہارے سپرد کی جائے تو تمہیں کتنے لشکر کی ضرورت ہو گی"۔

مالوجی نے ادب سے عرض کیا۔

"شہزادے بہادر۔ طاہر خاں صوبیدار کا اندازہ درست معلوم ہوتا ہے۔ ہاں اگر سواروں کی تعداد میں ہزار ڈیڑھ ہزار کا اضافہ کر دیا جائے تو بگلانہ کے دونوں قلعہ فتح ہو سکتے ہیں لیکن اس کے لیے میں شہزادے بہادر سے ایک درخواست کروں گا؟"

"کیا درخواست ہے۔ وہ بھی بیان کر دو؟" شہزادے نے پوچھا۔ مالوجی نے بڑے حوصلے سے کہا۔

"شہزادے بہادر۔ آپ کو علم ہو گا کہ اس ریاست میں نو قلعے ہیں جن میں سالیر اور ملیر دو قلعے انتہائی مضبوط ہیں۔ میں نے وہ قلعے اندر سے بھی دیکھے ہیں۔ اگر شہزادے بہادر پسند فرمائیں تو میں یہ درخواست کروں گا کہ بگلانہ کی مہم پر میرے ساتھ صوبیدار طاہر خاں کو بھی مامور کیا جائے میں ان کے تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں"۔

شہزادے اورنگ زیب کو یہ تجویز بہت پسند آئی۔

"ہم تمہاری رائے سے اتفاق کرتے ہیں۔ ساتھ ہی تمہارے لئے یہ آسانی بھی پیدا کرتے ہیں کہ تمہارے ساتھ پانچ ہزار سوار اور تین ہزار پیادے بھیجے جائیں گے نیز یہ کہ تمہیں قلعہ شکنی اور قلعہ گیری کا سامان بھی دیا جائے گا"۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ جو فوج بگلانہ بھیجی گئی تھی اس میں ایک خاندیسی سید عبدالوہاب نام کا بھی شامل تھا۔ اسے بادشاہ کی طرف سے رستم دوراں کا خطاب بھی دیا گیا تھا۔ شہزادہ اورنگ زیب نے جو فوج بگلانہ روانہ کی تھی اس نے بگلانہ میں داخل ہو کر سب سے پہلے قلعہ ملیر کا محاصرہ کیا۔ یہ قلعہ سب سے زیادہ مضبوط تھا اور ناقابل شکست کہا جاتا تھا۔ قلعہ واقعی ایسا مضبوط تھا کہ شاہی لشکر اس کا تین ماہ تک محاصرہ کیا رہا مگر قلعہ کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ اس سے سالار فوج اور فوج میں سراسیمگی پیدا ہو گئی۔

پھر ایک رات وہی خاندیسی جس کا نام عبدالوہاب رستم دوراں تھا نے اپنے ساتھ پانچ سات جاں باز' ایک نشان بردار اور ایک نفری نواز لیا اور بغیر کسی کو اطلاع دئے لشکر سے غائب ہو گیا۔ رستم دوراں تین راتیں اور تین دن غاروں اور ویرانوں میں بھٹکتے بھٹکتے آخر

چوتھے دن بڑی کوششوں اور دشواریوں کے بعد پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کے اس نے شاہی جھنڈا گاڑا پھر ڈھول اور نفیری بجوا کر کچھ ایسا شور مچایا کہ قلعہ والوں کے دل دہل گئے۔ وہ تو اس بات کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ کوئی اس چوٹی تک پہنچ سکتا ہے۔ نفیری کی آواز نے وہ ادھم ڈالا کہ ایک طرف تو قلعہ والوں کے ہاتھ پیر پھول گئے دوسری طرف شاہی لشکر کے منچلے فوجیوں نے قلعہ پر یلغار کر دی اور مارتے کاٹتے قلعہ کے دروازے تک پہنچ گئے۔

بگلانہ کا راجہ ایسا گھبرایا کہ اس نے قلعہ سے راہ فرار اختیار کی اور ایک خفیہ راستے سے اپنے اہل خاندان کو ساتھ لے کر دوسرے قلعہ میں منتقل ہو گیا مگر اب تو شاہی لشکر کے حوصلے بڑھ گئے تھے انہوں نے ایک قلعہ پر قبضہ کے بعد دوسرے قلعہ کا رخ کیا اور راجہ کو وہاں جا گھیرا۔ راجہ پہلے ہی دل چھوڑ بیٹھا تھا۔ اس کی فوج نے بھی دل چھوڑ دیا اور راجہ کو مجبور کیا کہ وہ شہزادے سے صلح کی درخواست کرے۔

پس قلعہ کا دروازہ کھلا اور اس میں سے راجہ بگلانہ کی بوڑھی ماں اپنی پانچ داسیوں (کنیزوں) کے ساتھ برآمد ہوئی۔ قلعہ کا دروازہ پھر بند کر دیا گیا اور راج ماتا آہستہ آہستہ چلتی ہوئی شاہی کیمپ میں پہنچ گئی۔ سپہ سالار محمد طاہر صوبیدار نے راج ماتا کا استقبال کیا اسے ایک اونچی جگہ بٹھایا اور اس کے سامنے ادب سے کھڑا ہوا۔

راج ماتا نے سوال کیا۔

"تمہارا بڑا سردار کون ہے؟"

طاہر صوبیدار نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا۔

"راج ماتا میں شاہی لشکر کا سردار ہوں"۔

راج ماتا نے بڑے رعب سے کہا۔

"میں جو شرطیں پیش کروں گی کیا تم اسے قبول یا رد کر سکتے ہو؟"

"راج ماتا"۔ طاہر صوبیدار نے افسوس سے کہا۔ "شہزادے عالی گہر نے مجھے بگلانہ پر قبضہ کرنے کا حکم دیا ہے میں صلح میں با اختیار نہیں ہوں"۔

"کیا تم مجھے شہزادے عالی گہر کے سامنے پیش کر سکتے ہو؟" راج ماتا نے ذرا سوچنے کے بعد دریافت کیا۔

"بشرطیکہ آپ سفر کی تکلیف برداشت کر سکیں"۔ طاہر صوبیدار نے جواب دیا۔

"آپ ضعیف خاتون ہیں۔ ہم آپ کی ذمہ داری قبول نہیں کر سکتے"۔

"میں اپنی ذمہ داری پر شہزادے بہادر کے پاس جانا چاہتی ہوں"۔ راج ماتا نے بڑے حوصلہ سے کہا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے راج ماتا"۔ طاہر صوبیدار نے جواب دیا۔ "میں آپ کے سفر کا بہتر سے بہتر انتظام کروں گا"۔

"میں اپنے جانے کا خود انتظام کروں گی"۔ راج ماتا نے کہا۔ پھر اس نے اپنی ایک کنیز کو حکم دیا۔ "قلعہ میں جاؤ اور راجہ سے کہو کہ راج ماتا' شہزادے بہادر کے دربار میں دولت آباد جا رہی ہیں میری سواری کی فینس اور بیس کہاروں کو بھیج دیں۔

راج ماتا کی ایک کنیز قلعہ واپس ہو گئی۔ اس وقت راج ماتا نے طاہر صوبیدار سے کہا۔

"کیا میں امید کروں کہ جب تک میں شہزادے بہادر کے پاس واپس نہیں آ جاتی اس وقت تک قلعہ پر قبضہ کی کوشش نہیں کی جائے گی؟"

"راج ماتا بالکل اطمینان رکھیں۔" طاہر صوبیدار نے یقین دلایا۔ "اب آپ ہماری مہمان ہیں اور مہمانوں پر حملہ نہیں کیا جاتا"۔

شام ہونے سے پہلے پہلے راج ماتا کی فینس اور اسے لے جانے والے کہار قلعہ سے آ گئے اور اسی رات طاہر صوبیدار نے راج ماتا کو شاہی محافظوں کے پہرے میں دولت آباد روانہ کر دیا۔

ادھر دولت آباد میں شہزادے اورنگ زیب کو سپہ سالار کے بھیجے ہوئے ایک تیز رفتار قاصد کے ذریعہ یہ اطلاع مل گئی تھی کہ بگلانہ کے سب سے مضبوط قلعہ پر شاہی فوجوں کا قبضہ ہو چکا ہے اور راجہ دوسرے قلعہ میں محصور ہے۔ راج ماتا اسی سلسلہ میں شہزادے بہادر کی خدمت میں آ رہی ہیں۔ اورنگ زیب کو اس خبر سے بڑی مسرت ہوئی۔ اس نے راج ماتا کا بے چینی سے انتظار کرنا شروع کر دیا۔

آخر بوڑھی راج ماتا فینس پر سوار شہزادے کے پاس پہنچیں۔ شہزادے نے ان کا شاہانہ استقبال کیا۔ تمام امراء نے باری باری راج ماتا کی خیریت دریافت کی۔ شہزادہ راج

ماتا کو لے کے اپنے دربار میں آیا اوز اصرار کر کے اسے اپنی مسند پر بٹھایا۔

"شہزادے بیٹے۔ بھگوان تمہیں ہمیشہ خوش رکھے اور ایک سے بڑھ کے ایک درجہ تمہیں عطا کرے۔" راج ماتا نے شہزادے کو دعا دی۔

شہزادے نے بھی ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا۔

"راج ماتا۔ آپ مری والدہ کے مانند ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو اس طویل سفر کی زحمت اٹھانا پڑی۔"

"کیا کرتی شہزادے بیٹے؟" راج ماتا نے جواب دیا۔ "آپ کے سپہ سالار کو صلح کرنے کی اجازت نہیں تھی اس لئے مجھے شہزادے بہادر کے پاس آنا پڑا۔"

یہ کہتے ہوئے راج ماتا نے اپنے ریشمی بٹوے سے چابیوں کا ایک گچھا نکال کے شہزادے کے سامنے رکھ دیا۔

"شہزادے بیٹے---" بڑی بی نے نظریں جھکاتے ہوئے افسوس ناک لہجے میں کہا۔ "یہ چابیاں بتیس پرگنوں اور نو قلعوں کی ہیں۔ میرا بیٹا اپنی راج گدی سے دست بردار ہوتا ہے اور آپ کی چاکری کا خواہش مند ہے۔" اس کے ساتھ راج ماتا کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو ٹپک پڑے۔

شہزادہ اور اہل دربار بہت متاثر ہوئے۔ آخر شہزادے نے کہا۔ "راج ماتا۔ میں آپ کے صلح جو رویہ سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ میں آپ کو پیش کش کرتا ہوں کہ آپ اور آپ کا پورا خاندان معہ راجہ بگلانہ کے جس پرگنے یا جس قلعہ میں رہنا پسند کریں وہاں شاہی لشکر داخل ہونے کی کوشش نہیں کرے گا۔"

راج ماتا نے عرض کیا۔

"شہزادے بہادر۔ اگر آپ میرے بیٹے کے آنسو پونچھنا چاہتے ہیں تو اسے اپنی ملازمت میں قبول کرتے ہوئے پرگنہ سلطان پور ہمیں عطا کر دیجئے۔"

شہزادے اورنگ زیب نے راج ماتا کی دونوں درخواستیں قبول کر لیں۔ راجہ بگلانہ کو تین ہزاری منصب عطا ہوا اور سلطان پور کا پرگنہ بھی اسے دے دیا گیا۔ راج ماتا کو سفر مبارک ہوا اور وہ شہزادے کو دعائیں دیتی واپس ہو گئی۔

تعجب ہے لوگ پھر بھی اورنگ زیب کو ہندوؤں کے معاملہ میں متعصب کہتے ہیں۔

راجہ بگلانہ بھی تو ایک ہندو ہی تھا۔ اورنگ زیب کے لشکر نے ایک بڑے قلعہ پر قبضہ کر لیا تھا اور دوسرا قلعہ شاہی لشکر کے گھیرے میں تھا۔ وہ چاہتا تو بزور شمشیر قبضہ کر سکتا تھا مگر اس نے رواداری کا رویہ اختیار کیا۔ اس نے راجہ کو تین ہزاری منصب عطا کرنے کے علاوہ اس نے راج ماتا کے داماد سوم دیو پر نوازش کی اور اس کی ریاست اسی کی تحویل میں رہنے کا حکم نامہ جاری کر دیا۔ اورنگ زیب نے کم از کم اس راجہ کے معاملہ میں تو نہایت شریفانہ رویہ اختیار کیا۔

شہزادہ اورنگ زیب اور ہندو

اورنگ زیب پر عام طور پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ سخت متعصب تھا۔ خصوصاً ہندو مذہب اور ہندو قوم سے اسے شدید نفرت تھی۔ اورنگ زیب پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے مگر اس کی کوئی تاریخی سند پیش نہیں کی جاتی۔ اورنگ زیب نے ہندوؤں کے ساتھ جس رواداری کا مظاہرہ کیا اس کی ایک مثال تو اس کا راجہ بگلانہ کے ساتھ وہ سلوک ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

اورنگ زیب کی ایام شاہزادگی کا ایک واقعہ اور ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ہندوؤں کے ساتھ کسی تعصب کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یہ واقعہ گونڈوانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ وہاں ایک زمیندار نے اورنگ زیب سے مطالبہ کیا کہ اس کے باپ کی جاگیر اسے واپس کر دی جائے اور اورنگ زیب نے اس درست مطالبہ کے جواب میں اسے باپ کی جاگیر عطا کر دی۔ اورنگ تقریباً آٹھ سال تک دکن میں بادشاہ کی نیابت (گورنری) کرتا رہا اور سوائے کھلوجی کے قتل کے اور کوئی ایسا واقعہ نہیں جس میں شہزادے نے کسی ہندو پر زیادتی یا ظلم کیا ہو۔ کھلوجی کا واقعہ ایسا ہے جس میں اورنگ زیب کو مجبور ہو کے اس کے قتل کا حکم دینا پڑا تھا۔

کھلوجی دراصل شاہ جی بھونسلہ کا ایک قریبی عزیز تھا۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ جب شاہجہان نے عادل شاہ کی صلح کی درخواست منظور کی تو اس میں یہ شرط درج تھی کہ وہ (عادل شاہ) شاہ جی بھونسلہ کے کسی آدمی کو اپنی ملازمت میں نہیں رکھے گا اور جو لوگ

ملازم ہیں انہیں اپنی ملازمت سے برخاست کر دے گا۔ چنانچہ عادل شاہ شہنشاہ ہند کی اس شرط کو پورا کیا تمام مرہٹوں کو جن میں کھلوجی بھی تھا' اپنی ملازمت سے نکال دیا۔

کھلوجی نے شہزادے سے بدلہ لینے کے لئے دولت آباد کے قریب اپنا مرکز بنایا اور لوٹ مار شروع کر دی جو مرہٹوں کا آبائی پیشہ تھا۔ شہزادے کو جب کھلوجی کی ان ناشائستہ اور ناقابل برداشت حرکات کی خبر ملی تو اس نے حکم دیا کہ کھلوجی کو زندہ یا مردہ گرفتار کر کے پیش کیا جائے۔ شاہی دستوں نے کھلوجی کا تعاقب کیا اور ایک مقام پر اسے گھیر لیا۔ اس نے مقابلہ کیا اور مارا گیا۔

شہزادے اورنگ زیب نے آٹھ سال دکن میں بحیثیت گورنر گزارے یہ عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا لیکن اس تمام عرصہ میں اورنگ زیب نے نہ تو دکن میں کسی مندر کو گروایا اور نہ کسی ہندو کو تنگ کیا۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو یہ بات تاریخوں میں آ جاتی۔ کم از کم ہندو مورخ تو اسے ضرور لکھتے۔ ہندوستان کا سب سے بڑا متعصب اور بادشاہوں کا دشمن جادو رائے سرکار جو ہر مسلمان بادشاہ کے دور حکومت میں مین میخ نکالتا ہے اس تک نے اورنگ زیب کے بارے میں یہ نہیں لکھا کہ اس نے دکن کے ہندوؤں کے ساتھ تعصب برتا یا انہیں بغیر کسی وجہ کے تنگ کیا۔ ان حالات میں اورنگ زیب پر یہ الزام قطعی غلط ہے کہ اس نے دکن میں ہندوؤں کے ساتھ تعصب سے کام لیا۔

شادی خانہ آبادی

شہزادہ اورنگ زیب کی پہلی شادی خانہ آبادی ۱۰۴۶ ہجری میں اس وقت ہوئی جب وہ دکن کا گورنر تھا۔ شاہجہاں نے شادی کے لئے اورنگ زیب کو دولت آباد سے طلب کیا۔ اورنگ زیب کی شادی کو خافی خاں مصنف منتخب اللباب اور عبد الحمید مصنف بادشاہ نامہ بڑی تفصیل سے بیان کیا۔ ہم اسے یہاں پر مختصراً" درج کرتے ہیں۔

شہزادے اورنگ زیب کی پہلی شادی مرزا شاہ نواز خاں کی دختر نیک اختر سے ماہ ذی الحجہ ۱۰۴۶ ہجری میں ہوئی تھی۔ شاہجہاں نے اورنگ کو وسط ذی الحجہ میں دکن سے بلوا لیا تھا۔ جس وقت اورنگ زیب آگرہ پہنچا تو اس کی شادی کے انتظامات زور و شور سے ہو

رہے تھے۔ بادشاہ نے اورنگ زیب کے دونوں بڑے بھائی یعنی دارا شکوہ اور شاہ شجاع اور بہن شہزادی جہاں آراء جو بادشاہ بیگم کے نام سے معرف تھیں' شادی کے انتظامات کا منتظم بنایا گیا تھا۔

اس موقعہ پر شہنشاہ ہند شاہجہاں بادشاہ نے شادی کے اخراجات کے لئے دس لاکھ روپئے شاہی خزانہ سے دلائے تھے تاکہ شہزادی اسے جواہرات' پارچہ جات اور شادی کے دیگر اخراجات میں لگائے۔ یہ رقم جہاں آراء بیگم کے حوالے کر دی گئی تھی کیونکہ وہی اس شادی کی منتظم اعلیٰ تھیں۔

شادی کی رسومات کا آغاز ۲۲ ذی الحجہ کو ہوا۔ اس شب شاہ نواز خاں کی حویلی سے شہزادے کے لئے مہندی بھیجی گئی۔ رسم مہندی آدھی شادی کے برابر ہوتی ہے اور اس میں بڑا دھوم دھڑکا کیا جاتا ہے۔ آج کل بھی مہندی کی رسم بڑے زور و شور سے ہوتی ہے۔ آتش بازی' رقص و سرود' شادی کے تمام گیت اس رسم میں چار چاند لگاتے ہیں۔ عام لوگوں کی رسم حنا بندی دھوم دھام سے ہوتی ہے۔ یہ تو پھر ایک شہزادے کی مہندی تھی۔ جس قدر اعلیٰ پیمانہ پر انتظامات ہو سکتے تھے وہ کئے گئے۔ خوش گلو گانے والیوں نے گا گا کر گلے پھلا لئے۔

رسم مہندی کے اس عظیم الشان جشن میں تمام بڑے بڑے امراء نے شرکت کی۔ یہاں تک کہ آصف خاں نے بھی اس جشن میں شرکت کی تھی۔ شہزادے اورنگ زیب کو چاندی کی ایک چوکی پر بٹھایا گیا اور سامنے ایک حریری پردہ آویزاں کیا گیا تھا۔ گل اندام اور پری چہرہ بیگمات اور شہزادیوں نے پس پردہ بیٹھ کے شہزادے کے مہندی لگائی پھر حاضرین مجلس کی خشک میوہ جات' عطریات اور پانوں سے تواضع کی گئی۔

دوسرے دن دولہا یعنی شہزادہ اورنگ زیب اپنے نانا آصف خاں اور چھوٹے بھائی شہزادہ مراد کے ساتھ جلوس کی صورت میں شاہجہاں کے حضور پیش ہوا اور کورنش بجا لایا۔ بادشاہ نے خود اپنے ہاتھوں سے شہزادے کے سر پر مروارید کا سہرا باندھا۔ خلعت خاصہ عطا کی۔ موتیوں کی ایک مالا عنایت کی۔ جمدھر مرصع با پھول کٹارہ' شمشیر مرصع با پردہ مرصع' اپنی سواری کے دو عربی' عراقی گھوڑے' ایک جوڑا ہاتھی ہتھنی کا دیا۔ گھوڑوں پر سونے چاندی کی مزین کاٹھیاں سجی تھیں اور ہاتھیوں پر مرصع ہودج لگے تھے۔

اب بارات چڑھی۔ آگے آگے یمین الدولہ آصف خاں اور شہزادہ مراد بخش تھے۔ مراد بخش آگے آگے چلنے کے علاوہ شہ بالا بھی تھے۔ شہزادہ دارا اور شہزادہ شاہ شجاع اس بارات میں شریک نہ تھے۔ ان دونوں کو اورنگ زیب سے بچپن ہی سے اختلاف تھا۔ اس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔ بارات کے آگے آتش بازی چھوٹ رہی تھی اور نفریاں اپنی سریلی آوازیں فضا میں پھیلا رہی تھیں۔ یہ بارات پورے شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ دلہن کے گھر یعنی شاہ نواز خاں کی حویلی پر جا کے رکی۔

شہنشاہ شاہجہاں نے نکاح میں شرکت کی۔ وہ بہ نفس نفیس شاہ نواز خاں کی حویلی پر گیا تھا۔ چار لاکھ مہر پر جو اسی وقت ادا کر دیئے گئے' نکاح پڑھا گیا۔ نکاح کے بعد بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ باجے بجے' ڈھول پیٹے گئے۔ شادی بیاہ کے سینکڑوں گیت گائے گئے۔ ڈومینوں نے خوب خوب رقص کیا۔

اس مبارک موقعہ پر بادشاہ اور شاہ نواز خاں کی طرف سے تمام امرائے دربار کو خلعت فاخرہ سے نوازا گیا۔ سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ نکاح کی رات لڑکی کے باپ شاہ نواز خاں اس محفل میں موجود نہ تھے۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ یہ رسم ہندوستان کی تھی کہ نکاح کی رات دلہن کا باپ محفل میں نہ آئے۔ (واللہ اعلم) چنانچہ شاہ نواز خاں دوسرے دن بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نذر پیش کی۔

اس سے اگلے دن دعوت ولیمہ ہوا۔ ولیمہ شہزادے کی قیام گاہ پر ہوا۔ ولیمہ میں بادشاہ اور تمام امراء نے شرکت کی۔ اورنگ زیب نے بادشاہ کو بہت سے قیمتی جواہرات نذر میں پیش کئے۔ بادشاہ اور شہزادے کی طرف سے امرائے دربار کو تحائف اور خلعتیں دی گئیں۔

شادی کے بعد شہزادہ اورنگ زیب دکن واپس چلا گیا اور وہاں چھ سال تک نائب السلطنت کی حیثیت سے مقیم رہا۔ اورنگ زیب 1045 ہجری میں دکن گیا تھا اور وہاں 1053 ہجری تک گورنری کرتا رہا۔

شہزادی آگ کے شعلوں میں

شہنشاہ شاہجہاں کی بیٹی جہاں آراء جو بادشاہ بیگم کے نام سے مشہور تھی' ایک دن اتفاقیہ طور پر شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی۔ اس زمانہ میں کیا محل اور کیا جھونپڑی ہر جگہ شمع روشن کی جاتی تھی۔ رات کے وقت اگر ایک طرف ایک جھونپڑی کا اندھیرا ایک چراغ یا شمع سے دور کیا جاتا تھا تو شاہی محلات میں ہزاروں شمعیں' رات کی تاریکی کو دن کی روشنی میں تبدیل کر دیتی تھیں۔ ایک شب ہزاروں شمعوں سے جگمگاتے قلعہ آگرہ کے شاہی محل میں شہزادی جہاں آراء ریشمی کپڑوں میں ملبوس' اور کپڑے بھی ایسے کہ عطر میں رچے بسے ہوئے' کسی راہداری سے گزر رہی تھی کہ وہ بے خیالی میں ایک موڑ پر اس انداز سے گھومی کہ اس کا لہراتا آنچل ایک شمع سے چھو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک شعلہ سا بھڑکا اور شہزادی کا تمام لباس شعلوں کی صورت اختیار کر گیا۔

شہزادی اس ناگہانی آفت سے گھبرا کے زمین پر بیٹھ گئی' پھر لیٹ گئی۔ شہزادی کو شعلوں میں لپٹا دیکھ کر کئی کنیزیں اپنی جان پر کھیل گئیں مگر اسے بچاتے اور آگ بجھاتے بجھاتے' شعلے شہزادی کے ہاتھوں اور جسم کے بہت سے حصوں کو اس قدر جھلس چکے تھے کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہ رہ گئی تھی۔ بادشاہ کو جہاں آراء سے بہت محبت تھی۔ اس نے شہزادی کی تیمار داری کی ذمہ داری خود سنبھال لی اور تمام کام چھوڑ کر شہزادی کے علاج معالجہ اور دیکھ بھال میں لگ گیا۔

جہاں آراء کے علاج کے لئے ملک بھر کے بہترین طبیبوں کو طلب کیا گیا۔ انہوں نے طرح طرح کے مرہم تیار کئے۔ بادشاہ خود اپنے ہاتھوں سے شہزادی کے زخموں پر مرہم لگاتا تھا۔ اس کے علاوہ مغرب سے تہجد تک مسلسل عبادت میں مصروف رہ کر بیٹی کی سلامتی کی دعا مانگا کرتا تھا۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ جہاں آراء کے زخم بڑے بڑے طبیبوں کے تیار کئے ہوئے مرہم سے مندمل نہ ہوئے بلکہ ایک معمولی غلام عارف کے بنائے ہوئے مرہم سے شہزادی کو فائدہ ہوا اور نو ماہ کے مسلسل علاج کے بعد شہزادی شفا یاب ہو کر بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

شہنشاہ اور ہند کی رعایا کے لئے تو یہ موقع عید سے کم نہ تھا۔ بادشاہ نے شہزادی کا جشن شفا بڑی دھوم دھام سے منایا اور آٹھ دن تک دعوتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ غریبوں میں لاکھوں روپے تقسیم کئے گئے۔ قیدی آزاد ہوئے۔ عارف غلام کو سونے میں تولا گیا اور اسے دوسرے بہت سے انعامات سے نوازا گیا۔

اس اہم واقعہ نے شہزادی کے تمام بھائیوں کو پریشان کر دیا۔ جو جہاں تھا وہاں سے خبر پاتے ہی آگرہ کو روانہ ہو گیا۔ اورنگ زیب ان دنوں دکن میں تھا۔ چنانچہ وہ بھی بہن کی عیادت کو فوراً" آگرہ پہنچ گیا مگر اورنگ زیب کی بد قسمتی کہ اسے آگرہ پہنچنے کے صرف تین ہفتہ دکن کی گورنری سے معزول کر کے اسے جاگیر سے محروم کر دیا گیا۔ بادشاہ نے اسے گورنری سے کیوں محروم کیا۔ اس کی مختلف وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔ ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ اورنگ زیب نے ایک صوفی منش اور درویش صفت انسان کو قتل کرا دیا تھا مگر یہ بات دل کو نہیں لگتی کیونکہ اورنگ زیب کی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ اس نے شہنشاہ ہند ہونے کے باوجود اپنی زندگی نہایت سادگی سے گزاری تھی پھر وہ ایک درویش صفت انسان کو کس طرح قتل کرا سکتا تھا۔ بعض مورخین کا یہ خیال ہے کہ یہ حرکت دارا شکوہ کی تھی جس نے باپ کو اورنگ زیب کے خلاف کر کے اسے دکن کی گورنری سے معزول کرا دیا تھا۔

مگر یہ تمام خیالات، امکانات اور الزامات قطعی غلط اور بے بنیاد ہیں۔ اس سلسلہ میں حمید الدین خاں کا وہ بیان بالکل درست ہے جو انہوں نے اپنی تصنیف "احکام عالمگیری" میں حکم نمبر۲ کے تحت درج کیا ہے۔ خان بہادر حمید الدین خاں زندگی بھر اورنگ زیب کے دامن سے وابستہ رہے۔ انہوں نے اورنگ زیب کی شہزادگی اور شہنشاہی دونوں دیکھے اور اپنی کتاب "احکام عالمگیری" کو اورنگ زیب کے انتقال کے بعد مرتب کیا تھا اس لئے ان کے بیان میں کسی قسم کے شک و شبہ کو دخل نہیں دیا جا سکتا۔ احکام نمبر۳ کا ہم پہلے اردو ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس کی تصدیق میں اس کا اصل فارسی متن بھی درج کریں گے تاکہ بات بالکل صاف اور واضح ہو جائے۔

(اردو ترجمہ)

دور اندیشی

آگرہ میں دارا شکوہ نے ایک نیا محل تعمیر کرایا۔ انہوں نے اعلیٰ حضرت کی معہ تینوں بھائیوں کے دعوت کی۔ چونکہ گرمی کا موسم تھا اس لئے دریا کے متصل ایک تہہ خانہ بنایا تھا جن میں قد آدم جلی آئینے دریا کی جانب لگائے گئے تھے۔ دارا اعلیٰ حضرت کو معہ تینوں بھائیوں کے اس تہہ خانہ کو ملاحظہ کرانے کے لئے لے گئے۔ محمد اورنگ زیب تہہ خانہ کے دروازے کے قریب ہی بیٹھ گئے جس سے برابر آمد و رفت جاری تھی۔

دارا شکوہ نے یہ دیکھ کر اعلیٰ حضرت کو آنکھ کے اشارے سے اس طرف متوجہ کیا کہ آپ کی (اورنگ زیب کی) نشست ملاحظہ ہو۔

بادشاہ نے فرمایا۔

"بابا ہمیں معلوم ہے کہ تم عالم اور درویش صفت ہو لیکن پھر بھی حفظ مراتب ضروری ہے۔ (حفظ مراتب نہ کرنے والا زندیق ہوتا ہے) کیا ضرورت ہے کہ عام لوگوں کے راستہ میں بیٹھو اور چھوٹے بھائیوں کی بھی پشت پر رہو۔"

عالمگیر نے عرض کیا۔

"اس جگہ بیٹھنے کی وجہ بعد میں عرض کروں گا۔"

پھر جماعت کے ساتھ اورنگ زیب نے نماز ظہر ادا کی اور وہاں سے بغیر اجازت لئے اپنے محل چلے گئے۔ بعد میں جب اس کی خبر اعلیٰ حضرت کو ہوئی تو حکم دیا کہ دربار میں نہ آئیں۔ چنانچہ سات ماہ تک حاضری اور مجرا بند رہا۔ سات ماہ بعد اعلیٰ حضرت نے بادشاہ بیگم (شہزادی جہاں آراء) کو حکم دیا کہ ان کے محل جا کر اس روز ہماری بغیر اجازت چلے آنے اور اس بے موقعہ جگہ بیٹھنے کی وجہ دریافت کرو۔

بادشاہ بیگم کے دریافت کرنے پر اورنگ زیب نے جواب دیا۔

"جس روز دارا شکوہ نے دعوت کی تھی اس دن خواہ انہوں نے قصداً" یہ کیا ہو کہ باپ اور بھائیوں کو ایک ایسے تہہ خانہ میں جس کا محض ایک دروازہ تھا۔ تنہا چھوڑ کر خود دعوت کے انتظام کے لئے برابر آتے جاتے رہے۔ اب اگر (دارا شکوہ) دروازہ بند کر دیتے تو ہم سب کا کام تمام تھا۔ یا اگر سہواً" ان سے ایسا ہوا ہو۔ بہرحال میرے دل میں برابر یہ خیال آ رہا تھا کہ جب تک وہ سب اندر ہیں' میں اس خدمت (خدمت محافظت) کو بجا لاؤں لیکن اعلیٰ حضرت کا دبدبہ اس خدمت کی بجا آوری میں مانع تھا اس لئے میں استغفار پڑھتا ہوا چلا آیا۔"

یہ سن کر اعلیٰ حضرت نے فوراً" انہیں طلب فرمایا اور بہت عنایات کیں۔

شہزادے نے سعد اللہ خاں (وزیر اعظم) سے فرمایا۔ "کسی صورت مجھے دربار سے باہر بھیج دو۔ یہاں آرام و اطمینان مجھے نصیب نہیں۔"

اعلیٰ حضرت نے انہیں دکن کی صوبیداری پر بھیج دیا۔"

خان بہادر حمید الدین خاں کے اس بیان کے بعد کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی بلکہ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اورنگ زیب ایام شہزادگی میں بھی اپنی آنکھیں اور کان کس قدر کھلے رکھتا تھا۔

اورنگ زیب نے دکن میں جو کچھ کیا اس میں زیادہ حصہ چاروں بڑے بڑے سپہ سالاروں کا تھا اگرچہ تمام احکامات خود اس کے حکم اور دستخطوں سے جاری ہوتے تھے لیکن جب 1054 ہجری میں اسے گجرات کا گورنر بنا کر بھیجا گیا اور اسے حکم دیا گیا کہ چور ڈاکوؤں سے راستوں کو صاف کرو اور عوام کے دل سے ان کا خوف نکال کر انہیں اطمینان اور سکون کا یقین دلاؤ۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اس زمانہ میں گجرات کی حالت نہایت ابتر تھی۔ چوری' ڈکیتی اور

لوٹ مار معزز پیشے سمجھے جاتے تھے۔ عوام سہمے ہوئے رہتے تھے اور پورے گجرات میں جنگل کا قانون رائج تھا۔ پس جب اورنگ زیب نے وہاں کی گورنری سنبھالی تو خود اپنی مرضی کی فوج تیار کی اور انہیں اپنی ہی مرضی کی فوجی تربیت دی۔ یہ سب کام اورنگ زیب نے اس قدر تیزی سے کیا صرف چند ماہ میں اس کی فوج ایک تربیت یافتہ اور سرکار کی وفادار فوج بن گئی۔

پھر اورنگ زیب نے اس فوج سے وہی کام لیا جس کا اسے حکم دیا گیا تھا۔ اورنگ زیب نے صرف دو سال کے مختصر عرصہ میں گجرات کی کایا پلٹ کے رکھ دی۔ تمام بد انتظامیاں دور ہو گئیں۔ منادیوں نے امن و امان سے رہنا سیکھ لیا۔ پرچہ نویسوں نے بادشاہ کو اورنگ زیب کی کارگزاریوں کی اطلاع دی تو وہ بہت خوش ہوا اور اس نے اورنگ زیب کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا۔

بلخ و بدخشان کی مہم

ابھی دو سال پورے بھی نہ ہوئے تھے کہ اورنگ زیب کو بادشاہ کا فرمان پہنچا:

"شائستہ خاں حاکم مالوہ کو اپنی جگہ گجرات کا صوبیدار بنا کر تم لاہور پہنچو۔"

اس طلبی کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ بادشاہ نے چھوٹے بیٹے مراد کو پچاس ہزار سوار اور بہت سے نامور سرداروں کو بلخ و بدخشاں کی فتح پر مامور کیا تھا لیکن شہزادہ مراد بلخ پہنچ کے اپنے عہدے سے مستعفی ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ کسی ایسی ہستی کی ضرورت تھی جو اس جیتی ہوئی بازی کو ہار نہ جائے۔ اورنگ زیب کو بادشاہ نے یہ اہم کام سپرد کیا جبکہ دارا اور شجاع اس مہم پر جانے سے کترا رہے تھے۔

اورنگ زیب 8 ربیع الاول 1057 ہجری کو کابل سے بلخ کے لئے روانہ ہوا۔ وہ کابل میں صرف تین دن ٹھہرا تھا۔ شہزادے مراد کے استعفے کے بعد بلخ کے حالات یکسر تبدیل ہو گئے تھے۔ ازبک سوار و پیادے چیونٹیوں کی طرح ہر طرف اُمڈ پڑے تھے۔ بلخ کے جانے کے لئے ایک درہ سے گزرنا ہوتا تھا جسے ازبکوں نے گھیر رکھا تھا مگر دور اندیش

اورنگ زیب نے ان کا زور اس طرح ختم کیا کہ پہلے ایک دستہ ہراول کا بھیجا۔ اس کے پیچھے لشکر اور آگ برسانے والا توپخانہ لگا دیا۔

ہراول دستہ درہ میں داخل ہوا تو ازبک اس پر ٹڈی دل کی طرح ٹوٹ پڑے۔ اسی وقت اورنگ زیب کا لشکر ان کے سامنے پہنچ گیا اور بازوؤں سے ان پر آگ کے گولے برسنے لگے۔ ازبک سر پر پیر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور لشکر اطمینان سے بلخ پہنچ گیا۔ اسے بتایا گیا کہ عبد العزیز خاں نے تغلق محمد اور بیگ اوغلی کی قیادت میں بلخ کی سرحد پر فتنہ و فساد برپا کر رکھا ہے۔ اس وجہ سے وہ صرف تین دن بلخ میں ٹھہر سکا۔

اورنگ زیب نے اس تین دن کے قیام میں بلخ کے تمام مخالفین کو لالچ اور وعدوں کے ذریعہ اپنا ہمدرد بنا لیا۔ پھر اس نے مادھو سنگھ' راؤ رتن اور شمشیر خاں کو بلخ کی حفاظت پر مامور کیا۔ فوج کی تین ماہ کی تنخواہ پیشگی دے دی گئی جس سے فوج کے حوصلے بڑھ گئے۔ اورنگ زیب نے ان کے تعاقب کا حکم دے دیا۔ اس تعاقب کے دوران ہی ازبکوں کی دو اور تازہ دم فوجیں آن پہنچیں۔ اورنگ زیب نے اپنی حکمت عملی سے انہیں بھی کاٹ کے رکھ دیا۔

انہیں بھاگے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ بیگ اوغلی ایک اور تازہ دم فوج کے ساتھ سامنے آ گیا اورنگ زیب نے اسے بھی شکست سے دوچار کیا اور وہ تمام سامان اور خیمے ڈیرے چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ اس طرح اورنگ زیب قدم بہ قدم بلخ کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ آخر ازبک سردار عبد العزیز خاں ایک لشکر جرار کے ساتھ اس کے مقابل آیا۔ اورنگ زیب نے اسے بھی میدان میں جمنے نہ دیا۔

اورنگ زیب پندرہ سولہ دنوں تک ایسی لڑائیاں لڑتا اور ازبکوں کو پیچھے دھکیلتا اور آگے آگے بڑھتا رہا۔ اس نے لشکر کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ کہیں نہ ٹھہرے۔ یہاں تک کہ لشکر کا کھانا بھی ہاتھیوں کی پیٹھ پر پکتا تھا۔ ایسی خطرناک صورت حال کے باوجود اورنگ زیب کے لشکر نے جس کی تعداد پینتیس ہزار سے زیادہ نہ تھی ازبکوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ اس نے اور امیر الامراء علی مردان خاں نے ایسے ایسے بہادرانہ کارنامے انجام دیئے کہ عقل حیران رہ جاتی تھی۔

مغل لشکر پینتیس ہزار اور ازبک لشکر کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار سے بھی زیادہ تھی

مگر اس کے باوجود ازبک حاکم بلخ عبد العزیز خاں کو گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ اس نے تھک ہار کے شہزادے کے پاس قاصد بھیجا۔

قاصد نے شہزادے کے حضور عرض کیا۔

"میرے آقا عبد العزیز خاں نے درخواست کی ہے کہ اگر اعلیٰ حضرت نذر محمد کو بلخ نہیں دینا چاہتے تو اس کے بیٹے خان قلی خاں کو بلخ کا حاکم تسلیم کر لیں۔ خان قلی خاں اپنے باپ کی نسبت بہت زیادہ رعایا پرور جوان ہے۔"

شہزادے نے جواب دیا۔

"فساد تمہاری طرف سے شروع ہوا اور ہمیں فساد کو ختم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ہم اس کا خاتمہ کر کے رہیں گے۔"

"میرے آقا نے عاجزانہ عرض کیا ہے کہ مسلمانوں کے اس باہمی قتل و خون کو روک دینے کا حکم دیا جائے۔ اس جنگ کو روکنے بلکہ ختم کرنے کے لئے اعلیٰ حضرت خود کوئی شرط رکھ سکتے ہیں۔" قاصد ہر شرط تسلیم کرنے کی اجازت لے کر آیا تھا۔

آخر شہزادے نے کہا۔

"عبد العزیز خاں سے کہا جائے کہ صلح کرنے کی ہمیں اجازت نہیں۔ ہم اس کی درخواست دربار شاہی میں روانہ کر رہے ہیں۔ وہاں سے جو حکم ہو گا اس پر عمل کیا جائے گا۔"

قاصد خوش ہو گیا۔ اس نے کہا۔

"میرے آقا آپ کے فیصلے سے ضرور خوش ہوں گے۔ اب میں اپنے آقا کی طرف سے درخواست کرتا ہوں کہ درباری فیصلہ سے جواب آنے تک جنگ و جدل کو بند رکھا جائے؟"

اورنگ زیب نے اس کی یہ بات مان لی۔ صلح کی گفتگو تین ماہ تک چلتی رہی۔ شاہجہاں کا اصرار تھا کہ نذر محمد' شہزادے اورنگ زیب کے پاس خود چل کر آئے مگر نذر محمد خائف تھا۔ وہ برابر حیلے بہانے کرتا رہا آخر شاہجہاں کو صلح کی اجازت دینا پڑی۔ اس جنگ میں چار کروڑ روپے خرچ ہوئے اور چھ ہزار لشکری کام آئے پھر بھی شاہجہاں کی بلخ و بدخشاں فتح کرنے کی آرزو پوری نہ ہوئی۔ سوائے اس کے کہ اسے یہ معلوم ہو گیا کہ تمام

شہزادوں میں اورنگ زیب ہی ایک ایسا شہزادہ ہے جو مصائب سے لڑتا اور فوجوں کو دشمن سے لڑانے کا اہل ہے۔

قندھار ایک دردسر

شاہ ایران قندھار کو اپنے ملک کا ایک حصہ سمجھتا تھا اور جب بھی اسے بہتر حالات نظر آتے یا وہ شہنشاہ ہند کو مصائب میں گرفتار دیکھتا تو فوراً لشکر بھیج کر قندھار پر قبضہ کر لیتا۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ مغل لشکر کی بلخ و بدخشاں سے پسپائی نے شاہ ایران عباس ثانی کو یہ موقعہ فراہم کیا کہ وہ قندھار کو دبا بیٹھے۔ چنانچہ اس نے ایک عظیم الشان لشکر بھیج کے قندھار کا محاصرہ کر لیا۔ شاہجہاں کو خبر ملی تو وہ بہت تلملایا۔ اس نے دربار خاص منعقد کیا جس میں تمام شہزادے اور وزیراعظم سعد اللہ خاں خصوصیت سے بلوائے گئے۔

شہنشاہ نے کہا۔

"ایرانی لشکر نے قندھار کا محاصرہ کر لیا ہے۔"

اتنا کہہ کر شہنشاہ نے حاضرین پر نظریں ڈالیں۔ سب دم بخود کھڑے تھے سوائے اورنگ زیب کے جس کا ہاتھ تو قندھار کا نام سنتے ہی قبضہ شمشیر پر پہنچ گیا تھا۔ شہنشاہ نے سب کو نظریں جھکائے دیکھا تو بات آگے بڑھائی۔

"مابدولت شاہ عباس ثانی کو اس گستاخی کی سزا دینا چاہتے ہیں۔" اب بھی تمام لوگ بے حس و حرکت کھڑے رہے۔

شہنشاہ نے بات اور آگے بڑھائی۔

"ہم تم میں سے کسی ایک کو اس مہم کی سپہ سالاری سونپنا چاہتے ہیں۔"

کسی کو بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اورنگ زیب نے پہلے دارا کو پھر وزیر اعظم سعد اللہ خاں کو دیکھا پھر مضبوط آواز میں کہا۔

"اگر شہنشاہ معظم۔ یہ اعزاز اس خادم کو عطا فرمائیں تو عین نوازش اور کرم نوازی ہو گی۔"

شہنشاہ کے چہرے پر کسی کے نہ بولنے سے جو ناگوار تاثرات ابھر آئے تھے۔ وہ

معدوم ہو گئے اور مسرت کی لکیریں ابھریں۔ وہ بولا۔

"ہم شہزادہ اورنگ زیب کی درخواست کو فیصلہ کرتے وقت ضرور پیش نظر رکھیں گے۔ کوئی اور بھی اس اعزاز کو حاصل کرنے کا خواہش مند ہے؟"

اس بار وزیراعظم سعد اللہ خاں نے زبان کھولی۔ وہ ادب سے بولا۔

"اگر شہزادے حضور کے بعد اپنی خدمات پیش کرنا گستاخی نہ ہو تو یہ خادم شاہ عباس صفوی سے بدلہ لینے کا خواہشمند ہے؟"

شہنشاہ مسکرایا۔

"ہم سعد اللہ خاں کی پیش کش سے خوش ہوئے۔ ضرورت پڑی تو ان کی خدمات سے بھی فائدہ اٹھایا جائے گا۔ ہم چاہتے ہیں کہ شاہی لشکر کل شام تک قندھار کی طرف روانہ ہو جائے۔ ہمارے خیال کے مطابق اس مہم کے لئے بھی کم از کم پچاس ہزار کا لشکر درکار ہو گا۔ ایک سپہ سالار اعلیٰ کے علاوہ لشکر کے ساتھ کچھ پرانے تجربہ کار سردار بھی جائیں گے۔ لشکر کی روانگی کی تیاری فوراً شروع کر دی جائے۔"

اس مختصر گفتگو کے بعد شہنشاہ نے دربار برخاست کر دیا۔ پھر پتہ نہیں رات بھر شاہی محل میں کیا کھچڑی پکتی رہی کہ صبح کو اعلان ہوا کہ لشکر کے دو سپہ سالار ہوں گے۔ ایک شہزادہ اورنگ زیب اور دوسرا وزیراعظم سعد اللہ خاں۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں شہزادہ دارا شکوہ، باپ کے حواسوں پر چھایا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دارا، اورنگ زیب کی بلخ و بخارا کی مہم سے پریشان ہو گیا تھا۔ اگرچہ بلخ کی مہم میں شاہی لشکر کو پوری طرح کامیابی نہیں ہوئی تھی مگر اورنگ زیب کی اہلیت سے شہنشاہ نہ صرف خوش تھا بلکہ وہ اورنگ زیب کے مستقبل سے بہت پر امید تھا۔

اس اعلان سے شہزادہ اورنگ زیب ذرا بھی ہراساں نہ ہوا۔ وہ ہمیشہ مشکل راستہ اختیار کرنے کا عادی تھا۔ اس نے سعد اللہ خاں کے جانے پر کسی قسم کا تاثر ظاہر نہ کیا بلکہ وزیراعظم سے بے انتہا خوش اخلاقی سے گفتگو کی اور راستہ کے تعین پر دیر تک گفتگو کرتا رہا۔ شہنشاہ نے دونوں سپہ سالاروں کے اختیارات برابر برابر رکھے تھے۔

شاہی لشکر اگرچہ بہت جلدی روانہ ہوا تھا لیکن اس وقت ایرانی فوجوں نے قلعہ قندھار پر قبضہ کر لیا تھا۔ اورنگ زیب کو خبر ملی تو اس نے لشکر کو آگے بڑھنے سے روک دیا

اور شہنشاہ کے پاس قاصد بھیج کر تازہ احکامات طلب کئے مگر شہنشاہ نے حکم دیا کہ لشکر قندھار پہنچے اور قلعہ بازیاب کرے۔

شاہی لشکر نے قندھار پہنچ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اورنگ زیب کے پاس لشکر تو کافی تھا مگر قلعہ شکنی آلات کی کمی تھی۔ دوسرے یہ کہ موسم سرما شروع ہو گیا تھا۔ شہنشاہ نے مجبور ہو کر لشکر واپس بلا لیا۔ اس طرح یہ مہم ناکام ہو گئی۔ لیکن واپسی کے دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اس ناکامی کے غم کو قدرے ہلکا کر دیا۔

ہوا یہ کہ اورنگ زیب کو معلوم ہوا کہ ہرات سے ایک ایرانی لشکر قندھار پر حملہ کرنے والوں کی مدد کو آ رہا ہے۔ یہ خبر پاتے ہی اورنگ زیب نے اپنے ایک سردار جس کا نام رستم خاں تھا' کو سات ہزار لشکر دے کر حکم دیا کہ ہراتی لشکر کو راستے میں روک کر اس کی اچھی طرح مزاج پرسی کی جائے۔

رستم خاں حکم پاتے ہی ہراتی لشکر کا راستہ روکنے چل پڑا۔ جب رستم خاں کا ہراتی لشکر کا آمنا سامنا ہوا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے سات ہزار کے مقابلہ میں دشمن کی تعداد تیس ہزار سے زیادہ ہے مگر شیر دل رستم خاں نے چار گنا سے زیادہ لشکر پر اس قدر سخت حملہ کیا کہ وہ گھبرا گیا۔ جنگ دوپہر کو شروع ہوئی اور شام تک جاری رہی مگر اندھیرا ہونے سے پہلے ہی رستم خاں نے اتنے بڑے لشکر کو میدان سے مار بھگایا۔

اس طرح قندھار کی ناکامی کا غم کچھ ہلکا ہو گیا۔

قندھار کی دوسری اور تیسری مہم

قندھار کی دوسری اور تیسری مہم کی تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ دوسری مہم میں اورنگ زیب کو اگرچہ لشکر دے کر قندھار بھیجا گیا تھا مگر دارا نے باپ سے کہہ کر اورنگ زیب کے تمام اختیارات سلب کرا لئے تھے۔ وہ قندھار کے مورچہ پر تنکا ہلانے کا بھی مجاز نہ تھا۔ بادشاہ نے اسے حکم دیا کہ وہ ہر ہفتہ میدان جنگ کی رپورٹ بھیجا کرے اور اسے بس اس کام تک محدود کر دیا گیا۔

پھر بادشاہ خود کابل میں جا کر بیٹھ گیا اور وہاں بیٹھ کر قندھار کے محاذ کی کمان کرتا رہا۔

قندھار میں پورے اختیارات سعد اللہ خان کے پاس تھے۔ وہ اگرچہ ایک دور اندیش سردار تھا مگر جنگ کی حکمت عملی میں اسے مہارت حاصل نہ تھی۔ دوسری طرف دارا باپ کے ذریعہ محاذ پر ایسے ایسے احکامات بھجواتا رہا جس سے شاہی لشکر کی شکست اور واپسی یقینی ہو گئی۔ دارا کی مراد پوری ہوئی اور اس نے اس ناکامی کا پورا الزام اورنگ زیب پر تھوپ دیا مگر مورخین نے ان تمام الزاموں کو رد کر دیا اور شکست کا سبب خود شہنشاہ شاہجہاں کو ٹھہرایا۔

قندھار پر تیسری مہم کی ذمہ داری خود دارا نے بادشاہ سے ضد کر کے حاصل کی۔ وہ دراصل اورنگ زیب کو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ اورنگ زیب دو حملوں میں ناکام رہا اور اس نے ایک ہی حملہ میں قندھار واپس لے لیا مگر اس کی یہ آرزو بھی پوری نہ ہوئی۔ قندھار کے محاذ پر وہ ایسا بے بس ہوا کہ فقیروں اور جعلی پنڈتوں کی خوشامد کرنا پڑی۔ ان بہروپیوں نے دارا کو کئی بار فتح کی نوید سنائی مگر وہ سب فریب تھا۔ آخر دارا قندھار سے منہ پیٹتا ہوا واپس آ گیا مگر یہ عجیب بات تھی کہ شہنشاہ کے دل میں دارا کی حماقت کی وجہ سے ذرا بھی میل نہ آیا۔

دارا نے اپنی شکست کا بدلہ بھی اورنگ زیب ہی سے لیا۔ شہنشاہ نے کابل سے واپس ہوتے ہوئے راستہ ہی میں اورنگ زیب کو حکم دیا کہ اس کی آگرہ میں ضرورت نہیں۔ اس لئے وہ فوراً دکن کی گورنری پر واپس چلا جائے۔ دارا کو یہ خطرہ تھا کہ اگر اورنگ زیب آگرہ میں ٹھہر گیا تو وہ شہنشاہ کو اس کے خلاف نہ کر دے۔

اورنگ زیب نے دکن کی گورنری پر قناعت کی اور بغیر عذر دکن روانہ ہو گیا۔ قناعت کا یہ مطلب نہیں کہ اورنگ زیب نے ترقی کے تمام دروازے اپنے اوپر بند کر لئے بلکہ اس نے حالات سے سمجھوتہ کیا اور بغیر باپ کو ناراض کئے دکن واپس ہوا۔

اس وقت دکن کے حالات بہت خراب ہو گئے تھے۔ شاہجہاں کو یہ فکر تھی کہ اگر اورنگ زیب نے دکن پہنچنے میں تاخیر کر دی تو کہیں دکن کا علاقہ مغلوں کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لئے نہ نکل جائے مگر اورنگ زیب نے عجلت سے بالکل کام نہیں لیا اور بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ سفر کرتا رہا۔ اپنے سفر کے دوران اورنگ زیب باپ کو ہر ہفتہ ایک تفصیلی خط لکھتا تھا جس میں سفر کے حالات اور موسموں تک کا حال درج ہوتا تھا۔ جب وہ

گورکھا پہنچا تو اس نے بادشاہ کو اطلاع دی کہ جاڑا شروع ہو چکا ہے اور میں لحاف اوڑھ کر سوتا ہوں۔ اورنگ زیب کے یہ تمام خطوط "رقعات عالمگیری" میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

ان خطوط کے پڑھنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اورنگ زیب پر بڑے بھائی دارا شکوہ اور باپ شہنشاہ شاہجہاں کا جو خوف بچپن میں طاری تھا' آہستہ آہستہ وہ دور ہوتا جا رہا تھا اور اس میں "خود اعتمادی" کا جذبہ بڑی تیزی سے پیدا ہو رہا تھا۔ اس نے باپ کو سفر کے آغاز میں جو خطوط لکھے اس میں یہ امید ظاہر کرتا رہا کہ وہ دکن میں پہنچ کے حالات کو درست کرنے کی پوری کوشش کرے گا مگر جب وہ برہان پور پہنچا تو اس نے شاہجہان کو لکھا:

"میں جیسے ہی پایاں گھاٹ کے حالات درست کر لوں گا' اس وقت دولت آباد روانہ ہو جاؤں گا۔"

مگر شاہجہاں کے بے حد اصرار کے باوجود وہ برہان پور میں نو ماہ تک ٹھہرا رہا اور جب یک پایاں گھاٹ کے بندوبست کو اس نے درست نہ کر لیا وہ آگے نہیں بڑھا۔ اس لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس میں خود اعتماد کا جذبہ اس قدر عود کر آیا تھا کہ اپنا ہر فیصلہ اب خود کرنا چاہتا تھا۔ برہان پور کے قیام کے دوران باپ بیٹوں میں جو خط و کتابت ہوئی اس میں اورنگ زیب نے باپ کے ایک آدھ حکم کو ضرور ٹال دیا مگر دونوں میں کوئی خاص کشیدگی پیدا نہ ہوئی۔

اورنگ زیب کی پہلی اور آخری محبت

اورنگ زیب کا فسانہ عشق پڑھ کے یہ یقین نہیں آتا کہ یہ ایک ایسے شخص کی داستان محبت ہے جو ایک زاہد خشک کے نام سے مشہور ہے اور جو امرو نواہی کا اس قدر پابند تھا کہ گھوڑے کی پیٹھ پر بھی نماز پڑھ لیا کرتا تھا۔ مگر اس تاریخی واقعہ کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اس داستان عشق سے اس بات کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے آہنی سینہ میں کوئی آہنی دل نہیں تھا بلکہ اس سینے میں ہمارے اور آپ جیسا ایک دھڑکتا اور دردمند دل موجود تھا۔

یہ واقعہ اگرچہ بعض اصحاب کے ذوق سلیم پر گراں گزرے گا مگر حقیقت سے انکار تو

نہیں کیا جا سکتا جبکہ اس کے راوی خان حمید الدین خاں ہیں جو اورنگ زیب عالمگیر کے وکیل اور پرائیویٹ سیکرٹری کے عہدے پر تمام عمر فائز رہے۔ انہوں نے اپنی مرتب کردہ کتاب احکام عالمگیری میں اس واقعہ کو:۔

"چناں کہ رقند دانی"

کے عنوان کے تحت بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے چنانچہ ہم اس دلچسپ' پرلطف اور عجیب داستان کو کچھ حمید الدین کی زبانی اور کچھ اپنی زبانی درج کر رہے ہیں:

"زین آبادی جس کا اصلی نام ہیرا بائی تھا۔ وہ برہان پور کے ایک محلّہ یا قصبہ کی رہنے والی تھی اور بعد میں زین آبادی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کا قصہ اس طرح ہوا کہ جب حضرت اورنگ زیب دکن کی صوبیداری پر مقرر کئے گئے اور دکن (اورنگ آباد) جا رہے تھے تو برہان پور پہنچے۔ وہاں کا صوبیدار سیف خاں تھا جس کی شادی اورنگ زیب کی خالہ صالحہ بانو دختر آصف خاں سے ہوئی تھی۔

حضرت اورنگ زیب اپنے خالو کے گھر ملنے کے لئے گئے کہ خالو نے ان کی دعوت کی تھی۔ چونکہ یہ گھر ان کی خالہ کا تھا اس لئے محل کی عورتوں نے پردہ کا کچھ زیادہ اہتمام نہیں کیا تھا۔ حضرت اورنگ زیب بھی بے تکلف اور بغیر اطلاع کے خالہ کے محل میں داخل ہو گئے۔

اس وقت ہیرا بائی یعنی زین آبادی ایک درخت کے نیچے کھڑی تھی اور داہنے ہاتھ سے درخت کی شاخ پکڑے ایک عالم بے خودی میں دھیمے سروں میں ایک نغمہ بکھیر رہی تھی۔ ہیرا بائی کی پشت اورنگ زیب کی طرف تھی اس لئے اسے ان کے آنے کی مطلق خبر نہ ہو سکی اور وہ بدستور گنگناتی اور گاتی رہی۔ اورنگ زیب نے ہیرا بائی کا پورا رخ زیبا نہ دیکھا تھا مگر ایک ہی رخ دیکھنے پر اس کے حسن کے تمام زاویئے شہزادے پر روشن ہو گئے۔ مستزاد یہ کہ ہیرا بائی کے سروں کی لہکار اور اس کے اس طرح کھڑے ہونے کا انداز۔ ان سب

باتوں نے مل کر شہزادے اورنگ زیب پر کچھ ایسا جادو کیا کہ وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے اور دل تھام کر رہ گئے۔ (حمید الدین کے بیان کے مطابق شہزادے بے ہوش ہو گئے اور انہیں بہت دیر بعد ہوش آیا)

ظاہر ہے کہ جب شہزادے پر اتنی بڑی افتاد پڑی تو سیف خاں کے محل میں کھلبلی مچ گئی ہو گی۔ شہزادے کی خالہ پر کیا بیتی ہو گی۔ سب سے بڑھ کے یہ کہ اس غارت ہوش و فرد زین آبادی کو جب معلوم ہوا ہو گا کہ شہنشاہ ہند کا بیٹا اور دکن کا نائب السلطنت اس کے اس قدر قرب میں موجود ہے تو وہ کیسی گھبرائی' لجائی اور دم بخود رہ گئی ہو گی۔ اس وقت تک زین آبادی کو یہ تو معلوم نہیں ہوا تھا کہ شہزادے پر گزر جانے والی اس قیامت کی ذمہ دار وہ خود ہے اس لئے اس سلسلے میں تو اس نے کوئی تاثر ظاہر نہ کیا ہو گا۔ پھر اسی شاہزادے کی موجودگی نے اسے گھبرا کے رکھ دیا تھا۔

پس شہزادے کے زمین پر گرتے ہی یا بے ہوش ہوتے ہی کنیزوں میں یہ بات پھیلی ہو گی اور کسی کنیز نے دوڑ کے شہزادے کی خالہ کو مطلع کیا ہو۔

"صوبیدارنی جی۔ پائیں باغ میں ایک جواں رعنا بے ہوش پڑا ہے۔ وضع قطع اور لباس سے وہ کوئی امیر زادہ بلکہ شہزادہ معلوم ہوتا ہے۔"

اور صوبیدارنی یہ خبر پاتے ہی بے تحاشہ بھاگتی ہوئی باغ میں پہنچی ہوں گی پر جب انہوں نے اپنے بھانجے اورنگ زیب کو فرش خاکی پر بے سدھ پڑا دیکھا ہو گا تو کیا ان کا دل دھک سے نہ رہ گیا ہو گا۔

بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔ مگر جب صوبیدارنی کو اس کی اطلاع پہنچی تو ان کا دل دھک سے نہیں ہوا تھا بلکہ ان کا چہرہ غصہ سے سرخ بھبگا تھا۔ انہیں شہزادے کا تو خیال ہی نہ

تھا۔ ان کی سمجھ میں صرف یہ آیا کہ کوئی مردوا ان کے محل میں گھس آیا تھا جسے لونڈی غلاموں نے مار مار کے بے ہوش کر دیا ہے۔ انہیں اس بات پر اتنا غصہ آیا کہ جھلا کے اٹھیں تیز تیز قدموں سے پائیں باغ کی طرف چلیں۔ اب کیفیت یہ تھی کہ آگے آگے صوبیدارنی اور ان کے پیچھے کنیزوں کی ایک لمبی قطار۔ مختصر یہ کہ شہزادے کی خالہ غصہ میں بھری اور پیر پٹختی اس درخت کے پاس پہنچیں جس کے قریب اورنگ زیب بے ہوشی یا نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑا تھا۔ اب شہزادے پر نظر پڑتے ہی خالہ کا دل دھک سے رہ گیا ر پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ یہاں یہ قیاس کرنا کچھ غلط نہ ہو گا کہ صوبیدارنی کے اتھ آنے والیوں میں وہ بت طناز ضرور ہو گی جس نے شہزادے کا یہ حال بنایا تھا۔

ملاحظہ ہو اس منظر کو حمید الدین خاں مصنف احکام عالمگیری کیسے مزے سے بیان تے ہیں:-

> یہ خبر خالہ کو پہنچی۔ وہ ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی آئیں اور شہزادے کو سینہ سے لگا کر (درست یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہزادے کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اس لئے کہ وہ بیہوش تھے) گریہ و زاری کرنے لگیں۔ بارے چار گھڑی بعد ان کو کچھ ہوش آیا۔
>
> خالہ نے بھانجے کو ہوش میں آتے دیکھا اور لپک کے بولیں۔
>
> "میں شہزادے بیٹے پر صدقے واری۔ کیا ہو گیا تھا میرے بیٹے کو۔ کس ظالم کی نظر لگ گئی۔ آنے کی اطلاع تو کرا دی ہوتی بیٹے۔"
>
> خالہ نے اور بھی بہت کچھ کہا مگر شہزادے کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو پریشان ہو گئیں۔ دعوت اور مہمانداری کی تمام خوشی خاک میں مل گئی اور محل پر ایک ماتم اور سوگواری کی کیفیت طاری ہو گی۔
>
> خالہ کنیزوں کی مدد سے شہزادے کو باغ سے اپنی خوابگاہ میں لائیں۔ انہوں نے اورنگ زیب کے سر پر ہاتھ رکھ کر سہلانا اور دبانا شروع کیا۔ کنیزیں' شہزادے کے ہاتھ پیروں کی طرف جھک پڑیں۔
>
> خالہ بولیں۔

"اے ہے۔ خان صاحب کو اطلاع کرو۔ طبیب کو بلواؤ۔"

طبیب کے نام پر شہزادے نے آنکھیں گھمائیں اور خالہ کو اس طرح دیکھا جیسے منع کر رہے ہوں۔

شہزادے کے انکار پر خالہ نے گھر کی دواؤں کی طرف توجہ کی۔ ایک بوتل شربت مفرح دل و دماغ خوابگاہ میں رکھی تھیں۔ بوتل منگا کر تھوڑا شربت گلاس میں انڈیلا مگر شہزادے نے منہ نہ کھولا۔

خالہ بیچاری ہولائی ہولائی اور بوکھلائی بوکھلائی کبھی اس کمرے میں کبھی اس کمرے میں بھاگتی رہیں اور بڑبڑاتی رہیں۔ کبھی خود کو کوستیں کبھی خان صاحب کو برا بھلا کہتیں کہ آدھی رات ہونے کو آئی مگر خان صاحب پتہ نہیں کس رنگین محفل میں جمع ہوئے ہیں کہ گھر یاد ہی نہیں آیا۔

بارے نصف شب گزارنے کے بعد شہزادے نے خاموشی کا قفل توڑا۔ خالہ کو ادب سے سلام کیا اور مسہری کے سہارے ٹیک لگا کے بیٹھے۔ خالہ نے ہزاروں لاکھوں دعائیں دے ڈالیں۔

پھر رازدارانہ انداز میں دریافت کیا۔

"شہزادے بیٹے۔ تمہیں میری جان کی قسم سچ بتانا کہیں خالو جان سے کچھ کہنا سنی تو نہیں ہو گئی۔ ضرور ایسا ہی ہوا ہو گا۔ وہ تو ہیں ہی ایسے۔ نہ چھوٹے کا خیال نہ بڑے کا لحاظ۔ جو منہ میں آتا ہے بک جاتے ہیں۔ ضرور انہوں نے کوئی ایسی بات کہی ہو گی جو میرے شہزادے بیٹے کے دل کو لگی اور ان کی یہ حالت ہوئی ہے۔"

"نہیں خالہ جان۔" آخر شہزادے نے زبان کھولی۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔ میرا خالو جان سے ابھی سامنا نہیں ہوا۔"

"پھر آخر کیا ہوا ہے۔ کوئی بات تو ہوئی ہو گی جو تمہاری یہ حالت ہوئی؟" خالہ جان کو فکر دامنگیر ہوئی۔ بہن کا بیٹا۔ باپ ہند کا شہنشاہ اور نانا وزیراعظم۔ خدانخواستہ شہزادے کو کچھ ہو گیا تو لینے کے

دینے پڑ جائیں گے۔ خالہ کا اس خیال ہی سے جی لرزنے لگا تھا۔

"خالہ جان۔ بات تو کچھ ضرور ہوئی ہے۔" اورنگ زیب نے بات چھپاتے ہوئے کہا۔ "مگر کہنے سے کچھ فائدہ نہیں۔"

"اے بیٹے کیا کہہ رہے ہو---" خالہ بولیں۔ "تمہارے لئے تو میں اپنی کھال کے جوتے بھی بنوا سکتی ہوں۔ ضرورت پڑی تو جان بھی دے دوں گی۔ تم کہہ کے تو دیکھ بیٹے۔" خالہ جان نے بڑے زور دے کے اور حوصلے سے کہا۔

مگر شہزادے نے پھر بھی انکار کیا۔ "نہیں خالہ جان۔ آپ میرے مرض کا علاج نہیں کر سکتیں۔ پھر میں بتا کے کیا کروں آپ کو؟"

"اے بیٹے۔ تجھے میری جان کی قسم۔ تو بتا کے تو دیکھ۔ آسمان سے تارے نہ توڑ لاؤں تو میرا نام صالحہ بیگم نہیں۔" صالحہ خالہ نے سینہ تان کے اور ہاتھ گھما کے کہا۔

"اچھا خالہ بتاتا ہوں۔" شہزادے بہادر نرم پڑ گئے۔ "مگر یہ جان لیجئے کہ آپ کے بس میں میرا علاج نہیں۔ میری زبان بھی خالی جائے گی۔"

"نہیں بیٹے تیری بات خالی نہیں جا سکتی۔ میں جان پر کھیل جاؤں گی اور تیری زبان رکھوں گی۔"

"تو پھر مجھے تخلیہ چاہئے۔" شہزادے نے آخر بتانے پر اپنی آمادگی ظاہر کر دی۔ خالہ نے فوراً کنیزوں کو اشارہ کیا اور وہ تمام کی تمام سمٹ کر خوابگاہ کے دروازہ کے باہر چلی گئیں۔

پتہ نہیں شہزادے اورنگ زیب نے صالحہ خالہ کے سامنے اس ہوشربا منظر کی تصویر کس طرح کھینچی کہ خالہ خود تصویر بن کے رہ گئیں۔ ان کی رنگت زرد پڑ گئی۔ چہرہ فق ہو گیا اور وہ ہکا بکا رہ گئیں۔ حمید الدین اسے اس طرح بیان کرتے ہیں:

"یہ بات سنتے ہی خالہ کے ہوش اڑ گئے۔ زبان گویا بند ہو کے رہ گئی

کہ کیا جواب دیں۔ کچھ دیر انتظار کے بعد اورنگ زیب نے فرمایا۔

"آپ نے خواہ مخواہ میرا حال دریافت کرنے میں اتنی شفقت کا اظہار کیا۔ اب آپ پر خاموشی طاری ہو گئی ہے۔ آپ نے تو میری بات سن کے خاموشی اختیار کر لی ہے۔ آپ میرا علاج کیا کریں گی؟"

شہزادے کی بات میں غم و غصہ اور طنز و بے بسی تھی۔ صالحہ خالہ تڑپ اٹھیں اور بولیں۔

"صدقے جاؤں شہزادے بیٹے۔ تم اس بد بخت سیف خاں کو تو جانتے ہی ہو۔ کیسا سفاک ہے۔ وہ بادشاہ شاہجہاں یا تمہاری۔ کسی کی بھی پروا نہیں کرتا۔ وہ اس بات کو سنتے ہی پہلے اس کو (زین آبادی) اور پھر مجھے قتل کر دے گا۔ اس سے کہنے کا فائدہ اس سے زیادہ کچھ نہ ہو گا کہ میں تم پر اپنی جان فدا کر دوں لیکن وہ بے گناہ بیچاری بلا قصور ماری جائے گی۔"

"سچ فرمایا آپ نے خالہ جان۔" شہزادے نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔ "خیر میں کوئی دوسری ترکیب نکالتا ہوں۔"

اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ زین آبادی (ہیرا بائی) سیف خاں کے حرم میں داخل تھی۔ تھی تو وہ کنیز لیکن حرم میں داخل ہونے کے بعد اس کا مرتبہ کنیزوں سے بلند ہو کے بیگمات کے درجہ تک پہنچ گیا تھا۔

صبح ہوتے ہی شہزادے اپنے محل آ گئے۔ انہوں نے خالہ کے یہاں مطلق کھانا نہیں کھایا۔

پھر شہزادے نے مرشد قلی خاں کو جو ان کے ساتھ تھا اور دکن کا دیوان تھا' بلوایا۔ وہ شہزادے کا خاص رازدار تھا۔ اس سے شہزادے نے کل شام سیف خاں کے یہاں پائیں باغ میں گزرے ہوئے واقعہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔

اس وفادار رازدار نے دست بستہ عرض کیا۔

"آقائے محترم۔ پہلے میں سیف خاں کا کام تمام کئے دیتا ہوں۔ اس کے بعد اگر کوئی مجھے قتل بھی کر ڈالے تو کچھ مذائقہ نہیں۔ اس لئے کہ میرے خون کے بدلہ میں پیر و مرشد کا مقصد تو پورا ہو ہی جائے گا۔"

شہزادے نے ارشاد فرمایا۔

"مرشد قلی خاں۔ ہمیں تمہاری جانفشانی سے اسی بات کی امید تھی لیکن ہمارا دل نہیں مانتا کہ اتنی سی بات کے لئے خالہ کو بیوہ کیا جائے پھر یہ جو شرع اور فقہ سے واقف ہو اس کے لئے شریعت میں کسی کے صریحا" قتل کا اقدام کرنا ممکن نہیں البتہ اللہ پر بھروسہ کر کے ان (سیف خاں) کے پاس جاؤ اور بات کرو۔"

جاں باز مرشد قلی خاں بلا عذر و تکلف سیدھا سیف خاں کے پاس پہنچا اور جو کچھ شہزادے پر بیتی تھی وہ کم و کاست بیان کر کے مقصد پر روشنی ڈالی۔

سیف خاں کہ جہاندیدہ اور گرم و سرد چکیدہ تھا' نے مرشد قلی خاں کو جواب دیا۔

"شہزادے بہادر کی خدمت میں میری تسلیمات پیش کرنا۔ رہا اس بات کا جواب تو میں اس کا جواب شہزادے بہادر کی خالہ کو دے دوں گا۔"

مرشد قلی خاں یہ جواب سن کر شہزادے کی طرف چلا اور ادھر سیف خان مہمان خانہ سے اٹھ کے زنان خانہ میں داخل ہوا۔

شہزادے کی خالہ یعنی سیف خاں کی بیگم صالح بانو متفکر اور پریشاں پریشاں سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ سیف خاں ان کے قریب پہنچے اور بڑی بے تکلفی سے بولے۔

"شہزادے بہادر نے ہیرا بائی کو طلب کیا ہے تو کوئی مذائقہ نہیں اور نہ مجھے ہیرا بائی کو ان کے حوالے کرنے میں کوئی عذر ہے۔

ہاں اس کا عوض و بدلہ لازم ہے۔ وہ اس طرح کہ مجھے شہزادے کی بیگم یعنی شاہنواز خاں کی بیٹی کی تو کوئی ضرورت نہیں مگر ہاں وہ اپنی حرم خاص چتر بائی کو میرے پاس بھیج دیں اور عوض و بدلہ ہو جائے۔"

پھر بیوی کو حکم دیا۔

"تم اسی وقت سوار ہو کے شہزادے کے پاس جاؤ اور عوض و بدلہ کی بات کرو۔"

مگر بیوی نے انکار کر دیا۔

"میں اس معاملہ میں نہیں پڑتی اور نہ شہزادے کے پاس جاؤں گی۔"

سیف خاں صرف نام ہی کے سیف خاں نہیں تھے بلکہ واقعی سیف خاں تھے۔ فوراً تلوار کھینچ لی۔

"بیگم اگر اپنی جان کی خیر چاہتی ہو تو فوراً سوار ہو اور شہزادے کے پاس جاؤ۔"

بیچاری صالحہ بانو مجبور ہو گئیں۔ اسی وقت سوار ہوئیں اور شہزادے کی طرف روانہ ہو گئیں۔

ادھر شہزادے بہادر، عشق کا تیر کھائے سینہ دبائے خالہ کا انتظار کر رہے تھے کہ دیکھئے خالہ آتی ہیں یا کسی قاصد کے ذریعہ کوئی پیغام بھیجتی ہیں۔ مرشد قلی خاں انہیں صرف یہی بتا سکا تھا کہ اس نے سیف خاں سے ہیرا بائی کا سوال کیا ہے اور سیف خاں نے جواب اپنی بیگم کے ذریعہ بھجوانا ہے۔

آخر ان کی الجھن ختم ہوئی قاصد کے بجائے خود خالہ صالحہ بانو تشریف لائیں۔ حفظ مراتب کا تکلف بالکل اٹھ گیا۔ نہ شہزادے نے استقبالیہ کلمے ادا کئے نہ خالہ صالحہ بانو نے تسلیمات پیش کیں۔ صالحہ بانو نے سیدھے الفاظ میں شہزادے سے کہا۔

"شہزادے بیٹے۔ تمہارا خالو ہیرا بائی کے بدلے میں چتر بائی کو

طلب کرتا ہے۔"

عشق کے مارے شہزادے کی باچھیں کھل گئیں۔ بولے۔

"خالہ جان۔ آپ جس پالکی میں آئی ہیں اس میں چتر بائی کو لے جائیں مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔"

صالحہ بانو نے ایک خواجہ سرا کے ہاتھ ساری باتیں اپنے شوہر سیف خاں کو کہلوا دیں۔ سیف خاں تو پہلے راضی ہو گیا تھا۔ اب تکلف کس بات کا تھا۔ چنانچہ ہیرا بائی، شہزادے اورنگ زیب کے حرم میں آ گئی اور اس کے بدلہ میں چتر بائی، سیف خاں کے حرم میں بھیج دی گئی۔

یہ بیان تھا خان حمید الدین خاں وکیل شہزادہ اورنگ زیب کا اب آئیے دیکھئے کہ اس اہم واقعہ کو ماثر الامراء میں خان زماں کے حالات کے تحت کس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

میر خلیل خاں، اعظم خاں جہانگیری کا دوسرا لڑکا اور آصف خاں کا داماد تھا۔ اپنے باپ کی ہمراہی میں بڑے کارنامے اور معرکے سرانجام دیئے تھے۔ اپنے عظیم کارناموں کے سبب مفتخر خاں، پسدار خاں اور خان زماں کے خطاب پائے۔ شائستہ خاں ناظم دکن کے التماس پر اسے کل دکن کی خدمت وارد گی توپ خانہ بھی تفویض ہوئی۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں خاندیش کا گورنر مقرر ہوا۔ 1095 ہجری میں وفات پائی۔ ہر علم سے بہرہ ور تھا۔ خطاطی میں شہرت رکھتا تھا۔ سلیقہ مند، انشاء پرداز، دانشمند اور معاملہ فہم تھا۔ فن موسیقی میں مہارت تمام رکھتا تھا۔ کاروبار سلطنت میں ہمیشہ منہمک رہنے کے ساتھ شیفتہ راگ و رنگ بھی تھا۔ پری چہرہ گان خوش آواز اور مغنیات عشوہ ساز محلسرا، میں رہتی تھیں۔ مشہور زین آبادی جو اورنگ زیب خلد آشیاں کی ایام شاہزادگی سے محبوبہ اور مرغوبہ تھی۔ اس زمرہ میں شامل ہے بلکہ کہتے ہیں کہ خان زماں کی مدخولہ ہے۔

ایک روز شہزادہ اورنگ زیب، زین آباد برہان پور کے باغ میں

جس کو آہو خانہ کہتے ہیں اپنے اہل کے ساتھ تشریف فرما تھے اور مخصوصان بزم الفت کے ساتھ چہل قدمی فرما رہے تھے۔ زین آبادی نغمہ سنجی میں ہوشربا اور شیوہ دلبری میں یکتا تھی۔ وہ خان زماں کی اہلیہ محترمہ کے ساتھ جو شہزادہ کی خالہ ہوتی تھیں، آئی اور سیر کرنے کے دوران آموں سے لدے ہوئے درخت کو دیکھ کر بغیر شہزادے کا پاس ادب کئے نہایت شوخی اور دلربائی سے اچھل کر ایک آم توڑ لیا۔ اس انداز نے کہ جو سراپا انداز دلبری و دلربائی تھا شہزادے پر خود فراموشی طاری کر دی اور ہوش و پارسائی کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

(شہزادے نے) اپنی خالہ مکرمہ سے بہت اصرار اور ساجت کر کے حاصل کیا اور تمام زہد و ورع خشک اور تنقیہ و تقشف کے باوجود اس کے دلدادہ اور شیفتہ ہو گئے اور شراب کا پیالہ خود اپنے ہاتھ سے بھر بھر کے دیتے تھے۔

کہتے ہیں کہ ایک روز اس نے بھی قدح شراب بھر کر شہزادے کے ہاتھ میں دیا اور پینے پر اصرار کیا۔ ہرچند انہوں نے عجز و نیاز سے کام لیا لیکن اس ظالم نے ایک نہ سنی۔ ناچار شہزادے نے چاہا کہ پی جائے تو اس جادو طراز عیارہ نے خود پیالہ چھین لیا اور کہا۔

فرض تو امتحان محبت تھا نہ یہ کہ اس آب پر شرو شور سے آپ کی تلخ کامی اور بدمزگی۔"

اس عشق بازی نے یہاں تک سر اٹھایا کہ اعلیٰ حضرت شاہجہاں تک اطلاع پہنچی۔ دارا شکوہ کو تو دلی عناد تھا۔ اس مکاتب کو چغل خوری اور شماتت کی بنیاد بنا کر اعلیٰ حضرت سے کہا۔

"اس مکار و ریاکار کو تقویٰ سے کیا کام۔ خود کو خالہ کی ایک کنیز کے پیچھے برباد کر دیا۔"

قضائے الٰہی کہ عین شباب میں بہار زندگی پر خزاں چھا گئی اور شہزادے کو اپنے ابدی ہجر کے داغ میں مبتلا کر دیا۔ اس کا مقبرہ

اورنگ آباد میں تالاب کلاں کے متصل ہے اس کی وفات کے دن شہزادہ کا رنج سے برا حال تھا۔

اورنگ زیب کے اس پہلو کو اجاگر کرنے کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ اورنگ زیب کے بارے میں اس دستاویزی ناول کو "عشقیہ ناول" میں تبدیل کیا جائے بلکہ مقصد یہ بتانا ہے کہ تاریخ عالم کے بڑے بڑے مدبر اور اونچے سے اونچے سیاستدان پر ایسے اوقات اکثر آئے ہیں جب اس نے کسی ذہنی بے چینی سے بچنے کے لئے کسی حسین عورت کا دامن تھاما تھا۔ پس اگر اورنگ زیب پر یہ وقت آیا تو کوئی عجیب بات نہ تھی۔ بڑے بھائی کی شدید مخالفت اور شہنشاہ باپ شاہجہاں کی برابر تنبیہہ نے اورنگ زیب کے دل و دماغ کو اس قدر بے چین اور بے سکون کر دیا تھا کہ کیا عجب اس نے ان الجھنوں سے وقتی فرار اور دل و دماغ کو سکون پہنچانے کے لئے ہیرا بائی (زین آبادی) کے دامن میں سکون حاصل کرنے کی کوشش کی۔

اورنگ زیب ہمیں جوانی کی اس لغزش کے علاوہ ہر دور میں متقی، پرہیز گار، دانشمند، رعیت کا ہمدرد اور مساوات کا قائل نظر آتا ہے۔ اس کے تخت شاہی پر بیٹھنے اور شاہی لباس پہننے کے باوجود اپنی ذاتی زندگی گزارنے کے لئے قرآن حکیم کی کتابت اور ٹوپیوں کی تیاری اس کے کردار کا ایک انتہائی اہم حصہ ہیں جو اسے تمام مغل شہنشاہوں سے منفرد اور اعلیٰ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔

انتظامی اور اقتصادی بد حالی

اورنگ زیب دس سال کے بعد دکن بھیجا گیا تھا۔ وہاں کے انتظامی امور اور اقتصادی حالات اس قدر بگڑ چکے تھے جن کا ایک دو سال میں درست ہونا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اس سلسلہ میں اورنگ زیب نے دکن کے "آمد و خرچ" میں توازن پیدا کرنے کے لئے بادشاہ کو چند جاگیریں ضبط کرنے کا مشورہ دیا مگر شاہجہاں نے اسے قبول نہ کیا۔

آخر اورنگ زیب نے دکن کے حالات کو ایک چیلنج سمجھ کر خود انہیں درست کرنے کا فیصلہ کیا۔ خوش قسمتی سے انہیں مرشد قلی خاں جیسا دیانت دار اور ماہر مالیات کا تعاون حاصل ہوا۔ یہ وہی مرشد قلی خاں ہے جس نے "ہیرا بائی" کے معاملہ میں سیف خاں کو راستے سے ہٹانے کے لئے اپنی خدمات پیش کی تھیں۔

مرشد قلی خاں کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ سپاہی پیشہ ور ترکوں میں سے تھے۔ انہوں نے قندھار کی سپردگی کے وقت مغلوں کی ملازمت اختیار کی تھی اور مختلف خدمات انجام دینے کے بعد دکن کے دیوان بنائے گئے تھے۔ اورنگ زیب ان سے بہت خوش تھا اور اس نے انہیں "خان" کا خطاب دلوایا تھا۔

اورنگ زیب نے جس وقت اصلاحات کا آغاز کیا تو دکن میں کوئی صحیح بندوبست رائج نہ تھا۔ نہ زمین کی پیائش کی گئی تھی اور نہ کوئی مالیہ کا مستقل طریقہ تھا۔ اورنگ زیب نے اس کام پر مرشد قلی خاں کو لگایا۔ اس نے سب سے پہلے غیر آباد دیہاتوں کو آباد کرنے پر توجہ دی۔ کاشتکار مسلسل جنگوں سے تنگ آ کے اپنے گھربار چھوڑ گئے تھے۔ مرشد قلی خاں نے انہیں ڈھونڈا اور ان کے گھروں میں لا کے آباد کیا۔ پھر زمین کی پیائش کی اور لگان زمین کی ساخت کے مطابق لگایا۔ ہر گاؤں میں مقدم مقرر ہوئے۔

مرشد قلی خاں کی اصلاحات کا اثر پورے دکن پر پڑا۔ چند سال بعد دیہات آباد ہو گئے۔ ملک کی زرعی حالت بدل گئی اور ہر طرف ہریالی ہی ہریالی دکھائی دینے لگی۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں مرشد قلی خاں کی کوششوں سے ایک روپے میں ڈھائی من گندم اور ساڑھے تین من باجرہ اور مکئی خریدی جا سکتی تھی اور گھی ایک روپے میں چار سیر ملتا تھا۔

نظم و نسق کو درست رکھنے کے لئے اورنگ زیب نے جگہ جگہ اپنے اعتماد کے آدمی مقرر کئے۔ سپاہیوں کی تنخواہیں کم کر دی گئی تھیں' اورنگ زیب نے باپ سے سفارش کر کے ان میں اضافہ کرایا۔ بعض چھوٹے جاگیردار جو وفادار اور کام کے آدمی تھے ان کی جاگیروں میں اضافہ کیا اور وہ جاگیردار جو حکومت کا کوئی کام نہیں کرتے تھے بلکہ حکومت پر بوجھ بنے ہوئے تھے ان کی جاگیریں باپ کے حکم سے ضبط کر لیں۔ اس طرح اورنگ زیب کی خوش سلیقگی کی وجہ سے دکن کا نظم و نسق درست ہو گیا۔

اختلافات

اورنگ زیب نے اگرچہ دکن کے اقتصادی اور انتظامی معاملات بہت جلد درست کر لئے تھے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں اس سے پھر بھی خوش نہ تھا۔ اورنگ زیب اسے باقاعدگی اور با ادب انداز میں خط بھیجتا تھا اور اسے دکن کے حالات سے باخبر رکھتا تھا مگر شاہجہاں اپنے ہر خط میں اورنگ زیب کو کوئی ایسی چبھتی ہوئی لکھ دیتا تھا جس سے اورنگ زیب کا مزاج برہم ہو جاتا پر وہ پھر بھی ضبط کر جایا کرتا تھا۔

یہ کتنی سی معمولی بات تھی کہ اورنگ زیب سال کے سال شاہجہاں کو اس کے پسند کے آم بھیجا کرتا تھا۔ جس درخت کے آم شاہجہاں کو بہت پسند تھے اس کی تمام شاخیں سوائے ایک کے آندھی سے ٹوٹ کے گر گئی تھی چنانچہ آم کم ہوتے تھے اس نے بادشاہ کو کیفیت سے آگاہ بھی کر دیا تھا' اس کے باوجود اس نے اورنگ زیب کو لکھ بھیجا کہ اس نے بادشاہ پسند آم بھیجنے پر زیادہ توجہ نہیں دی اس لئے بادشاہ کی طرف سے ایک آدمی مقرر کیا جاتا ہے جو اپنی نگرانی میں آم تڑوا کر بادشاہ کو بھیجا کرے گا۔ یہ کتنی معمولی سی بات تھی مگر بادشاہ نے بات کا بتنگڑ بنا دیا تھا۔

اسی طرح ایک بار شاہجہاں سے شکایت کی گئی کہ اورنگ زیب نے اچھی اچھی جاگیریں خود لی ہیں اور خراب جاگیریں دوسروں میں تقسیم کی ہیں نیز اس نے چالیس لاکھ دام زیادہ وصول کر لئے ہیں۔ اورنگ زیب نے اچھی جاگیر خود حاصل کرنے کی تردید کی اور چالیس لاکھ دام کے سلسلے میں یہ وضاحت کی یہ رقم اس جاگیر سے حاصل ہوئی ہے جو بادشاہ

نے اسے (اورنگ زیب) کو اس کے دکن پہنچنے سے پہلے عطا کر دی تھی۔

اس سلسلہ میں اورنگ زیب نے دبے الفاظ اور مہذب انداز میں شکوہ کیا کہ یہ تعجب کی بات ہے۔ دیوان نے حضور عالی سے بات عرض نہیں بلکہ دستور اعظم کا بادشاہ کو اس بات سے آگاہ نہ کرنا بڑا تعجب خیز ہے اس لئے کہ ان کا حافظہ بہت تیز ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہیں بادشاہ کے سامنے ایسی باتیں پیش کرنے کا حوصلہ نہ ہوا ہو۔ یہ دبے ہوئے شکوہ نے بادشاہ کا دل تو صاف کیا ہو گا مگر انہوں نے خط کے ذریعہ اورنگ زیب کو اس بارے میں کچھ نہ لکھا۔ اصل بات یہ تھی دارا شکوہ اتنی دور بیٹھ کے بھی اورنگ زیب کو چین نہ لینے دیتے تھے اور اسے بادشاہ کی نظروں میں گرانے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔

دکنی ریاستوں پر حملے

اورنگ زیب نے مذہبی اختلاف سے بلند ہو کے دکن کے بعض زمینداروں اور ریاستوں پر حملے کئے۔ ان حملوں اور فتوحات میں کبھی اورنگ زیب کی مرضی شامل ہوتی تھی اور کبھی شاہی فرمان کے تحت اسے حملہ اور قبضہ کرنا پڑتا تھا۔ جب دکن کی کسی ریاست پر حملہ کا حکم بادشاہ کی طرف سے نازل ہوتا تو وہ پہلے اپنے طور پر اس ریاست کے بارے میں غور کرتا۔ اگر حملہ مناسب نہ ہوتا تو وہ باپ کو خط لکھ کر اس کی مدلل مخالفت کرتا اور جب دارا شکوہ کی وجہ سے شاہی دربار میں اس کی بات پر توجہ نہ دی جاتی تو اسے مجبور ہو کے شاہی حکم کی تعمیل کرنی پڑتی۔

دیوگڑھ پر فوج کشی

اورنگ زیب دیوگڑھ پر حملہ کا مخالف تھا اس سلسلہ میں باپ بیٹے میں طویل خط و کتابت ہوئی۔ بادشاہ کا اصرار تھا کہ راجہ دیوگڑھ کے پاس دو سو ہاتھی ہیں۔ بادشاہ نے اورنگ زیب کو یہ بھی لکھا کہ خان دوراں مرحوم نے دیوگڑھ پر حملہ کیا تھا تو اسے وہاں سے ایک سو سے زیادہ ہاتھی ملے تھے۔ اورنگ زیب نے باپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ

دیوگڑھ کا راجہ واقعی غریب ہے۔ اس کے پاس بیس ہاتھی بھی نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ خان دوراں نے راجہ کے باپ کے زمانہ میں حملہ کیا تھا۔ اس وقت وہاں سو سے زیادہ ہاتھی تھے۔ نیز یہ کہ اس نے اپنا ایک آدمی ریاست میں بھیج کے تصدیق کرائی ہے راجہ کے پاس بیس سے کم ہاتھی ہیں۔

لیکن بادشاہ نے جو پوری طرح دارا شکوہ کے زیر اثر تھا' اورنگ زیب کو حکم بھیجا کہ صوبہ برار کے ناظم مرزا خاں اور صوبہ تلنگانہ صوبیدار ہادی داد خاں کی سرکردگی میں شاہی دستے دیوگڑھ پر فوج کشی کریں۔ چنانچہ اورنگ زیب کو حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔

دیوگڑھ پر اس دو طرف سے حملہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ راجہ کیرت سنگھ فوراً" مرزا خاں کے سامنے پیش ہوا اور ماضی کی غلطی کی معافی مانگی اور آئندہ کے لئے وعدہ کیا کہ کبھی حکم عدولی نہ کرے گا۔ مرزا خاں وہاں سے واپس آیا تو راجہ کیرت اس کے ساتھ تھا۔ اورنگ زیب نے راجہ کے ساتھ ایسے حسن سلوک کا مظاہرہ کیا کہ راجہ اس کے دربار میں رو پڑا۔ دیوگڑھ کی ریاست سے شاہی لشکر کو صرف بیس ہاتھی ہاتھ لگے۔ راجہ کے پاس نقد رقم تو تھی ہی نہیں کہ وہ کوئی ادائیگی کرتا۔

کرناٹک کا احوال

کرناٹک جنوبی ہند میں ایک چھوٹی مگر دولت مند ریاست تھی۔ اس ریاست کے قریب ہی گولکنڈہ اور بیجا پور کی دو بڑی مسلمان ریاستیں تھیں جو کرناٹک کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے آئے دن نوچتی کھسوٹتی رہتی تھیں۔ وہاں کا راجہ رام راج تھا جس میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ خود کو ان بڑی ریاستوں سے محفوظ رکھ سکے۔ چنانچہ وہ گولکنڈہ اور بیجا پور کے بے جا مطالبات پورے کر دیا کرتا تھا۔

گولکنڈہ کے قطب الملک اور بیجا پور کے عادل خاں نے شہنشاہ ہند شاہجہاں سے صلح کے معاہدے کرنے کے بعد ہندو راجہ کرناٹک کو خوب لوٹا تھا اور اس سے نقد رقم کے علاوہ جواہرات اور ہاتھی بھی حاصل کر لئے تھے۔ آخر راجہ رام راج نے تنگ آ کر دکن کے نائب السلطنت اورنگ زیب کے پاس اپنے نواسے سری رنگ رائل اور نواسی سری داسی کو

قاصد بنا کے بھیجا۔

راجہ کرناٹک کے نواسے اور نواسی اورنگ زیب کے دربار میں پیش ہوئے تو وہ ان کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آیا۔ بہن بھائی دونوں نے سلام کرنے کے بجائے شہزادے کو سجدہ کیا۔ اورنگ زیب فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کے کھڑا ہو گیا اور سختی سے بولا۔

"تم دونوں یہ کیا بے ہودگی کر رہے ہو؟"

دونوں نے سجدے سے سر اٹھایا اور سری رنگ رائل نے گھبرائے لہجے میں کہا۔

"ان داتا۔ ہم نے آپ کو نمستے اور نمسکار پیش کیا ہے اگر ہم سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو ہمیں معاف کر دیجئے۔"

اورنگ زیب نرم پڑ گیا اور بولا۔

"تم نے غلطی کوئی نہیں کی مگر تمہارے سلام کا یہ طریقہ غلط ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور ہمارے مذہب میں کسی انسان کو سجدہ کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔"

اورنگ زیب کو نرم پا کر سری رنگ رائل کو حوصلہ ہوا۔ اس نے جواب دیا۔

"ان داتا۔ آخر بادشاہ بھگوان کا اوتار ہوتا ہے۔ جب ہم بھگوان کو سجدہ کرتے ہیں تو اس کے اوتار کو سجدے کرنے سے گناہ کیوں ہو سکتا ہے؟"

اورنگ زیب اور زیادہ نرم ہو گیا۔ اس نے پوچھا۔

"اچھا پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام سری رنگ رائل ہے ان داتا۔" رنگ رائل نے سنبھل کے جواب دیا۔ "اور میرے ساتھ یہ میری بہن سری داسی ہے۔ ہم دونوں کرناٹک کے راجہ رام راج کے نواسے اور نواسی ہیں اور اپنے نانا کی درخواست لے کر ان داتا کے دربار میں حاضر ہوئے ہیں۔"

اورنگ زیب نے سری داسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"رنگ رائل تم تو راجہ کی درخواست لے کر آئے ہو مگر اپنی جوان بہن کیوں ساتھ لائے ہو؟"

سری رنگ رائل نے افسردگی سے کہا۔

"ان داتا۔ پتہ نہیں بھگوان نے اس دنیا میں کمزور کیوں پیدا کئے ہیں۔ اس نے اگر

سب کو طاقتور بنایا ہوتا تو پھر کوئی کسی پر زیادتی نہ کر پاتا۔ گولکنڈہ اور بیجاپور کے سوار ہماری ریاست میں روز گھس آتے ہیں اور جو جی چاہتا ہے' لوٹ کے لے جاتے ہیں۔ بہت سے سوار راج محل تک پہنچ جاتے ہیں۔ ہم انہیں کچھ دے دلا کر بڑی مشکل سے اپنی جان چھڑاتے ہیں۔ کسی دن اگر وہ راج محل میں گھس آئے تو خطرہ ہے کہ وہ ہماری اس عزت کو بھی اٹھا لے جائیں گے اور ہم ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ اس لئے مہاراج رام راج نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ سے درخواست کروں کہ آپ ہماری اس عزت کی حفاظت کریں اور اسے اپنی پناہ میں لے کر ہماری ایک بڑی مشکل آسان کریں۔"

اورنگ زیب اس کی گفتگو سے بہت متاثر ہوا۔ مگر گہری فکر میں بھی ڈوب گیا۔ اسے فوراً اپنی جوانی کا ہیرا بائی والا معاملہ یاد آ گیا۔ اس سلسلہ میں دارا شکوہ نے اسے کس قدر بدنام کیا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر میں نے اس جوان اور نک سک سے درست لڑکی کو پناہ دی تو پھر کوئی نیا ہنگامہ نہ کھڑا ہو جائے۔ اس لئے اس نے اس سے دامن چھڑانا ہی بہتر خیال کیا۔

اورنگ زیب نے سری رنگ رائل کو جواب دیا۔

"رنگ رائل۔ تم جانتے ہو کہ میں دکن میں سلطنت مغلیہ کا نائب السلطنت ہوں۔ مجھے ہر معاملہ میں پورے اختیارات حاصل نہیں۔ کرناٹک کے راجہ رام راج کے بارے میں ہمیں زیادہ معلومات نہیں۔ تم بتاؤ کہ راجہ رام راج ہم سے کیا چاہتا ہے؟"

رنگ رائل نے کہا۔

"ہمارے مہاراج کی ایک درخواست تو یہی ہے کہ اس لڑکی کو اپنی پناہ میں لیا جائے اور دوسری درخواست یہ ہے کہ گولکنڈہ اور بیجاپور کی ریاستوں کو سختی سے تاکید کی جائے کہ کرناٹک پر دست درازیاں بند کر دیں۔"

اورنگ زیب کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"رنگ رائل۔ اگر یہ بات سچ ہے جس کی تصدیق ہم اپنے طور پر بھی کر لیں گے کہ گولکنڈہ اور بیجاپور والے تمہاری ریاست میں گڑبڑ کرتے اور بلا وجہ ہی رقم بٹور لے جاتے ہیں تو ہم انسانی ہمدردی کے طور پر انہیں اس حرکت سے باز آنے کی تاکید کریں گے لیکن شاید تم یہ بات نہیں جانتے کہ ان دونوں مسلم ریاستوں سے ہمارے صلح کے معاہدے ہیں

اس لئے ہم انہیں دوستانہ طور پر تاکید تو کر سکتے ہیں مگر ان پر زور نہیں دے سکتے۔"

"ان داتا۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" رنگ رائل نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔ "پورے دکن میں یہ بات مشہور ہے کہ مسلمان ہر ظالم کے خلاف مظلوم کی مدد کرتے ہیں خواہ ظلم ڈھانے والا ان کا بیٹا یا باپ ہی کیوں نہ ہو۔ آپ تحقیقات کر کے دیکھ لیجئے اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ وہ دونوں نظالم ہیں تو کیا پھر بھی آپ ہماری مدد نہیں کریں گے؟؟"

رنگ رائل نے اورنگ زیب کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اسلام کا تو بنیادی اصول ہی یہ تھا کہ مظلوم کو ظالم کے ہاتھوں سے بچایا جائے اور لوگوں کے درمیان مساوات پیدا کی جائے۔ اورنگ زیب اسے جواب دینے کے لئے کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ رنگ رائل نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے ایک خوبصورت پیشکش کر دی۔

"ان داتا۔ ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنی بات کو اور واضح کر کے مکمل کروں؟؟"

"ٹھیک ہے۔ تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہہ ڈالو۔" اورنگ زیب نے بڑی نرمی سے کہا۔ "تم مغل شہنشاہ کے دربار میں ظالموں کے خلاف فریاد لے کے آئے ہو اور میں دکن میں مغل سلطنت کا نائب اور نمائندہ ہوں اس لئے تمہاری تمام باتیں سنوں گا اور شہنشاہ سے سفارش کروں گا کہ کرناٹک کے معاملہ پر ہمدردانہ غور فرمایا جائے۔"

"مجھے مہاراج رام راج نے حکم دیا ہے کہ میں ان داتا کی خدمت میں یہ پیش کش بھی کروں کہ اگر ان داتا نے دونوں ریاستوں کو یہ فرمان جاری کر دیا کہ وہ کرناٹک پر دست درازیاں بند کر دیں تو کرناٹک کے مہاراج شکرانہ کے طور پر ان داتا کی خدمت میں پچاس لاکھ نقد اور دو سو ہاتھیوں کا نذرانہ پیش کریں گے۔" رنگ رائل نے بڑی عظیم پیش کش کی تھی۔

اورنگ زیب نے پیش کش کا یہ جواب دیا۔

"رنگ رائل۔ تم فکر نہ کرو۔ ہم رام راج کی درخواست شہنشاہ تک پہنچا دیں گے اور اس میں پیش کش کا ذکر بھی کر دیں گے مگر فیصلہ کرنے کے مجاز صرف شہنشاہ ہیں۔ ہم اس سلسلہ میں وہاں کے حکم کے مطابق ہی قدم اٹھا سکتے ہیں۔"

رنگ رائل جلدی سے بولا۔

"ان داتا۔ میں ایک اور بات کہنا بھول گیا۔ وہ بات یہ ہے کہ آپ شکرانہ کی اس پیش کش کے ساتھ شہنشاہ بہادر سے یہ بھی لکھ بھیجئے کہ اگر شہنشاہ یوں مدد کرنا پسند نہ کریں تو ہم سب مسلمان ہونے پر بھی تیار ہیں۔"

اورنگ زیب اس پیش کش پر چونک پڑا۔

"تم بالکل بے فکر رہو۔" اورنگ زیب نے اسے اطمینان دلایا۔ "ہمارا خیال ہے کہ شہنشاہ تمہاری ضرور مدد کریں گے۔"

"پھر میرے لئے کیا حکم ہے ان داتا؟" رنگ رائل نے دریافت کیا۔

اورنگ زیب نے اسے زیادہ مطمئن کرنے کے لئے کہا۔

"ہم شہنشاہ کو تمہارے مہاراج کی درخواست بھیج رہے ہیں۔ وہاں سے جواب آنے تک تم ہمارے مہمان ہو۔"

"کیا میرے ساتھ میری بہن بھی رہ سکتی ہے؟" رنگ رائل نے پوچھا۔

"یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔" اورنگ زیب نے کہا۔ "تم بہن کو ساتھ بھی رکھ سکتے ہو یا پھر ہم اسے کسی ایسے امیر کی حویلی میں بھیج سکتے ہیں جہاں خواتین موجود ہوں اور اسے تنہائی محسوس نہ ہو۔"

"ان داتا۔ اگر ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔" رنگ رائل فوراً مان گیا۔ "یہاں سری داسی ضرور گھبرائے گی مگر دوسری بیگمات کے ساتھ اسے تنہائی محسوس نہ ہو گی۔"

اورنگ زیب نے دربار میں امراء اور سرداروں پر نظر ڈالی۔ پھر ایک جگہ نظریں روک کے بولا۔

"امیر عبد المعبود۔ کیا تم یہ پسند کرو گے کہ کرناٹک کی راجکماری کو چند دن اپنے گھر میں بطور مہمان رکھ لو۔"

"بسرو چشم۔ عبد المعبود نے خوش دلی سے کہا۔ "میں راجکماری کی مہمان نوازی کو اپنے لئے فخر سمجھوں گا۔ میری لڑکیاں اور گھر کی دوسری خواتین راجکماری کو شاہی مہمان کا درجہ دیں گی۔"

اورنگ زیب کو راجہ کرناٹک سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ اس لئے اس نے راجہ کے نواسے سری رنگ رائل کو شاہی مہمان خانہ بھجوا دیا اور اس کی بہن سری داسی کو امیر عبد

المعبود کے ساتھ اس کے گھر بھیج دیا کہ جب تک کرناٹک کا کوئی فیصلہ نہیں ہوتا بہن بھائی اورنگ زیب کی پناہ میں رہیں۔ پھر شہزادے اورنگ زیب نے شہنشاہ ہند کو ایک تفصیلی خط لکھا اور بڑے پر جوش الفاظ میں راجہ کرناٹک کی مدد کی سفارش کی۔ بادشاہ کو یہ بھی اطلاع دی کہ :-

"راجہ کی خواہش ہے کہ اگر شہنشاہ اس کی مدد پر متوجہ ہو جائیں تو راجہ شکرانہ کے طور پر پچاس لاکھ نقد اور دو سو ہاتھی حضور شاہی میں پیش کرے گا نیز یہ کہ اگر شہنشاہ یوں مدد کرنا پسند نہ فرمائیں تو وہ مسلمان ہونے کو تیار ہے۔"

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ بعض تاریخی روائتوں کے مطابق راجہ کرناٹک نے جو درخواست شہزادے اورنگ زیب سے کی تھی اسے لے کر راجہ کا ایک معتمد آیا تھا۔ جبکہ ایک جگہ یہ بھی ہے کہ درخواست لانے والا راجہ کرناٹک کا نواسہ تھا جس کے ساتھ اس کی بہن آئی تھی۔

مگر شہنشاہ شاہجہاں کو دارا شکوہ اپنے ہاتھوں پر لئے ہوئے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اورنگ زیب کی پوزیشن دکن میں مضبوط ہو اس لئے اس نے شہنشاہ سے اورنگ زیب کو حکم بھجوا دیا کہ اس سلسلہ میں راجہ کرناٹک سے مزید گفتگو کی ضرورت نہیں۔

شہزادہ اورنگ زیب اپنی عمر کے ساتھ ساتھ مذہبی امور کی طرف زیادہ جھکتا جا رہا تھا۔ چنانچہ مشہور ہے کہ جو مذہب بادشاہ کا وہ رعایا کا تھا۔ اورنگ زیب کے مذہبی جھکاؤ کو دیکھ کے اس کے تمام امراء دوسرے متعلقین بھی مذہب کی طرف دل سے یا پھر مصلحتاً" متوجہ ہو گئے تھے۔ عبد المعبود شہزادے کا بہت زیادہ اعتماد کا آدمی تھا۔ شاید اسی لئے وہ نماز کا اس قدر پابند تھا کہ اذان کی آواز بلند ہوتے ہی وہ کام چھوڑ کے اٹھ کھڑا ہوتا۔ ایک نظر اپنے آقا اورنگ زیب پر ڈالتا پھر سیدھا ہو کر مسجد کی سمت لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگتا۔ شہزادہ اگر ضروری کام میں مصروف نہ ہوتا تو عبد المعبود کے دیکھتے ہی اس کے ساتھ چل پڑتا یا پھر اسے اشارہ کر دیتا کہ وہ مسجد چلے اور وہ فورا" آجائے گا۔

عبد المعبود کا گھرانہ بھی اس کی وجہ سے نمازی ہو گیا تھا۔ اس کی بیوی دو جوان لڑکیاں سب کے سب نمازی تھے۔ ان کے صرف ایک لڑکا تھا' عبد الودود۔ دیکھنے میں اچھا

خاصا جوان مگر طبیعت کچھ عجیب سی پائی تھی۔ گھر میں رہتا تو پھر ہفتوں گھر ہی میں اور کسی دن گھر سے نکلے تو اس طرح جیسے جنگ پر جا رہے ہیں۔ کمر میں تلوار' شانہ پر تیر کمان اور سر پر آڑی پگڑی۔ عبد الودود اپنی پگڑی کے کناروں پر سرخ رنگ کی ایک پٹی ٹکواتا تھا جو جھالر کی طرح اس کی پیشانی اور کانوں پر جھولتی رہتی تھی۔

ودود کو ایک خوبصورت اور وجیہہ جوان کہا جا سکتا تھا مگر لا ابالی طبیعت نے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا تھا۔ آج ایک ہفتہ بعد وہ گھر واپس آیا تھا۔ مگر گھر میں داخل ہوتے ہی جیسے اس کے قدم کسی نے روک لئے۔ اس پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ وہ گھر میں داخل ہوا تو حسب معمول تھا اور شاید مسکرا بھی رہا تھا گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر جو سامنے اٹھی تو بس ایک جگہ جم کے رہ گئی۔

دراصل یہ دو نظروں کا ٹکراؤ تھا۔ نظریں بھی جوان۔ ایک طرف وہ ہندو دوشیزہ تھی جو اپنی جگہ ایک سنگ مرمر کی مورتی کی طرح جم کے رہ گئی تھی۔ یہ دوشیزہ کنواری کنیا کرناٹک کے راجہ رام راج کی پیاری بیٹی راجکماری سری داسی تھی جو نزاکت اور لطافت میں باد بہاری سے کسی طرح کم نہ تھی۔ اس کا تراشا ہوا بدن اور کھنچی ہوئی چتونیں کسی وحشی ہرن سے ملتی جلتی معلوم ہوتی تھیں مگر اس وقت ساکت ہو کر امیرزادہ ودود کے چہرے پر ٹھہر گئی تھیں۔

امیرزادہ ودود اپنی جگہ حیران پریشان کھڑا قدرت کے اس حسین پیکر کو دیکھ رہا تھا جیسے یہ اس کے لئے کوئی عجوبہ ہو۔ یا پھر یہ کچھ ایسا تھا جیسے اس نے اس سے پہلے کسی ایسی صورت کو دیکھا ہی نہ تھا اور جب دیکھا تو اس کے تمام حواس اور توجہ سری داسی کے چہرے کا طواف کرنے لگی۔ نظروں کا یہ بیباک تصادم ممکن تھا کہ کوئی اور صورت اختیار کرتا کہ امیرزادہ ودود کی چھوٹی بہن نگارش ان کے درمیان حائل ہو گئی۔

"ودود بھائی۔" نگارش نے مسکراتے اور ودود کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "یہ۔ یہ۔ یہ ہیں کرناٹک کی راجکماری سری داسی۔"

ودود کو جیسے ایک جھٹکا سا لگا۔ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "راجکماری اور ہمارے گھر میں۔ میں سمجھا نہیں نگارش؟"

نگارش نے وضاحت کی۔

"جی ہاں بھائی جان۔ راجکماری ہماری مہمان ہیں ابا جان نے انہیں دو ماہ خالہ جان کے گھر رکھا تھا اور اب یہ یہاں آگئی ہیں۔ یہ ہمارے پاس رہیں گی۔"

"کیوں۔ کیوں۔ کیوں رہیں گی یہاں۔" ودود کو جیسے یقین نہ آیا۔ "مہمان تو-----" اور ودود کہتے کہتے رک گیا۔

نگارش شوخی سے بولی۔

"کیوں بھائی جان۔ کیا آپ کو ان کا یہاں رہنا پسند نہیں؟"

"نہیں نہیں۔" ودود نے سنبھل کے کہا۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ یہ مہمان۔ ہاں مہمان--- ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ میں یہی تو کہہ رہا تھا۔ یہ بہت---"

سری داسی اس وقت تک خود کو سنبھال چکی تھی۔ وہ نظریں نیچی کئے ہوئے نگارش کے پاس آئی اور دبے لفظوں میں بولی۔

"نگار یہ تمہارے بھیا ہیں؟" سری داسی نگارش کو لگا رہی تھی۔

"کیا تمہیں شبہ ہے کچھ۔" نگارش نے سری داسی کو گھورا۔

سری داسی گھبرا گئی۔

"نہیں نہیں شبہ کیسا۔ میں تو یہ پوچھ رہی تھی کہ کیا یہ تمہارے سگے بھائی ہیں؟"

"سری داسی کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" نگارش اٹھلا کے بولی۔ "اگر یہ میرے بھائی نہ ہوتے تو میں ان کے سامنے کیوں آتی۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ میں سب سے پردہ کرتی ہوں۔"

سری داسی کو بھی شوخی سوجھی۔ اس نے کہا۔

"ہاں میں جانتی ہوں۔ تم یہ بھی تو کہتی ہو کہ پردہ اچھی چیز ہے۔ لڑکیوں کو مردوں سے پردہ کرنا چاہئے۔ کیوں کہا تھا نہ تم نے؟"

"ہاں ہاں کہا تھا میں نے۔" نگارش نے تائید کی۔ "کوئی بری بات تو نہیں ہے؟"

سری داسی نے فوراً اپنی دھوتی نما ساری کے پلو کو اپنے منہ پر کھینچ لیا اور کہا۔

"دیکھو۔ میں نے بھی پردہ کر لیا ہے۔ اب تم ناراض تو نہیں ہو گی؟"

"سری داسی---" نگارش گھبرا گئی۔ "مگر میں نے بھیا سے تو پردہ کرنے کو نہیں کہا تھا۔"

"پھر کس سے پردہ کرنے کو کہا تھا؟" اب سری داسی نے نگارش کو چھیڑنا شروع کیا۔

"تم نے کہا تھا لڑکیوں کو غیر مرد کے سامنے نہیں آنا چاہئے۔"

"مگر بھیا غیر کب ہیں؟" نگارش چیخ کے بولی۔ "میرے بھیا ایسے ویسے نہیں ہیں یہ تو بہت مغرور ہیں۔ کسی سے بات تک نہیں کرتے۔"

سری داسی نے ہلکی سی سانس لی۔ پھر بولی۔

"یہ تو اچھا ہوا۔ تم نے پہلے ہی موقعہ پر بتا دیا۔ مغرور آدمی چڑچڑے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے پردہ رہے تو زیادہ اچھا ہے۔"

"نہیں نہیں۔ میں مغرور نہیں ہوں۔" ودود نے فوراً اپنا دفاع کیا۔ "نگارش نے بس یوں ہی کہہ دیا ہے۔ غرور کو تو میں اپنے پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتا۔"

اور سری داسی اس کی بات پر پلو کے پیچھے ہنسنے لگی۔ نگارش کھسیانی ہو گئی۔

"بھیا تم نے تو مجھے---" نگارش کہتے کہتے رکی۔ "تم نے تو کہا تھا کہ میں ایسی ویسی لڑکیوں کو منہ نہیں لگاتا۔ تم نے یہ بھی کہا تھا کہ میں خود بھی ایسا ویسا نہیں ہوں۔ اب کیوں مکر رہے ہو۔"

"دیکھو نگارش۔" ودود سنبھل کے بولا۔ "تمہارے کہنے کے مطابق یہ راجکماری ہیں--- اور--- اور---" ودود کی نظر اچانک سری داسی کے آدھے چھپے ہوئے چہرے پر پڑی۔ اسے محسوس ہوا جیسے سری داسی ناراض ہو گئی ہے۔ اس لئے وہ خاموش ہو گیا۔

"چپ کیوں ہو گئے بھیا۔" نگارش کو باتوں میں لطف آ رہا تھا۔ ودود واقعی بہت کم بولتا تھا۔ لڑکیوں سے تو وہ دور ہی دور رہتا۔ ایک دن دیوان جی کی تین تین بیٹیاں ایک ساتھ اس کے گھر آگئیں۔ وہ شوخ و شنگ تھیں۔ انہوں نے ہنس ہنس کے اور قہقہے لگا لگا کر پورا گھر سر پر اٹھا لیا۔ مگر ودود کو جیسے غصہ آگیا تھا۔ اس نے واقعی کسی لڑکی سے بات تک نہیں کی حالانکہ امیر عبد المعبود یہ چاہتے تھے کہ دیوان جی کے یہاں آنا جانا ہوتا رہے تاکہ ودود کی یہ تنہائی، لا ابالی پن اور اکھڑپن طبیعت میں کچھ رنگینی پیدا ہو مگر ودود نے کسی کو بھی منہ نہیں لگایا۔

"بتاؤ نہ بھیا۔ چپ کیوں ہو گئے؟" نگارش نے پھر چھیڑا۔

ودود نے کنکھیوں سے سری داسی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہاری راجکماری ناراض ہو گئی ہیں۔"

نگارش گھبرا گئی۔ اس وقت تو ہنسی کی باتیں ہو رہی تھیں پھر راجکماری ناراض کیوں ہو گئی۔ اس نے راجکماری سے فوراً معذرت کی۔

"راجکماری سری داسی۔ میں معافی چاہتی ہوں۔ کوئی غلطی ہو گئی ہے شاید ہم سے؟"

سری داسی ایک دم ہنس پڑی۔

"نگار۔ میں کیوں ناراض ہونے لگی۔ میں تو تمہاری احسان مند ہوں کہ تم لوگ میرا اس قدر خیال رکھتے ہو۔ چاچا جی۔ چاچی جی مجھے تم لوگوں سے کم تو نہیں چاہتیں۔"

اتنے میں نگارش کی دوسری بہن پرتو آتی دکھائی دی۔ پرتو اور نگارش میں صرف ایک سال کا فرق تھا۔ وہ عمر میں نگارش سے بڑی تھی مگر دیکھنے میں چھوٹی معلوم ہوتی تھی۔ ودود دونوں بہنوں سے بڑا تھا۔ پرتو کو آتا دیکھ کر سب ہی خاموش ہو گئے۔

پرتو اپنی چھوٹی بہن نگارش سے بھی زیادہ شوخ مزاج تھی۔ اس نے دور ہی ان لوگوں کو دیکھ لیا تھا۔ قریب آ کے بولی۔

"یہ ودود بھائی آج صبح ہی صبح کہاں سے آ گئے۔ کہیں عید کا چاند تو نہیں نکلا ہے؟"

"شاید پرتو ٹھیک کہہ رہی ہے۔" ودود نے دخل دیا۔ "چاند باہر نہیں بلکہ ہمارے گھر میں نکلا ہے۔ میں چاند ہی تو دیکھنے آیا ہوں۔"

"مگر بھیا۔ یہ راجکماری سری داسی ہیں۔" پرتو نے بھائی کو خبردار کیا۔ "راجہ کرناٹک کی نواسی۔ انہیں ناراض نہ کیجئے گا ورنہ ابا جان آپ کو معاف نہ کریں گے۔"

"پرتو---" سری داسی بولی۔ "تم بھی مجھے بنانے لگیں۔ میں کوئی چھوئی موئی تو نہیں ہوں کہ ہاتھ لگانے سے مرجھا جاؤں گی۔ میں کسی سے کیوں ناراض ہونے لگی۔ تم لوگ میرا کتنا خیال کرتے ہو۔ میں کتنی مجبور ہوں۔ تمہارے لئے کچھ بھی تو نہیں کر سکتی۔"

"نا--- نا--- ایسی بات نہیں کہتے سری داسی---" نگارش نے اسے روکا۔ "تمہارے آنے سے تو ہمارے گھر میں رونق آ گئی ہے۔ سچ کہتی ہوں بھیا ودود پندرہ پندرہ دن دکھائی نہیں دیتے۔ آج تو یہ چھٹے دن آ گئے ہیں---"

"اور شاید اب یہ چھ دن تک یہیں رہیں گے۔" پرتو نے ٹکڑا لگایا۔

"کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ ضرور رہیں گے۔" ودود نے فوری تائید کر دی۔ "ارے

مجھے بھوک لگی ہے۔ یہیں کھڑا رکھو گی کہ اندر بھی چلو گی۔"

پھر سب کے سب برآمدے سے گزر کر حویلی کے بڑے ہال میں چلے گئے۔ یہ لوگ ابھی آ کے بیٹھے ہی تھے کہ بچوں کے والد امیر عبد المعبود آ گئے۔ خلاف امید بیٹے کو گھر میں دیکھ کے بہت خوش ہوئے۔

"ودود تم کب آئے بیٹے؟" باپ نے محبت سے پوچھا۔

"آج ہی آیا ہوں بلکہ ابھی ابھی آیا ہوں بابا جان۔" ودود نے بھی اسی محبت سے جواب دیا۔

"کتنی دیر ٹھہرنا ہے گھر میں؟" باپ نے دوسرا سوال کیا۔

ودود گھبرایا۔ اس نے کنکھیوں سے سری داسی کو دیکھا پھر سنبھل کے کہا۔

"ابا جان کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں ابھی چلا جاؤں۔"

امیر عبد المعبود نے بیٹے کی نظر سری داسی کی طرف آتے جاتے دیکھ لی تھی۔ چنانچہ اس نے کہا۔

"میرا مطلب یہ ہرگز نہیں۔ میں دراصل اس پیاری سی بیٹی سری داسی کو ایک خاص خبر سنانا چاہتا ہوں۔"

"ضرور سنایئے۔ میں منع کب کر رہا ہوں آپ کو۔" ودود نے خوش دلی سے کہا۔

امیر نے سری داسی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر تمہیں جانے کی جلدی ہے تو پہلے تم چلے جاؤ۔ پھر میں اطمینان سے سری داسی کو وہ خبر سناؤں گا جس سے اسے ضرور خوشی ہو گی---"

ودود تو ادھر ادھر دیکھنے لگا مگر نگارش نے لقمہ دیا۔

"بابا جان۔ آپ اطمینان سے خبر سنایئے۔ بھائی جان ابھی واپس نہیں جانے کے۔"

اس کے ساتھ ہی نگارش اور پرتو ایک دوسرے کو دیکھ کے مسکرانے لگیں۔

ودود سمجھ گیا کہ یہ اس پر چوٹ ہے اس لئے فوراً بولا۔

"نگارش ٹھیک کہہ رہی ہے بابا۔ ابھی تو میں آ کے بیٹھا ہی ہوں۔ آپ فکر نہ کیجئے۔ میں شام تک رہوں گا اور ممکن ہے کل یا پھر پرسوں جاؤں۔"

امیر عبد المعبود نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"اچھا بھئی راجکماری سری داسی تمہارے لئے یہ خوشخبری ہے کہ اب سلطان قطب الملک شاہ کی شامت آگئی ہے۔"

راجکماری سری داسی نے اپنی بھاری بھاری پلکیں جھپکائیں پھر امیر عبد المعبود کو دیکھا مگر زبان سے کچھ نہ بولی۔

"ہاں۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ قطب شاہ کی اب شامت آگئی ہے۔ اس نے میرجملہ سے جھگڑا مول لے لیا ہے۔" امیر عبد المعبود نے خود ہی کہنا شروع کر دیا۔ "آج دربار میں میرجملہ کا قاصد آیا تھا۔ اس نے شہزادے بہادر سے فوراً گفتگو کی درخواست کی اور شہزادے نے اس سے نصف گھنٹے سے بھی زیادہ باتیں کیں۔"

"بابا۔ یہ میرجملہ کون ہے۔" وددو نے اچانک سوال کیا۔

امیر نے برا سا منہ بنایا اور بولا۔

"بیٹے۔ آپ ملک کے حالات پر نظر رکھیں تو آپ کو معلوم ہو کہ میرجملہ کون ہے۔ بہرحال اس وقت یہی سمجھو کہ میرجملہ ایک ایسی بلا ہے کہ جسے وہ چمٹ جائے اس کا خون تک چوس لیتی ہے۔ ابھی تفصیل تو نہیں معلوم ہوئی بس اتنا سننے میں آیا ہے کہ میرجملہ اور قطب شاہ میں چل گئی ہے اور میرجملہ نے شہزادے بہادر سے مدد کی درخواست کی ہے۔"

یہ کہہ کے امیر عبد المعبود باہر چلے گئے اور یہ لوگ پھر آپس میں باتیں کرنے لگے۔

میرجملہ کی کہانی

میرجملہ کا تعلق اصفہان کے ایک سید خاندان سے تھا۔ وہ ایک جواہرات کے سوداگر کے ساتھ ہندوستان آیا اور جنوبی ہند کی ریاست حیدر آباد (گول کنڈہ) میں رہائش پذیر ہوا۔ کہتے ہیں کہ میرجملہ بہت ایماندار اور دیانت دار تھا۔ سوداگر کو اس پر اس قدر اعتماد تھا کہ اس نے میرجملہ کو اپنا بیٹا بنا لیا اور جب اس کا انتقال ہوا تو اس کی وصیت کے مطابق سوداگر کا تمام اثاثہ میرجملہ کو مل گیا۔

میرجملہ اپنی دولت اور دیانت داری کی وجہ سے بہت جلد مشہور ہو گیا اور اس کی رسائی سلطان گولکنڈہ' عبد اللہ قطب شاہ کے دربار میں ہوئی۔ پھر وہ سلطان کی نظروں میں

اتنا چڑھا کہ اسے گولکنڈہ کا وزیر بنا دیا گیا۔ وزیر ہونے کے بعد بھی میرجملہ نے اپنی تجارت کا سلسلہ جاری رکھا جس کی وجہ سے اس کی دولت میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا رہا۔

آخر اس کی جاگیر اتنی بڑی ہو گئی کہ میرجملہ کی آمدنی چالیس لاکھ سالانہ ہو گئی۔ تجارت کے علاوہ میرجملہ نظم و نسق اور انتظام مملکت پر گہری نظر رکھتا تھا۔ اپنی جاگیر کے انتظام کے لئے اس نے دو سو سوار اور پانچ ہزار پیادے نوکر رکھ لئے تھے۔

میرجملہ کی دن دونی رات چوگنی دولت اور شہرت سے لوگ خوامخواہ اس کے مخالف ہو گئے۔ انہوں نے سلطان گولکنڈہ کے کان بھرنے شروع کر دیئے اور انہیں یہ سمجھایا کہ اگر میرجملہ کے گلے میں پٹہ نہ ڈالا تو ایک دن وہ پوری ریاست گولکنڈہ پر قبضہ کر لے گا۔ چنانچہ سلطان قطب شاہ نے میرجملہ پر بلا وجہ کے الزام لگانا شروع کر دیئے اور دونوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔

میرجملہ کو جب زیادہ خطرہ پیدا ہوا تو اس نے ایک طرف تو بیجا پور کے سلطان عادل شاہ سے اور دوسری طرف شہنشاہ ایران سے خط و کتابت شروع کر دی۔ شہزادہ اورنگ زیب پہلے ہی سلطان قطب الملک سے خار کھائے بیٹھا تھا۔ چنانچہ اس نے سلطان قطب شاہ سے بدلہ لینے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

میرجملہ اور سلطان قطب شاہ کے درمیان اختلافات آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے مگر اس وقت یہ معاملہ عروج پر پہنچ گیا جب بعض تاریخ دانوں کے مطابق میرجملہ کے بیٹے میر محمد امین نے سلطان کو اپنی ناشائستہ حرکت یا حرکتوں کی وجہ سے اپنا دشمن بنا لیا۔ ایک روایت کے مطابق میر محمد امین نے سلطان قطب شاہ کے ساتھ کوئی گستاخی یا ناشائستہ حرکت نہ کی تھی بلکہ یہ جھگڑا دراصل شہزادی گولکنڈہ اور میرجملہ کے خود سر امیرزادے محمد امین کی وجہ سے ہوا تھا۔

ایک روایت کے مطابق جواں سال امیرزادہ محمد امین اور شہزادی گولکنڈہ کا جھگڑا کچھ ایسا اہم نہ تھا کہ اس پر زیادہ توجہ دی جاتی مگر سلطان قطب شاہ کے حواریوں نے سلطان کے سامنے اسے ایک ایسا ہوا بنا کر پیش کیا کہ قطب شاہ کو امیرزادہ محمد امین پر غصہ آگیا اور بات بہت آگے نکل گئی۔

ہوا یہ تھا کہ ایک دن امیرزادہ محمد امین اپنے معمول کے مطابق شکار پر نکلا۔ امیرزادہ

کے باپ میرجملہ کی جاگیر ریاست گولکنڈہ کی حدود کے برابر ہی تھی جس میں ایک اچھی شکارگاہ بھی تھی۔ امیرزادہ ہفتہ میں ایک بار اس شکارگاہ میں ضرور آتا اور کچھ دیر شکار کھیلنے کے بعد واپس چلا جاتا تھا۔ اس دن بھی امیرزادہ اپنی شکارگاہ میں آیا ہوا تھا۔

امیرزادہ کی خوش قسمتی یا بد قسمتی کہ اس دن اس کے شکار گاہ میں داخل ہوتے ہی وہ ہرن سامنے آگیا جس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ ہرن ایک گائے کے برابر ہے اور اس قدر تیز بھاگتا ہے کہ اس کی گرد کو پہنچنا بھی مشکل ہے۔ امیرزادہ نے اسے دیکھتے ہی اپنا گھوڑا اس کے پیچھے ڈال دیا۔ ہرن نے کان کھڑے کئے پھر اپنی جگہ سے اچھلا اور ایک طرف چوکڑیاں بھرتا ہوا ہوگیا۔ امیرزادہ کا گھوڑا کافی تیز رفتار تھا مگر ہرن اس سے زیادہ برق رفتار تھا۔ وہ امیرزادہ سے دو سو گز آگے آگے بھاگ رہا تھا اور کبھی ٹھہر کر اپنے تعاقب کرنے والے کو دیکھ بھی لیتا تھا۔

امیرزادے اور ہرن کی یہ دوڑ ایک گھنٹہ سے زیادہ دیر تک جاری رہی۔ مگر نہ تو امیرزادہ ہرن تک پہنچ سکا اور نہ ہرن' امیرزادے کی نظروں سے باوجود اپنی برق رفتاری اوجھل ہو سکا۔ ہرن جب بھی شکارگاہ کے کونے پر پہنچتا تو پھر دائیں بائیں گھوم کے بھاگنے لگتا۔ شکار گاہ کے دو جانب وسیع میدان تھا اور شاید ہرن کو خطرہ تھا کہ اگر اس نے میدان میں جانے کی کوشش کی تو وہ پکڑا یا مارا نہ جائے۔ اسی لئے وہ امیرزادہ کو تھکا کر پست اور مضمحل کر دینا چاہتا تھا۔

یکایک امیرزادہ کو محسوس ہوا کہ ہرن ایک جگہ کھڑا ہو گیا ہے اور شاید اپنے بچاؤ کی کوئی اور صورت سوچ رہا ہے۔ امیرزادہ کے لئے اتنا وقفہ ہی کافی تھا۔ اس نے گھوڑے کی رفتار کم نہ کی اور اسی طرح گھوڑا بھگاتے ہوئے ترکش سے تیر کھینچا اور کمان میں جوڑ کے ہرن کی طرف چلا دیا تاکہ وہ حرکت کرنے سے پہلے زخمی ہو جائے۔

امیرزادہ کا تیر سیدھا ہرن کے پچھلی ران پر لگا۔ اس نے جسم کو جھٹکا دیا پھر اچھل کر ایک طرف بھاگ پڑا مگر اب اس کی رفتار پہلے سے کم ہوگئی تھی۔ امیرزادہ نے اندازہ لگایا کہ تیر ہرن کے لگا ہے اور وہ زخمی ہو گیا ہے اور رفتار کم ہو گئی ہے۔ پس اس نے اپنا گھوڑا اور تیز کر دیا اور بہت جلد ہرن کے قریب پہنچ گیا۔ ہرن زخمی ہو کر ایک جگہ خود ہی رک کے کھڑا ہو گیا تھا۔

امیرزادہ ہرن کے پاس پہنچ کے گھوڑا سے کودا کہ جال پھینک کے ہرن کو بے بس کر دے مگر ٹھیک اسی وقت اسے اپنے پیچھے کسی گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ اس نے پلٹ کے دیکھا اور دم بخود ہو گیا کیونکہ ایک تیز رفتار گھوڑے پر سوار کوئی لڑکی یا عورت اس کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی آنے والے کی سیاہ لانبی لانبی زلفیں ہوا کے زور سے پیچھے کی طرف اڑ رہی تھیں۔

گھوڑا رکا اور ایک خوبصورت پیکر جس کے چہرے پر پسینے کے ننھے ننھے موتی چمک رہے تھے' گھوڑے سے اتر کر امیرزادے محمد امین کے پاس آیا۔

"تم کون ہو؟" حسین پیکر ہلکے سے تلخ لہجہ میں بولا۔

امیرزادہ مسکرایا اور بولا۔

"یہی سوال میں تم سے بھی کر سکتا ہوں۔" امیرزادہ مسکرا رہا تھا۔

"ادب سے بات کرو۔ تم نہیں جانتے کہ تم کس سے بات کر رہے ہو؟"

"ادب تم سیکھو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تمہیں "تم" سے مخاطب کرنے والا کس حیثیت کا مالک ہو سکتا ہے۔"

"خاموش گستاخ۔ میں گولکنڈہ کی شہزادی الماس ہوں۔"

امیرزادہ محمد امین نے ایک جھرجھری سی لی پھر کہا۔

"اگر آپ شہزادی گولکنڈہ ہیں تو میں شہزادی کو تعظیم پیش کرتا ہوں۔"

"ہم تمہاری گستاخی معاف کرتے ہیں۔" شہزادی نے بڑی تمکنت سے کہا۔ "تم ایسا کرو کہ اس زخمی ہرن کو جال سے باندھ کے گھوڑے کی زین سے لٹکا دو۔"

"یہ نہیں ہو سکتا شہزادی۔" امیرزادہ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔

"کیوں نہیں ہو سکتا؟" شہزادی کو بھی غصہ آگیا۔ "کیا تم ریاست کی شہزادی کے حکم سے انکار کر سکتے ہو؟"

"جی ہاں۔ میں انکار کر سکتا ہوں۔" امیرزادہ کا غصہ کم ہو رہا تھا۔ "اب میں بالکل انکار کر رہا ہوں۔"

"مگر کیوں۔ [illegible]دی کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ "تم مجھے پہچانتے ہوئے بھی انکار کر رہے ہو—— کیا یہ گست[illegible] نہیں ہے؟"

"اس کی دو وجہیں ہیں شہزادی صاحبہ——" امیرزادہ محمد امین نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "پہلی وجہ تو یہ کہ آپ نے مجھے حکم دیا ہے جبکہ آپ کا حکم ماننا میرے لئے ضروری نہیں۔ کیونکہ میں بھی امیرزادہ ہوں اور میری جاگیر ریاست گولکنڈہ سے کسی طرح کم نہیں اور دوسری وجہ——"

"ٹھہرو——" شہزادی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور تمہاری جاگیر کہاں ہے؟"

"سنئے شہزادی گولکنڈہ۔" امیرزادہ محمد امین گردن اکڑا کے بولا۔ "میں گولکنڈہ کے وزیراعظم میرجملہ کا بیٹا ہوں اور میری دولت اور ثروت کا مقابلہ کوئی بادشاہ بھی نہیں کر سکتا۔"

شہزادی نے میرجملہ کی دولت و ثروت کا حال سن رکھا تھا اس لئے وہ کچھ پریشان ہوئی مگر سنبھل کے پوچھا۔

"اور تمہارے انکار کی دوسری وجہ کیا ہے؟"

امیرزادے نے پر غرور انداز میں جواب دیا۔

"اس لئے کہ یہ ہرن میں نے شکار کیا ہے۔ آپ پہلے مجھ سے اجازت لیجئے۔"

"تم جھوٹے ہو۔" شہزادی چیخ پڑی۔ "اسے میں نے شکار کیا ہے۔"

امیرزادہ شہزادی کی چیخ پر مسکرا دیا۔ بولا۔

"میں شہزادی کو جھوٹا کہنے کی غلطی نہیں کروں گا مگر یہ حقیقت ہے کہ ہرن کو میں نے شکار کیا ہے اس کی پچھلی ران میں میرا تیر پیوست ہے۔"

"یہ بھی جھوٹ ہے۔" شہزادی نے پہلے سے زیادہ چیخ کے کہا۔ "ہرن میں نے مارا ہے۔ تیر ہرن کی گردن میں آویزاں ہے۔ تم دیکھ سکتے ہو۔"

ہرن اس وقت تک بے دم ہو کر زمین پر گر چکا تھا۔

"آیئے تشریف لایئے شہزادی صاحبہ۔" شہزادے نے شہزادی گولکنڈہ کو دعوت دی۔

"چلئے دیکھتے ہیں کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ ہے۔"

شہزادی گولکنڈہ اور امیرزادہ محمد امین دونوں ساتھ ساتھ ہرن کے پاس پہنچے۔ ہرن نیم مردہ ہو گیا تھا اور اس نے گردن زمین پر ڈال دی تھی۔

امیرزادہ کو ہرن کی ران میں تیر نظر آیا۔ وہ خوش ہو گیا۔

"دیکھئے۔ دیکھئے۔ یہ رہا میرا تیر۔ ٹھیک ران میں لگا ہے۔"

شہزادی کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔ وہ ہرن کے پاس گئی اور اس کی زمین پر گری ہوئی گردن کو اونچا کر کے دیکھا اور چیخ اٹھی۔

"دیکھو—— دیکھو امیرزادے۔ ہرن کی گردن میں میرا تیر چبھا ہوا ہے۔"

امیرزادے نے جھک کے دیکھا۔ ہرن کی گردن میں واقعی ایک تیر چبھا ہوا تھا۔

شہزادی نے بچوں کی طرح کھلکھلاتے ہوئے کہا۔

"اب یقین آیا کہ نہیں یہ شکار میں نے مارا ہے؟"

امیرزادہ بولا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہرن میرے تیرے سے زخمی ہوا ہو۔ اس کے بعد آپ کا تیر اسے لگا ہو۔"

"تمہارا اندازہ غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔" شہزادی نے اپنی بات اوپر رکھنے کے لئے کہا۔ "ممکن ہے کہ ہرن کی گردن میں میرا تیر لگنے کے بعد تم نے اس کی ٹانگ زخمی کر دی ہو؟"

"ممکن تو ہر چیز ہو سکتی ہے۔" امیرزادہ نے دوستانہ رویہ اپنایا۔ "اب اگر آپ حکم دیں کہ ہرن کو آپ کے گھوڑے کے ساتھ باندھ دیا جائے تو میں حاضر ہوں؟"

شہزادی بھی نرم پڑ گئی تھی۔ بولی۔

"تمہیں حکم دینا مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ ہاں میں چاہتی ہوں کہ تم ایسا ہی کرو۔"

امیرزادے نے اپنے گھوڑے کے ساتھ بندھی رسی اور جال کھولا اور ہرن کے پاس واپس گیا۔ اسی وقت ایک اور گھوڑا دوڑتا ہوا ان کے پاس آ کے رکا۔ اس پر ایک اور قتالہ عالم سوار تھی۔ وہ جلدی سے گھوڑے سے اتری اور اس نے بڑھ کے شہزادی کو اپنے گلے سے لگا لیا۔

"میری بہن۔ میں تو گھبرا گئی تھی۔ اتنا تیز گھوڑا نہ دوڑایا کر میری الماس۔" پھر آنے والے کی نظر ہرن پر پڑی۔ وہ شہزادی کو چھوڑ کے ہرن کے پاس گئی۔ جھک کے دیکھا۔

"اری الماس۔ تو نے یہ مارا ہے ہرن؟"

الماس نے مسکراتے ہوئے امیرزادہ کو دیکھا۔ امیرزادے نے شہزادی کے بولنے سے پہلے ہی جواب دیا۔

"جی ہاں۔ یہ ہرن شہزادی عالیہ نے ہی شکار کیا ہے۔"

آنے والی کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ غصہ سے بولی۔

"یہ کون بد تمیز ہے ہمارے درمیان بولنے والا؟"

شہزادی الماس نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

"آپا جی۔ یہ امیرزادہ ہے۔"

"ہوگا امیرزادہ اپنے گھر کا۔۔۔" آنے والی نے جو شہزادی الماس کی بد دماغ بڑی بہن تھی سخت لہجے میں کہا۔ "اگر تم امیرزادے بھی ہو تو تم نے شہزادیوں کے درمیان بولنے کی کیوں جسارت کی؟"

"آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہو رہی ہیں شہزادی۔" امیرزادہ محمد امین بھی کچھ چڑ گیا۔ "میں نے تو صرف بتانے کی جرات کی تھی کہ یہ ہرن شہزادی الماس ہی نے شکار کیا ہے۔۔۔"

بد دماغ بڑی شہزادی نے اس کی بات کاٹ دی۔

"خاموش ہو جا یہ تیری دوسری گستاخی ہے۔ تیرے ناپاک دہن سے ہم اپنی بہن کا نام سننا پسند نہیں کرتے۔"

امیرزادہ نے انتہائی غصہ سے بڑی شہزادی کو گھورا مگر اسی وقت اس کی نظر شہزادی الماس پر پڑ گئی۔ شہزادی کا چہرہ دھواں دھواں تھا اور وہ اپنی بڑی بہن کو دیکھ کے غصہ سے دانت پیس رہی تھی۔

الماس کی یہ حالت دیکھ کر امیرزادہ کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس نے کہا۔

"کوئی بات نہیں شہزادی الماس۔ مجھے افسوس ہے کہ میری باتوں سے آپ کی بہن کو صدمہ پہنچا۔ بہرحال اگر حکم ہو تو ہرن کو آپ کے گھوڑے کے ساتھ باندھ۔۔۔۔"

"دور ہو جا ہماری آنکھوں سے او ذلیل کتے۔" بڑی شہزادی نے امیرزادہ کو انتہائی حقارت سے مخاطب نہیں کیا بلکہ ذلیل و خوار کر دیا۔

امیرزادہ کا ہاتھ فوراً قبضہ شمشیر پر گیا مگر فوراً ہی اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ پھر وہ

جست کر کے اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور بغیر شہزادی الماس سے نظریں ملائے ایک طرف گھوڑا اڑاتا نکل گیا۔

وہ رات امیرزادے نے بڑی بے چینی سے گزاری۔ ن کے باپ میرجملہ نے اس کی پریشانی اور بے چینی کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کی مگر امیرزادہ محمد امین ٹال گیا۔ صبح ہوتے ہی امیرزادے میر محمد امین نے کل کے واقعہ کو ایک خیال پریشان تصور کرتے ہوئے ذہن کے پردے سے بالکل جھٹک دیا اور حسب معمول شکار پر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

اس وقت ملازم نے اندر آ کے امیرزادے کو بتایا۔

"شاہ کا ہرکارہ آیا ہے۔ آپ کو اسی وقت طلب کیا ہے۔"

امیرزادہ راہداری میں کھڑا جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسی جگہ اسے والئی گولکنڈہ قطب شاہ کا حکم نامہ ملا۔ اس کا دماغ غصہ سے بھنا گیا۔ وہ ملازم کو کوئی سخت جواب دینے ہی والا تھا کہ راہداری میں لگی ایک کھڑکی کھلی اور اس میں سے میرجملہ نے سر نکال کے کہا۔

"میرے بیٹے۔ ٹھہرو۔ تمہیں جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ میں آ رہا ہوں۔"

راہداری میں کھلنے والی یہ کھڑکی میرجملہ کے خواب گاہ کی تھی۔ جہاں تک ملازم کی آواز پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے بات کی تہہ تک پہنچنے کے لئے بیٹے کو گفتگو سے روکا اور جلدی سے نکل کے راہداری میں پہنچ گئے۔

میرجملہ نے ملازم سے کہا۔

"شاہی ہرکارہ کو بیٹھک میں بٹھاؤ۔ میں تیار ہو کے ابھی آتا ہوں۔"

"نہیں میرے بابا۔۔" امیرزادے نے سختی سے کہا۔ "مسئلہ میرا ہے۔ میں خود شاہ سے ملنے جاؤں گا۔"

"تمہارا مسئلہ۔ کیا ہے تمہارا مسئلہ؟" میرجملہ نے حیرانی سے پوچھا۔ "کل رات شاید تم اس لئے پریشان تھے۔ مجھے بتاؤ بیٹے۔ بات کیا ہے۔ قطب شاہ ویسے ہی ہمارے خلاف ہو رہا ہے۔ اب ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

میر محمد امین نے باپ کو کل کے واقعہ کی پوری تفصیل بتا دی۔ میرجملہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے۔

"میر محمد امین۔ تمہیں دربار میں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ بڑی شہزادی بے انتہا خود سر اور بد دماغ ہے۔ اس نے قطب شاہ سے خوب لگائی بجھائی کی ہو گی۔ تمہارا دربار میں جانا ٹھیک نہیں۔ تمہیں دیکھ کے قطب شاہ اور بڑی شہزادی اور زیادہ بھڑک اٹھیں گے۔ تمہارے بجائے دربار میں جاؤں گا اور امید ہے کہ میں حالات سنبھال لوں گا۔"

"بالکل نہیں میربابا۔۔۔" محمد امین نے پھر انکار کیا۔ "آپ کو خدا نخواستہ کچھ ہو گیا تو ہم بے سہارا رہ جائیں گے۔ مجھے دربار جانے دیجئے۔ میں ذلت برداشت کر لوں گا اور بات آگے نہیں بڑھنے دوں گا۔"

کافی بحث و مباحثہ کے بعد میر جملہ نے بیٹے کو بہت تحمل اور صبر کا سبق دے کر دربار بھیجا۔

میر محمد امین قطب شاہی دربار میں پہنچا۔ ابھی سویرا ہی ہوا تھا دربار امراء اور وزراء سے بھرا ہوا تھا۔ قطب شاہ نے صبح ہی صبح درباریوں کو بلوا لیا تھا۔ اس وقت وہ میر جملہ اور میر محمد امین دونوں کو بھرے دربار میں ذلیل کرنا چاہتا تھا۔

قطب شاہ نے محمد امین کو بلوایا تھا۔ اسے یقین تھا کہ میر جملہ بیٹے کو اکیلے دربار میں نہ آنے دے گا اور خود بھی اس کے ساتھ آئے گا مگر جب صرف محمد امین دربار پہنچا تو قطب شاہ غصہ سے بپھر گیا۔

"تمہارا باپ کہاں ہے؟"

"شاہ محترم۔۔۔" محمد امین نے ادب سے جواب دیا۔ "میربابا حویلی میں ہیں۔"

"وہ تمہارے ساتھ کیوں نہیں آیا۔۔۔" قطب شاہ کا لہجہ انتہائی تلخ اور تند تھا۔

محمد امین نے صبر سے کام لیا اور تحمل سے بولا۔

"شاہ محترم نے مجھے طلب کیا تھا۔ میں آ گیا۔ میر بابا کے لئے کوئی حکم نہیں تھا۔۔۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔" قطب شاہ تلملا کے رہ گیا۔ "کل تم نے شہزادی سے کیا گستاخی کی تھی۔۔۔؟"

"کچھ نہیں۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں شاہ محترم۔" محمد امین انتہائی تحمل کا ثبوت دیا۔

"تو کیا شہزادی جھوٹ بول رہی ہے؟" قطب شاہ نے الٹا ہی سوال کیا۔

"ہرگز نہیں۔ شہزادی کبھی جھوٹ نہیں بول سکتی۔" محمد امین نے فورا" بات سنبھالی۔

"شاید میرے سمجھنے میں کوئی غلطی ہوئی تھی۔ اس کے لئے میں شہزادی اور شاہ محترم سے معافی کا درخواستگار ہوں۔"

محمد امین نے یہ کہہ کے قطب شاہ کی زبان بند کر دی۔ قطب شاہ نے پتہ نہیں کیا کیا سوچ رکھا تھا۔ پہلے اس نے محمد امین پر گستاخی کا الزام لگایا مگر محمد امین نے اسے رد کرنے کے بعد خود ہی تسلیم کر لیا اور فورا" معذرت پیش کر دی۔ اب وہ محمد امین کو کس جرم کی سزا دے۔ بلکہ محمد امین نے قطب شاہ کو اس قدر حیرت انگیز جواب دیا تھا کہ قطب شاہ اس سے کچھ اور کہہ ہی نہ سکا۔

"میرے لئے کیا حکم ہے شاہ محترم۔" محمد امین کے چہرے پر مسکراہٹ سی پھیل گئی تھی۔

قطب شاہ بالکل ہی لا جواب ہو گیا تھا۔ اس نے کچھ بھی نہیں کہا۔

محمد امین نے ایک لمحہ گزرنے کے بعد کہا۔

"میرا خیال ہے کہ مجھے شاہ محترم اور شہزادی عالیہ نے معاف کر دیا ہے۔ میرا التماس ہے کہ مجھے اب واپس جانے کی اجازت دی جائے۔"

قطب شاہ نے اسے پھاڑ کھانے والی نظروں سے دیکھا۔

"جاؤ۔ تم دونوں باپ بیٹے جہنم میں جاؤ۔"

میر محمد امین دل ہی دل میں مسکراتا دربار سے فورا" نکل گیا۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا کہ شاہ کا ہرکارہ دوڑتا ہوا دربار سے نکلا اور اس نے چیخ کے کچھ کہا۔ اس وقت محمد امین رکاب میں پیر ڈال چکا تھا۔ اس نے ہرکارے کی طرف اس طرح پیٹھ کر لی جیسے اس نے ہرکارے کو دیکھا ہی نہیں۔ محمد امین اور ہرکارے کے درمیان ڈیڑھ سو سے زیادہ سیڑھیاں تھیں۔ اس لئے اس کی آواز محمد امین تک نہیں پہنچ سکی اور محمد امین طمینان سے گھوڑے پر سوار ہو کے اپنی حویلی واپس چلا گیا۔

والئی گولکنڈہ نے میر محمد امین کو دربار میں بلا کر جس انداز سے گفتگو کی اس سے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ میر محمد امین اور اس کے باپ میر جملہ کے خلاف کوئی نہ کوئی الزام لگا کر

ان کی بڑھتی طاقت کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ پھر جب محمد امین نے باپ کو قطب شاہ کے تحقیرانہ انداز گفتگو کی تفصیل بتائی تو اس نے بلا توقف شہزادہ اورنگ زیب کو قاصد کے ذریعہ مطلع کیا کہ وہ شہزادہ عالم مقام اور شہنشاہ ہند مغل تاجدار شاہجہاں کی پناہ میں آنے کا خواہشمند ہے۔

شہزادہ اورنگ زیب تو بہانہ ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے فوراً دربار شاہجہانی میں میرجملہ اور والی گولکنڈہ کے جھگڑے کی پوری روداد لکھ بھیجی۔ مزید یہ کہ اس نے شہنشاہ ہند کو جو خط لکھا تھا وہ اس نے میرجملہ کے قاصد کو بھی پڑھا دیا تاکہ وہ اچھی طرح مطمئن ہو کے جائے۔

قاصد کو رخصت کرتے وقت شہزادے نے اسے مزید زبانی طور پر بھی مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ اورنگ نے اس سے کہا۔

"امیر میرجملہ کو ہمارا پیغام پہنچاؤ کہ ہم نے دربار شاہی کو ان کے حالات سے آگاہ کرتے ہوئے اجازت طلب کی ہے کہ ہمیں قطب شاہ کی زیادتیوں کو ختم کرنے کا حکم دیا جائے امیر سے یہ بھی کہنا کہ اگر جواب آنے میں تاخیر ہوئی اور قطب شاہ نے ان کے خلاف کوئی عملی قدم اٹھایا تو ہماری فوجیں ان کی حفاظت کے لئے تیار ہوں گی۔"

"شہزادے بہادر۔۔۔۔" قاصد نے جواب دیا۔ "میں پوری طرح مطمئن ہوں اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے آقا بھی آپ کے اقدام کی نہ صرف دل سے قدر کریں گے بلکہ آپ کے اس احسان کو تمام عمر فراموش نہ کر سکیں گے۔"

پھر میرجملہ کا قاصد اپنی ریاست کی طرف واپس ہوا اور شہزادہ اورنگ زیب کا قاصد اس کا خط لے کر شاہی دربار روانہ ہوا۔

چونکہ یہ معاملہ بہت اہم تھا اور شہزادے نے میرجملہ کی پرزور تائید کی تھی۔ اس نے شہنشاہ کو یہ بھی اشارہ دیا تھا کہ کرناٹک میں الماس (ہیرے) کی کانیں بھی ہیں۔ اورنگ زیب نے ہیروں کی کانوں کا ذکر اس لئے کیا تھا کہ دارا شکوہ جو ایک لالچی شہزادہ تھا اور پورے ہندوستان پر حکومت کے خواب دیکھ رہا تھا' وہ شہنشاہ کو گولکنڈہ کے خلاف قدم اٹھانے سے نہ روک دے۔ ظاہر تھا کہ اگر کرناٹک پر گولکنڈہ کا قبضہ ہو جاتا ہے اور میرجملہ کو بھی اگر گولکنڈہ نے زیر کر لیا تو پھر قطب شاہ کو قابو کرنا تقریباً ناممکن ہو جائے گا۔

اورنگ زیب کا خیال درست نکلا۔ دارا شکوہ جو شہنشاہ پر حاوی تھا۔ اس نے اسی وقت شہنشاہ سے مندرجہ ذیل فرمان جاری کروائے پہلے فرمان کے ذریعہ میرجملہ کو شہنشاہ ہند شاہجہاں نے پنج ہزاری منصب اور اس کے بیٹے میر محمد امین کو دو ہزار کا منصب عطا کیا۔ دوسرے فرمان کے ذریعہ والی گولکنڈہ قطب الملک قطب شاہ کو حکم دیا گیا کہ وہ میرجملہ اور میر محمد امین سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے اور نہ ان کے خلاف کوئی کاروائی ہو۔

سلطان کے اس فرمان کا قطب شاہ پر الٹا ہی اثر ہوا۔ اس نے میر محمد امین کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کے بعد اسے گرفتار کر کے قید کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میر محمد امین کے تمام مال و مطیع پر بھی قبضہ کر لیا۔ میرجملہ اس کے ہاتھ نہ آ سکا ورنہ شاید وہ میرجملہ کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کرتا۔

یہ خبر ایسی نہ تھی کہ چھپی رہتی۔ شہزادے اورنگ زیب کو فوراً اس کا پتہ لگ گیا۔ اسے قطب شاہ پر سخت غصہ آیا۔ مگر قطب شاہ کے خلاف وہ بغیر شہنشاہ کے حکم کے کوئی قدم بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ وہ اسی فکر میں تھا کہ میرجملہ خود اس کے پاس پہنچ گیا۔ شہزادہ اس سے شرمندہ تھا کیونکہ اس نے میرجملہ کے قاصد کو اطمینان دلایا تھا کہ اگر شہنشاہ کے جواب آنے سے پہلے قطب شاہ نے اس کے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو اس کی فوجیں قطب شاہ سے سمجھ لیں گی۔

میرجملہ شہزادے کے پاس آیا اور سر جھکا کے بیٹھ گیا۔ اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ دوسری طرف شہزادہ بھی خاموش تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ میرجملہ سے کس طرح بات کرے۔

آخر میرجملہ نے سر اٹھا کر شہزادے کو دیکھا۔ شہزادے کی نظریں اسی پر لگی تھیں۔ اس نے کہا۔

"میرجملہ۔ میں تم سے شرمندہ ہوں مگر میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ قطب شاہ کو اس نافرمانی کی سزا ضرور دی جائے گی۔"

"مجھے بھی یہی امید ہے شہزادے بہادر۔" میرجملہ ایک ہلکی سی ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"تعجب اس بات کا ہے کہ قطب شاہ نے شہنشاہ ہند کی نافرمانی کرنے میں ذرا بھی

جھجک محسوس نہیں کی۔"

شہزادے اورنگ زیب نے اسے تسلی دی۔

"گھبراؤ نہیں میر جملہ۔ ہم دربار سے قطب شاہ پہ فوج کشی کی اجازت مانگ رہے ہیں اور وہ سب کچھ شہنشاہ کو کہلوا بھیجیں گے جو ہمیں لکھنا چاہئے۔"

میر جملہ کو اس سے زیادہ اور کیا اطمینان ہو سکتا تھا۔ شہنشاہ نے اسے اور اس کے بیٹے کو منصب عطا کئے تھے اور قطب شاہ نے اسکے بیٹے کو قید خانہ میں محبوس کر دیا تھا۔ میر جملہ نے کہا۔

"شہزادے بہادر۔ قطب شاہ کی اس حرکت سے ظاہر ہو گیا کہ وہ دل کا اچھا نہیں۔ مجھے بس یہ ڈر ہے کہ کہیں وہ محمد امین کو قید میں کوئی نقصان نہ پہنچائے۔"

"خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔" شہزادے نے کہا۔ "اگر قطب شاہ نے کسی قسم کی حرکت کی تو گولکنڈہ کے قلعے کی فصیلیں زمین کے برابر نہ کرا دوں تو میرا نام اورنگ زیب نہیں۔"

شہزادے اورنگ زیب نے کچھ ایسے جوش و یقین کے ساتھ گفتگو کی کہ میر جملہ کچھ اور نہ کہہ سکا اور مطمئن ہو کر چلا گیا۔

اورنگ زیب نے شہنشاہ کو ایک بڑا تفصیلی خط لکھا جس میں قطب شاہ کی نافرمانی کا خاص طور پر ذکر کیا پھر آخر میں لکھا کہ دربار عالی کے فرمان کے باوجود قطب شاہ کی میر محمد امین اور اس کے متعلقین کو گرفتار کرنے اور اس کا تمام مال و مطاع چھین لینے کی جو جرات کی ہے اس نے دوسرے امیروں میں بغاوت کے بیج پیدا ہو سکتے ہیں کیونکہ ایسی باتیں دوسروں کو بھی اسی طرح کی جرات کا حوصلہ دیں گی۔

شہزادے کے اس خط کا اثر شہنشاہ پر فوری طور پر ہوا اور اس نے تیز رفتار قاصد کے ذریعہ قطب شاہ اور اورنگ زیب دونوں کو دو فرمان بھجوائے۔ پہلا فرمان قطب شاہ کے نام تھا جس میں لکھا گیا تھا:۔

"قطب شاہ کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ میر محمد امین کو اس کے مال و متاع اور لواحقین کے ساتھ ہماری خدمت میں روانہ کر دیا جائے۔"

اس طرح اورنگ زیب کے نام فرمان کچھ اس طرح کا تھا:۔

"اگر قطب شاہ محمد امین کو رہا نہ کرے تو اس کی مزاج پرسی کے لئے شہزادہ سلطان (اورنگ زیب کا بڑا بیٹا) کو اس پر حملہ کرنے کا حکم دیا جائے۔ نیز یہ کہ شائستہ خاں حاکم مالوہ کو لکھا جائے کہ وہ اپنی فوج کے ساتھ شہزادے سلطان کی مدد کو پہنچ جائے۔"

شہزادے اورنگ زیب نے شاہی فرمان پاتے ہی شہزادہ سلطان محمد کو ایک لشکر کے ساتھ حیدر آباد کی طرف روانہ کر دیا۔ اس زمانہ میں حیدر آباد کے بجائے یہ ریاست گولکنڈہ کہلاتی تھی۔ گولکنڈہ کچھ فاصلہ پر دکن کا ایک بہت مضبوط قلعہ تھا۔ دوسری طرف جب شہنشاہ ہند کا فرمان قطب شاہ کو ملا تو اس کے حواس غائب ہو گئے۔ اس نے فوراً ہی محمد امین اور اس کے تمام متعلقین کو آزاد کر دیا مگر ضبط شدہ مال و متاع کے سلسلے میں کچھ نہ کہا۔

چنانچہ میر محمد امین قید سے آزاد ہو کر چلا تو کچھ ہی فاصلہ پر اس کو شہزادہ سلطان محمد کی خیمہ گاہ ملی جو اس کو آزاد کرانے قلعہ گولکنڈہ جا رہا تھا۔

شہزادے سلطان محمد نے محمد امین کو خوش آمدید کہا مگر جب اسے بتایا گیا کہ قطب شاہ نے اس کا مال و متاع واپس نہیں کیا تو شہزادے سلطان نے لشکر کو فوراً حیدر آباد کی طرف روانگی کا حکم دے دیا۔ قطب شاہ کا خیال تھا کہ محمد امین کو آزاد دیکھ کر سلطان محمد واپس چلا جائے گا مگر جب اس کے جاسوسوں نے اطلاع دی کہ سلطان محمد لشکر لئے حیدر آباد کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے تو اسے پسینے آ گئے۔ سلطان محمد کے لشکر سے ٹکر لینے کی اس میں ہمت نہ تھی اس لئے اس نے اپنا تمام قیمتی سامان اور زر و جواہر سمیٹے اور معہ بال بچوں کے قلعہ گولکنڈہ بھاگ گیا۔ قطب شاہ نے جاتے وقت یہ ضرور کیا کہ پندرہ بیس ہزار فوج جو نیم تربیت یافتہ تھی، حیدر آباد شہر کی حفاظت کے لئے چھوڑ گیا تھا۔

شہزادہ سلطان محمد حیدر آباد پہنچا۔ ایک معمولی سی جھڑپ ہوئی اور اس کا حیدر آباد پر قبضہ ہو گیا۔ حیدر آباد اس زمانہ میں بڑا نازک شہر ہوا کرتا تھا۔ اس لئے کہ تقریباً پورا شہر لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ ایک سال پہلے ہی کسی کی غلطی سے ایک پردے میں آگ لگی اور دم کے دم میں پورا شہر حیدر آباد شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا اور ایک ماہ تک پورا شہر جلتا رہا تھا۔

سلطان محمد نے پہلے شہر اور حویلیوں کے قیمتی سامان کی فہرست بنوا کر انہیں محفوظ کیا

پھر ایک فوجی دستے کو اس بات پر تعینات کر دیا کہ شہر میں کوئی گڑبڑ نہ ہونے پائے اور نہ کسی کو آگ جلانے میں بے احتیاطی کرنے دی جائے گی۔

شہزادہ سلطان محمد ابھی حیدر آباد کا انتظام کر رہی رہا تھا کہ اسے اطلاع دی گئی کہ اورنگ زیب خود گولکنڈہ آ رہے ہیں اور پہلے شاید حیدر آباد ہی پہنچیں گے۔

شہزادہ سلطان محمد کی شادی

ادھر تو شہزادہ سلطان محمد' حیدر آباد کے انتظام میں مصروف تھا اور ادھر اورنگ زیب ایک لشکر کے ساتھ گولکنڈہ پہنچ گیا اور اس نے قلعہ کو محاصرہ میں لے لیا۔ اب تو قطب الملک قطب شاہ کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ قطب شاہ میں شہزادہ سلطان محمد سے لڑنے کی طاقت نہ تھی تو وہ اورنگ زیب کے مقابلہ پر کیسے نکلتا۔ آخر اس نے ایک ترکیب سوچی اور خوب سوچی۔

قطب شاہ کو معلوم تھا کہ اورنگ زیب اس سے اس لئے بھی ناراض ہے کہ وہ صحابہ کرام پر برسرعام تبرا کہلواتا ہے اور اس نے اسے لازمی قرار دے دیا ہے۔ چنانچہ اس نے یہ تدبیر اختیار کی یا اپنی بچت کی یہ ترکیب سوچی یا پھر ایک زبردست جنگی اور سیاسی چال چلی۔ وہ تدبیر یا چال یہ تھی کہ اس نے فوراً اپنی والدہ کو قلعہ کے باہر اورنگ زیب کی خدمت میں ایک تحریر شدہ معافی نامہ لے کر بھیج دیا۔

اورنگ زیب کو بتایا گیا کہ والی گولکنڈہ کی والدہ محترمہ شہزادے کی قدمبوسی کے لئے حاضر ہونا چاہتی ہیں تو شہزادہ اورنگ زیب پریشان سا ہو گیا۔ بلا شبہ وہ قطب شاہ سے بہت جلا ہوا تھا اور اس نے شہنشاہ ہند کے پاس قطب شاہ کے تمام جرائم اور کوتاہیوں کی فہرست تک بھیج دی تھی۔ اس کے باوجود جب اسے معلوم ہوا کہ قطب شاہ کی والدہ اس کے پاس خود تشریف لا رہی ہیں تو وہ واقعی گھبرا گیا۔ ظاہر تھا کہ قطب شاہ کی والدہ کوئی بزرگ خاتون ہی ہو سکتی تھیں۔ پھر وہ ایک "ماں" تھی اور "ماں" کی عزت و حرمت سے اورنگ زیب اچھی طرح واقف تھا۔ چنانچہ اس نے فوراً حکم دیا۔

"محترم خاتون کی پیشوائی کے لئے تمام لشکر صف بستہ ہو جائے۔ خاتون محترم کو انتہائی

عزت و احترام سے ہمارے خیمہ تک لایا جائے۔ لشکر کے تمام سردار ہمارے ساتھ ہمارے خیمہ پر خاتون کا استقبال کریں۔"

اس حکم کے ساتھ ہی اورنگ زیب کا لشکر صف در صف استقبال کے لئے کھڑا ہو گیا۔ قلعہ والوں کو شبہ ہوا کہ اورنگ زیب کا لشکر صف بستہ ہو کر حملہ کے لئے تیار ہو رہا ہے۔ ان کے حواس تو بالکل ہی گم ہو گئے۔

قلعہ دار بھاگا ہوا قطب شاہ کے پاس پہنچا اور عرض کیا۔

"شاہ عالی مقام۔ شہزادے اورنگ زیب کا لشکر صف بستہ ہو رہا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ قلعہ پر اسی وقت حملہ ہونے والا ہے۔"

قطب شاہ پریشان ہو کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا شہزادے کے پاس ہمارا یہ پیغام نہیں پہنچا کہ ہماری والدہ ان کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتی ہیں۔"

"ہمارا قاصد وہاں پہنچ چکا ہے۔" قلعہ دار نے جواب دیا۔ "اس کے بعد ہی شہزادے کے لشکر میں یہ ہلچل ہوئی ہے۔"

"چلو ہم بھی دیکھتے ہیں۔" یہ کہہ کے قطب شاہ فصیل پر جانے والے زینہ کی طرف لپکا۔

قطب شاہ قلعدار کے ساتھ فصیل پر پہنچا تو اس کے بھی حواس غائب ہو گئے۔ شہزادے کا لشکر واقعی صف بستہ ہو رہا ہے۔

"اب کیا ہو گا؟" ایک دم قطب شاہ کی زبان سے نکلا اور اس کا منہ دھواں دھواں ہو گیا۔

قطب شاہ کی نظریں شہزادے کے لشکر پر لگی تھیں اور وہ گم سم کھڑا تھا کہ اچانک وہ فصیل پر آگے کی طرف جھکا۔

"دیکھو۔۔ دیکھو قلعدار شہزادے کے لشکر سے دو سوار نکل کے قلعہ کی طرف آ رہے ہیں۔ ان کا رخ ادھر ہی ہے نا؟"

قلعدار اس کی آواز کے ساتھ ہی خود بھی جھک پڑا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر کہا۔

"شاہ محترم کا خیال درست ہے۔ [illegible] سوار بڑی تیزی سے قلعہ کی طرف آ رہے

ہیں۔"

"اس سے تو کچھ اور ہی امید بندھی ہے۔" قطب شاہ نے قلعدار کو پر امید نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر شہزادے کا حملہ کا ارادہ ہوتا تو وہ یہ سوار کیوں بھیجتا؟"

قلعدار نے دل سے یا بے دلی سے قطب شاہ کے خیال کی تائید کی۔

"درست فرمایا شاہ محترم نے۔ یہ سوار ادھر ہی آ رہے ہیں۔"

قلعہ دار کا جواب گول مول تھا مگر قطب شاہ نے اسے حکم دیا۔

"تم صدر دروازے پر جاکر معلوم کرو کہ یہ سوار کیا پیغام لائے ہیں۔"

قلعدار نیچے جانے والی سیڑھیاں طے کرنے لگا اور قطب شاہ فکر کے عالم میں فصیل پر تیز تیز قدموں سے ٹہلنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد قلعدار تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آیا اور تقریباً دوڑتے ہوئے قطب شاہ کے پاس پہنچا۔ قطب شاہ گھبرایا ہوا اسے آتا دیکھ رہا تھا۔

"شاہ محترم مبارک ہو۔" قلعدار نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"کس بات کی مبارک باد۔ جلد بتاؤ قلعدار۔" قطب شاہ کے تفکر میں کمی آگئی تھی۔

"شہزادے بہادر نے اپنے دو محافظ سوار علیہ محترمہ والدہ شاہ کے استقبال کے لئے قلعہ کے صدر دروازے پر بھیجے ہیں۔ یہ سوار علیہ محترمہ کی سواری اپنے جلو میں لے کر شہزادے کی خیمہ گاہ تک جائیں گے اور وہاں شہزادہ اپنے تمام سرداروں کے ساتھ علیہ محترمہ کا استقبال کرے گا۔"

قطب شاہ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"تمہیں بھی مبارک ہو قلعدار بلکہ قلعہ کے ہر شخص کو مبارک ہو۔ مگر ہاں۔ یہ تو بتاؤ تم نے دونوں سواروں کو کیا جواب دیا ہے؟"

"انہیں جواب دینے کی ضرورت نہیں۔" قلعہ دار نے بتایا۔ "وہ علیہ محترمہ کی سواری کا انتظار کریں گے اور سواری کے ساتھ ساتھ واپس جائیں گے۔"

"تو پھر جلدی کرو۔ جاؤ اور علیہ والدہ کو فوراً تیار کرا کے صدر دروازے پر لے جاؤ۔" قطب شاہ یہ حکم دے کر خود بھی فصیل سے اتر کر صدر دروازے پر پہنچ گیا۔

علیہ والدہ قطب شاہ' شہزادے اورنگ زیب کی خیمہ گاہ جانے کے لئے پہلے تیار ہو

گئی تھیں۔ قطب شاہ کا حکم پا کر وہ ایک بند گھوڑا گاڑی میں صدر دروازے پر پہنچ گئیں۔

قطب شاہ نے پردہ کے اندر منہ ڈال کے کہا۔

"مادر مہربان۔ آثار پر امید ہیں۔ شہزادے بہادر نے آپ کے استقبال کے لئے اپنے دو ذاتی محافظ بھیجے ہیں۔ اب آپ کا کام ہے۔ شہزادے کو اس طرح شیشے میں اتاریئے کہ وہ کسی بات سے بھی انکار نہ کر سکے۔"

بڑی بی اگرچہ کافی عمر رسیدہ تھیں مگر گاڑی میں بڑے ٹھسے سے بیٹھی تھیں۔ ان کا لباس شاہانہ تھا اور انہیں سنبھالنے کے لئے زرق برق لباس پہنے دو کنیزیں شاہی گاڑی میں ان کی سامنے کی سیٹ پر بیٹھی تھیں۔ گیٹ کے اندر کی طرف قطب شاہ اور اس کے ارکان دولت علیہ محترمہ ملکہ مادر کو رخصت کرنے کے لئے موجود تھے۔

صدر دروازے کے برج میں بیٹھے پہریدار نے راستہ صاف ہونے کا اشارہ کیا جس کے ساتھ ہی صدر دروازہ کھل گیا۔ شاہی گاڑی باہر نکلی۔ باہر کھڑے شہزادے اورنگ زیب کے دو محافظ سوار اپنے گھوڑوں سے اتر کے گاڑی کے سامنے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ ملکہ مادر کی تعظیم کا یہ ایک منفرد نظارہ تھا۔ اورنگ زیب' قطب شاہ سے سخت ناراض تھا مگر جب اس نے سنا کہ ملکہ مادر اس سے ملاقات کے لئے آ رہی ہیں تو اس نے ان کے استقبال کے لئے بلا تکلف تمام شاہانہ رسم و رواج ادا کرنے کا حکم دیا۔

شاہی گاڑی آگے بڑھی۔ صدر دروازہ بند ہو گیا۔ دونوں محافظ اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور ایک دائیں اور دوسرا گاڑی کی بائیں جانب ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

اورنگ زیب کی خیمہ گاہ میں ملکہ مادر کی آمد کا انتظار ہو رہا تھا۔ اورنگ زیب عمائدین کے ساتھ اپنے خیمہ کے باہر کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ سواری شہزادے کے خیمے کے پاس جا کے رکی تو اورنگ زیب کے نقیب نے سواری کے برابر جا کر کہا۔

"شہزادے بہادر۔ ملکہ مادر گولکنڈہ کی خدمت میں سلام نیاز پیش کرتے ہیں۔"

اس کے جواب میں سواری کا پردہ ہٹا اور کنیز نے سر نکال کر مترنم آواز میں جواب دیا۔

"ملکہ مادر۔ شہزادے بہادر کو درازئی عمر اور بلندی اقبال کی دعاؤں سے نوازتی ہیں۔"

سواری خیمے کے برابر لگا دی گئی۔ تمام امیر واپس چلے گئے۔ سلامی دینے والی صفیں

ختم کر دی گئیں۔ ملکہ مادر کنیزوں کے سہارے سواری سے اتر کر خیمہ میں داخل ہوئیں۔ اورنگ زیب پہلے ہی خیمہ میں پہنچ گیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ملکہ مادر کا ہاتھ تھامنا چاہا۔ مگر ملکہ مادر نے ہاتھ اورنگ زیب کے سر کی طرف بلند کیا۔

اورنگ زیب نے سر کو ذرا سا خم کر دیا اور ملکہ مادر نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی۔

"بلند اقبال ہو۔ شہنشاہی کا تاج تیرے سر کی رونق بنے۔"

اورنگ بھونچکا رہ گیا اس نے یہ آواز پہلی بار کسی غیر سے سنی تھی۔ حالانکہ یہ اس کے دل کی آواز تھی جو بچپن سے جوانی تک اس کے دل کے نہاں خانوں میں پرورش پا رہی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ بڑی بی کی تائید میں کہہ دے کہ

"خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔"

مگر وہ یہ نہ کہہ سکا۔ ملکہ مادر کی دونوں کنیزیں اس کے دائیں بائیں تھیں اور اورنگ زیب نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس راز کو خود ہی افشاء کر دے۔

شاہی خیمہ (اورنگ کا خیمہ) میں قالینوں کا فرش تھا۔ درمیان میں دو مسندیں لگی تھیں۔ اورنگ زیب نے ملکہ مادر کی کنیزوں کو ایک مسند کی جانب اشارہ کیا۔ انہوں نے ملکہ کو اس مسند کے پاس لے جا کر کھڑا کر دیا۔ اورنگ زیب دوسری مسند کے پاس پہنچ گیا تھا۔

شہزادے نے کمال ادب سے کہا۔

"تشریف رکھئے ملکہ مادر ـــ"

"نہیں شہزادے۔" ملکہ مادر نے انکار کیا۔ "پہلے شہزادے بہادر تشریف رکھیں گے۔"

"آپ ماں ہیں اور ماں کے سامنے بیٹے کھڑے رہتے ہیں۔" شہزادے نے متانت سے کہا۔

"یہ آپ کی سعادتمندی ہے شہزادے۔" ملکہ مادر بولیں۔ "لیکن جب ماں سوالی بن کے آئے تو اسے حاکم وقت کے سامنے کھڑے رہنا پڑتا ہے۔"

"آپ مجھے شرمندہ نہ کیجئے۔" یہ کہہ کے شہزادے نے ملکہ مادر کے دونوں ہاتھ پکڑ

کے انہیں مسند پر بٹھا دیا پھر خود بھی دوسری مسند پر بیٹھ گیا۔

ملکہ مادر نے بغیر کسی تمہید کے گفتگو شروع کر دی۔

انہوں نے کہا۔

"شہزادے بہادر آپ جانتے ہوں گے اگر نہیں جانتے تو میں بتا دوں کہ میں اپنے بیٹے قطب الملک قطب شاہ کی معافی کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں اور امید کرتی ہوں کہ شہزادے بہادر مجھ بوڑھی کی التجا قبول کریں گے۔"

شہزادہ اورنگ زیب سوچ میں پڑ گیا۔ قطب شاہ کی نافرمانیوں کی فہرست اس قدر طویل تھی کہ اسے بالکل تو نہیں معاف کیا جا سکتا تھا۔

"آپ خاموش کیوں ہو گئے شہزادے بہادر۔" ملکہ مادر نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔

"میں یہ تو سوچ ہی نہیں سکتی کہ شہزادے بہادر مجھے خالی ہاتھ واپس کر دیں گے۔"

اورنگ زیب پھر بھی خاموش رہا۔

"کچھ تو بولئے شہزادے بہادر۔ میرا دل ڈوبنے لگا ہے۔" ملکہ مادر نے التجا کی۔

اورنگ زیب نے چونک کے ملکہ مادر کو دیکھا۔ ان کا چہرہ واقعی سفید ہو گیا تھا اور اس پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔

"ملکہ مادر۔" اورنگ زیب نے الفاظ تول تول کے کہنا شروع کئے۔ "میں آپ کو بالکل خالی ہاتھ تو واپس نہیں کروں گا مگر قطب شاہ کی غلطیوں' کوتاہیوں اور نافرمانیوں کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ اگر میں اسے معاف کرنا چاہوں تو دربار دہلی سے اسے معافی نہیں ملے گی۔ شاید آپ کو علم نہیں کہ شہنشاہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں قطب شاہ کا دماغ اس طرح درست کروں کہ آئندہ گولکنڈہ کی طرف سے کسی قسم کی آواز نہ اٹھ سکے۔"

"شہنشاہ کا حکم سر آنکھوں پر۔" جہاندیدہ بڑی بی فوراً بولیں۔ "شہنشاہ کا حکم تو آپ کو سب سے پہلے ماننا ہے مگر انصاف کے ساتھ ساتھ رحم بھی تو ایک صفت ہے۔ اگر حاکم صرف انصاف ہی کرتا رہے اور مخلوق خدا پر رحم نہ فرمائے اور اس کی غلطیوں سے درگزر نہ کریں تو کیا وہ خدا کی نظر میں مقبول رہ سکتا ہے؟"

بڑی بی نے شہزادے کو جو گفتگو اور عمل دونوں میں اپنی مثال نہیں رکھتا تھا' اس طرح سے گھیر لیا تھا کہ آخر اسے کہنا پڑا۔

"ملکہ مادر پہلے اپنے بیٹے کے اعمال نامہ پر غور فرمائیں پھر اس سلسلہ میں کچھ گفتگو ہو سکے گی۔"

"پھر جیسے شہزادے کی مرضی۔" بڑی بی پہلی بار مضمحل ہوئیں۔ "انسان اور نسیاں (ہونی) کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ غلطیاں تو انسان سے سرزد ہوتی ہی ہیں اور اللہ تعالیٰ اسے پھر بھی معاف کر دیتا ہے۔ امید ہے شہزادے بہادر بھی درگزر سے کام لیں گے اور کوئی ایسی صورت نکالیں گے جس سے حکم عدولی کا الزام بھی نہ آئے اور میرے بیٹے کے گناہوں کی سزا بھی کم ہو جائے۔"

شہزادے نے تالی بجائی۔ پہریدار حاضر ہو کر تعظیم بجا لایا۔

شہزادے نے فرمایا۔

"قطب الملک قطب شاہ والی گولکنڈہ کی کوتاہیوں کا محضر پیش کیا جائے۔"

پہریدار واپس گیا۔ ذرا دیر بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں رول کیا ہوا ایک کاغذ تھا۔ پہریدار نے کاغذ شہزادے کو پیش کیا۔ شہزادے نے محضر ہاتھ میں لے کر پہریدار کو واپس جانے کا اشارہ کیا۔

شہزادے نے نہایت نرم لہجے میں فرمایا۔

"اے گولکنڈہ کی محترم مادر ملکہ۔ یہ وہ محضر فہرست ہے ان کوتاہیوں اور زیادتیوں کی جو قطب شاہ سے گذشتہ ایک سال میں سرزد ہوئی ہیں۔ اس کی نقل حضور شاہی میں (شہنشاہ شاہجہاں) بھیجی جا چکی ہے۔ ہم اس محضر نامہ کو پڑھ رہے ہیں۔ ملکہ مادر توجہ سے غور فرماتی جائیں۔"

شہزادے بہادر نے محضر نامہ کھولا اور اسے آہستہ آہستہ پڑھنا شروع کیا۔

"پہلی بات یہ ہے کہ قطب الملک حکومت کرنے کے اہل نہیں ہیں۔"

"دوسری بات یہ کہ وہ رعایا پر حد سے زیادہ ظلم و جور کرتے ہیں۔"

"تیسرے یہ کہ وہ رعایا کا مال و متاع جبراً چھین لیتے ہیں جیسا کہ انہوں نے راجہ کرناٹک کے ساتھ کیا۔ راجہ کرناٹک کے نواسے اور نواسی ہمارے پاس فریاد لے کے آئے اور وہ اب تک ہمارے مہمان ہیں۔"

"چوتھی بات یہ کہ قطب الملک کی رعیت ان کے ظلم و جور کے خلاف بے حد نالاں

ہیں اور روز ہمارے پاس نئی نئی شکائتیں لے کے آتی ہے۔"

"پانچویں یہ کہ وہ جہالت اور نادانی کے سبب بڑے صحابہ کو گالیاں دیتا ہے اس نے کفر و زندقہ کی اس بات کو اپنی ریاست میں رواج دے رکھا ہے۔"

"سب سے آخری اور اہم بات یہ کہ وہ ریاست کے اہل سنت و جماعت کے لوگوں پر ظلم و جور روا رکھتا ہے اور تکلیفیں پہنچانے سے باز نہیں آتا۔"

اس جگہ پر ناچیز یہ عرض کرنے کی جرات کرے گا کہ قطب الملک قطب شاہ والی گولکنڈہ کی یہ کوتاہیاں اور زیادتیاں ہندو مورخ جاوند ناتھ سرکار جیسے متعصب کی نظروں میں کوئی اہمیت نہ رکھتی ہوں مگر شہزادہ اورنگ زیب ان باتوں سے آگاہ ہو کر اس قدر غضب ناک ہوا تھا کہ وہ شہنشاہ کا اشارہ پاتے ہی گولکنڈہ کی طرف خود ہی روانہ ہو گیا تھا۔

شہزادے نے اتمام حجت کے مادر ملکہ سے کہا۔

"ان فرمودہ الزامات کے سلسلے میں اگر مادر ملکہ کچھ کہنا گوارہ فرمائیں تو ہم سننے کے لئے تیار ہیں۔"

ملکہ مادر شاید اس بات کی منتظر تھیں۔ انہوں نے فوراً کہا۔

"اے شہزادے بہادر اور اے مستقبل کے تاجدار۔ غلام اپنے آقا سے بحث، تکرار اور سوال و جواب کی جرات نہیں کیا کرتے۔ سو میں بھی یہی کہتی ہوں۔ مجھے محضر نامہ میں یا اس سے الگ وہ تمام الزامات جو قطب شاہ پر لگائے جاتے ہیں ان کے درست ہونے پر قطعی کوئی شبہ نہیں۔ میں تو اپنے بیٹے کی طرف سے معذرت و معافی اور صرف معذرت اور معافی مانگنے کے لئے حاضر ہوئی ہوں۔ میں شہزادے بہادر کے انصاف کو آواز نہیں دے رہی بلکہ میں تو ان کے کرم اور عفو و درگزر کے دروازے پر دستک دینے آئی ہوں۔"

پہلے شہزادے نے اپنی باتوں سے ملکہ مادر کو لاجواب کر دیا تھا اور اس وقت ملکہ مادر نے آخری جملے ادا کر کے شہزادے کو نہ صرف لاچار کر دیا بلکہ وہ مادر ملکہ کی حاضر جوابی پر ششدر رہ گیا۔

اور آخر شہزادے بہادر کو کہنا پڑا۔

"اے والی گولکنڈہ کی مادر مہربان۔ اللہ تعالیٰ اپنی صفت "رحم" کو اس قدر عزیز رکھتا ہے کہ اس نے اپنے محبوب احمد مجتبےٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے بڑا

اعزاز "رحمت اللعلمین" کہہ کر دیا۔ میں اسی رحمت اللعلمین کا ایک حقیر بندہ ہوں۔ فرمایئے کہ اپنے بیٹے کے لئے آپ کیا رعایت چاہتی ہیں؟"

مادر مہربان نے عرض کیا۔

"شہزادے بہادر۔ میں قطب شاہ کی طرف سے غیر مشروط معافی نامہ پیش کرتی ہوں۔ اس کے ساتھ ہر طرح کی احتیاط' انسانیت اور شرافت کا اقرارنامہ بھی خدمت عالی میں پیش کرتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ میرے بیٹے کو غیر مشروط معافی عطا کی جائے۔"

اورنگ زیب چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔

"مگر قطب شاہ کے خیالات جو بڑے صحابہ کرام کے بارے میں ہیں ان کے بارے میں ملکہ مادر کیا فرمائیں گی؟"

"کیا خوب۔" ملکہ مادر کے جھریوں بھرے چہرے پر مسرت کی لکیریں ابھر آئیں۔ "جو بات میں کہنا چاہتی تھی وہ بات شہزادے بہادر نے خود ہی فرما دی۔ میں اپنے بیٹے قطب شاہ کے مذہبی خیالات کے بارے میں اس قدر واضح ضمانت دوں گی کہ شہزادے بہادر اس سے انکار نہ کر سکیں گے۔ کہئے آپ کو منظور ہے؟"

"کیوں نہیں۔ ر قطب شاہ کے مذہبی خیالات میں کسی تبدیلی کا ثبوت مل جائے تو پھر ہمیں فیصلہ کرنے میں کوئی دقت نہ ہو گی۔" شہزادے نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"شہزادے عالی۔" ملکہ مادر نے کہا۔ "میں بڑے عجز کے ساتھ آپ کی خدمت میں عرض کروں گی کہ ملک شاہ اور میں دونوں ہی شہزادے بہادر کی خوشنودی حاصل کرنے اور اپنا دل صاف کرنے کے لئے یہ درخواست پیش کرتے ہیں کہ ہم شہزادے بہادر کے فرزند ارجمند شہزادے سلطان محمد کے رشتہ ازدواج کے لئے ملک شاہ کی دختر نیک اختر کا رشتہ پیش کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتے ہیں اور یہ بھی عرض کرتے ہیں کہ قطب شاہ کی بیٹی کا خطبہ نکاح شہزادے محمد سلطان کے ساتھ ملت حنفیہ کے آئین و رسم کے مطابق پڑھا جائے گا۔"

شہزادہ اورنگ زیب نے حیران نظروں سے ملکہ مادر کو دیکھا۔

"ہمیں منظور ہے ملکہ مادر۔ اب کسی دوسری ضمانت کی ضرورت نہیں۔"

ایک تاریخی حوالہ کے مطابق قطب شاہ نے پیشکش کی تھی کہ وہ پچھلے تمام برسوں کا خراج یک مشت ادا کرے گا۔ شہزادے اورنگ زیب نے یہ رقم بڑھا کر ایک کروڑ کر دی اور قطب شاہ نے اس تبدیل شدہ رقم کو بھی آیت رحمت سمجھا اور اسے منظور کر لیا۔

مادر ملکہ یعنی قطب شاہ کی والدہ کے جانے کے بعد اورنگ زیب نے ایک قاصد شہزادہ محمد سلطان کے پاس حیدر آباد دوڑایا اور اسے اطلاع دی:۔

"تمہارا نکاح قطب الملک قطب شاہ کی بیٹی ے ساتھ ان کی درخواست پر ہم نے منظور کر لیا ہے۔ تاریخ عقد اسی ماہ کی چھبیویں طے ہوئی ہے۔ امید ہے کہ تم سعادت مندی کا ثبوت دو گے۔"

شہزادہ محمد سلطان کو کیا عذر ہو سکتا تھا۔ حیدر آباد اس نے فتح کر لیا تھا اور گولکنڈہ اس کے لئے اس کے باپ شہزادہ اورنگ زیب نے حاصل کر لیا تھا۔ شادی سے ایک دن پہلے وہ باپ کی خیمہ گاہ پر گیا اور ان سے ضروری ہدایات حاصل کر کے حیدر آباد واپس آ گیا۔

شہزادہ محمد سلطان اور قطب شاہ کی بیٹی کی شادی دھوم دھام سے تو نہیں مگر بڑے باوقار انداز میں ہوئی۔

نکاح کے دن اورنگ زیب نے قطب الملک کے لئے اپنے میرعدل اور شیخ نظام قاضی اور محمد طاہر کے ہاتھ خلعت حاضرہ' تسبیح مروارید اور دو ہاتھی پورے شاہانہ ساز و سامان کے ساتھ گولکنڈہ روانہ کئے۔ ان تحائف اور خلعت کو وصول کرنے کے لئے قطب الملک قلعہ کے دروازے پر خود آیا۔

اس نے تحفے لئے اور شاہی نمائندوں کو دروازہ کے متصل حویلی میں اتارا۔ وہیں اپنی لڑکی کا خطبہ نکاح پڑھوایا اور ملت حنفیہ کے آئین اور رسم کے مطابق نکاح کے شرائط طے کئے۔ پھر محمد طاہر شمس الدین اور شاہ بیگ خاں دلہن کی ڈولی لینے کے لئے قلعہ میں پہنچے۔ شہزادی اپنی دادی یعنی ملکہ مادر کے ساتھ ڈولے (فینس) میں سوار ہوئی اور شہزادے کے خیمے تک لائی گئی۔ قطب الملک نے دوسرے تحائف کے ساتھ اپنی بیٹی کو دس لاکھ الجوز جہیز دیئے تھے۔

یوں اس لڑائی کا خاتمہ بخیر ہوا جو رنی پر میرجملہ اور اس کے بیٹے میر محمد امین کی خاطر شروع ہوئی تھی۔ پھر میرجملہ گولکنڈہ کے نواح میں شہزادہ اورنگ زیب کی خدمت میں سلام

کے لئے حاضر ہوئے۔ انہوں نے شہزادے کی خدمت میں تین ہزار اشرفیاں نذر کیں۔ اورنگ زیب نے اس کے جواب میں میرجملہ کو خلعت فاخرہ عطا کی۔ دو گھوڑے اور دو ہاتھی عنایت کئے اور محبت سے بہت دیر تک گفتگو فرماتے رہے۔

دوسرے دن شہزادہ اورنگ زیب خود ان کی قیام گاہ پر گیا۔ اس عزت افزائی پر میرجملہ نے اورنگ زیب کے حضور ایک قطعہ الماس' دو لعل' نو زمرد' ایک نیلم' ساٹھ دانے مروارید کے اور چھ ہاتھی' پانچ گھوڑے نذر میں پیش کئے۔ شہزادہ محمد سلطان کو بھی کئی چیزیں تحفہ میں دیں۔ اس سے زیادہ اس کی اور کوئی تفصیل نہیں ملتی۔

شہزادہ محمد سلطان اور قطب شاہ کی بیٹی کی شادی سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اگر قطب شاہ نے اپنی مذہبی باتوں سے دو رہنے کا اقرار نہ کیا ہوتا تو وہ رسم آئین ملت حنفیہ کے شرائط پر عقد کی پابندی نہ کرتا۔

سری داسی

ایک طرف شہزادہ محمد سلطان حیدر آباد میں انتظامات میں مصروف تھا اور اس کا والد شہزادہ اورنگ زیب گولکنڈہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھا اور دوسری طرف ان میدان جنگوں سے دور سری داسی اور عبد المعبود کے بیٹے عبد الودود محبت کی ٹھنڈی آگ میں ہنستے کھیلتے ہاتھ ڈال بیٹھے تھے۔ شہزادہ اورنگ زیب اپنے معتمد عبد المعبود کو اپنے ساتھ گولکنڈہ لے گیا تھا۔ سری داسی کا بھائی بھی مغل لشکر کی جنگ دیکھنے امیر عبد المعبود کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔ اب اس حویلی میں عبد المعبود کے بیٹے امیرزادہ ودود کا راج تھا۔

امیرزادہ ودود کی دونوں بہنیں نگارش اور پرتو' راجکماری سری داسی کی گہری سہیلیاں بن گئی تھیں۔ یہ حویلی کیا تھی اچھا خاصا ایک محل تھا۔ درجنوں کمرے' راہداریاں پھر اس میں ایک چھوٹا سا پائیں باغ بھی تھا جس میں ہردم پھول کھلتے مہکتے رہتے تھے۔ تینوں لڑکیوں کا عام طور سے پائیں باغ ہی میں جمگھٹا لگتا تھا۔

امیرزادہ' ودود نے جس دن سے سری داسی کو اس حویلی میں دیکھا تھا اس دن سے انہوں نے باہر کی ہوا کھانا چھوڑ دی تھی۔ وہ تمام دن حویلی میں گھسا رہتا۔ اس کے تمام یار

دوست شکاری تھے مگر عبد الودود نے شکار کھیلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ دوستوں نے محسوس کیا کہ ودود شکار پر جانے سے کترانے لگا ہے تو انہوں نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور بغیر اسے ساتھ لئے شکار پر جانے لگے۔

عبد الودود کے والدین اس کے اس طرح گھر پر رہنے سے بہت ہی مسرور تھے۔ کہاں تو ہفتوں بعد عبد الودود کی صورت دکھائی دیتی تھی اور کہاں اب یہ حال تھا کہ ہفتہ عشرہ بھی عبد الودود حویلی سے باہر نکلا اور کچھ دیر بعد واپس آ جایا کرتا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ودود دن بھر سری داسی کے پیچھے لگا رہتا تھا۔ ودود ایک غیور اور باکردار جوان تھا پھر وہ دو جوان بہنوں کا بھائی بھی تھا۔ اس لئے وہ بہنوں کے سامنے اپنے وقار کو برقرار رکھتا اور کوئی اوچھی حرکت نہ کرتا کہ اسے بہنوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔

وہ سری داسی سے ملتا ضرور مگر خود اس سے ملنے نہ جاتا بلکہ انتظار کرتا کہ اس کی بہنیں کسی کام کے لئے اسے پائیں باغ میں بلائیں اور اسے اس بہانہ سری داسی سے ملنے اور گفتگو کرنے کا موقعہ ملے۔ یوں اس کا دل ضرور چاہتا کہ وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت سری داسی کی صحبت میں گزارے مگر اس کا موقعہ اسے کم ہی ملتا تھا۔

اس دن وہ کسی کام سے باہر نکلا تھا کہ تھوڑی ہی دیر بعد واپس آگیا۔ حویلی سے باہر آنے جانے کا راستہ پائیں باغ کے ساتھ والی پھولوں بھری روش سے گزرتا تھا۔ اس لئے سری داسی اور اس کی بہنیں اسے آتے جاتے دیکھتی تھیں اور اس کے بارے میں آپس میں بھی گفتگو کرتی تھیں۔ امیرزادہ ودود روش سے گزرتے ہوئے اکثر محسوس کرتا کہ لڑکیاں اس کی طرف اشارے کر کے باتیں کرنے لگتی ہیں۔ وہ کیا باتیں کرتی ہیں۔ اس کا نہ اسے پتہ تھا اور اس نے کبھی پوچھنے کی کوشش کی تھی مگر اسے یقین ضرور تھا کہ باتیں اسی کی ہوتی ہیں۔

امیرزادہ ودود کمرے میں واپس پہنچا تھا کہ اس کی بہن نگارش آ گئی۔

"کیا حال ہے تمہارا ودود؟" نگارش نے جیسے اس پر طنز کیا۔

"ٹھیک ہوں مگر ـــــ" ودود کہتے کہتے رکا۔

نگارش مسکرائی۔

"ٹھیک تو ہو۔ یہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں۔ سری داسی کے بارے میں کچھ پتہ لگا

نہیں؟"

"نہیں تو ---" ودود چونک پڑا۔ "مجھے تو کچھ نہیں بتایا اس نے۔"

"بتایا تو مجھے بھی کچھ نہیں مگر میں نے کچھ نہ کچھ پتہ کرلیا ہے۔" نگارش نے ذرا رازدارانہ انداز میں کہا۔ "سری داسی بہت پریشان ہے آج کل۔"

"کیا پہیلیاں بجھا رہی ہو نگارش؟" ودود چڑ گیا۔ "صاف صاف کیوں نہیں بتاتیں۔ کیا ہوا سری داسی کو---؟"

"وہ واپس جانے والی ہے۔" نگارش نے صاف آواز میں بتایا۔ "خبر آئی ہے کہ گولکنڈہ کے قطب شاہ کا دماغ ٹھکانے آگیا ہے۔ اسے وہ مار پڑی ہے کہ توبہ بھلی۔ وہ تو شہزادے بہادر کو اس پر رحم آگیا ورنہ گولکنڈہ کا نام و نشان مٹ جاتا۔"

"مگر سری داسی کیوں واپس جا رہی ہے؟" ودود کو فکر سی لگ گئی۔ "اس نے تو کہا تھا کہ وہ اب یہاں سے کہیں---"

اسی وقت سامنے سے سری داسی آتی دکھائی دی۔ ودود چپ ہو گیا۔

"آج پوچھنا اس سے۔" نگارش نے کہا۔ "اب تک اسے ہم لوگوں کی ضرورت تھی مگر اب شاید اسے ہماری ضرورت نہیں رہی۔ وہ کرناٹک واپس جانا چاہتی ہے۔"

نگارش اسی طرف جانے لگی جدھر سے سری داسی آ رہی تھی۔ نگارش' سری داسی کے پاس سے گزری تو سری نے کہا۔

"کہاں جا رہی ہو نگارش۔ میرے ساتھ آؤ۔ بہت سی باتیں کرنا ہیں تم سے۔"

"مجھ سے باتیں کرنا ہیں یا ودود سے؟" اور نگارش نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

سری داسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بولی۔

"نگارش۔ میں تم لوگوں کا احسان زندگی بھر نہ بھلا سکوں گی۔ جہاں تک ودود کا تعلق ہے۔ وہ تو میرا جیون ہے میری زندگی ہے۔ اسے تو میں---"

سری داسی نگارش کو اپنے ساتھ واپس لے آئی۔ ابھی یہ تین ایک جگہ اکٹھے ہوئے تھے کہ ان کی چوتھی ساتھی بھی آگئی یعنی پرتو۔

"چلو اچھا ہوا۔ پرتو بھی آگئی۔"

سب کے دل دھک دھک کر رہے تھے مگر ان کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ پرتو

نگارش سے بڑی تھی اور وہ سب سے آخر میں آئی تھی اس لئے بات بھی اسی نے شروع کی۔

"میرے پاس ایک خبر ہے آج؟" پرتو نے کہا۔

"میرے پاس اس سے زیادہ اہم خبر ہے۔" یہ دعویٰ نگارش نے کیا۔

ودود مسکراتے ہوئے بولا۔

"اور میرے پاس کوئی خبر نہیں ہے۔"

اس پر سب نے قہقہہ لگایا۔

سری داسی بولی۔

"میرے پاس جو خبر ہے وہ کسی کے پاس نہیں۔"

"میں جانتی ہوں تمہارے پاس کیا خبر ہے؟" یہ نگارش کی آواز تھی۔

"نگارش اگر بتا دو تو میں تمہاری داسی ہو جاؤں گی۔" سری داسی نے اکڑ کے کہا۔

"اچھا سب سنو۔" نگارش نے کہا۔ "سری داسی کے نانا نے اسے کرناٹک واپس بلایا ہے اور سری داسی واپس جانے والی ہے۔"

"غلط بالکل غلط---" سری داسی نے تردید کی۔ "یہ خبر تین دن پرانی ہے۔ میری خبر تو آج کی ہے۔"

سب نے حیران نظروں سے سری داسی کو دیکھا۔

ودود نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"کیا تم واقعی واپس جا رہی ہو؟"

"یہ کس نے کہہ دیا---" سری داسی نے سختی سے تردید کی۔ "یہ تو ٹھیک ہے کہ مجھے کرناٹک واپس بلایا جا رہا ہے کیونکہ وہاں کے حالات ٹھیک ہو گئے ہیں مگر واپس جانا نہ جانا میرے اختیار میں ہے۔ آپ لوگوں نے کیوں سمجھ لیا ہے کہ میں واپس چلی جاؤں گی۔"

"تو کیا تم نہیں جاؤ گی؟" ودود بے چین ہو گیا۔

"شاید---" سری داسی نے آگے کچھ کہا۔ وہ ذرا دیر چپ رہی پھر کہا۔

"کرناٹک میں میرا کون ہے۔ نہ ماں نہ باپ۔ نہ بھائی نہ بہن۔ صرف یہی ایک بھائی ہے جو میرے ساتھ ہے پھر میں وہاں جا کے کیا کروں گی۔ اپنے ملک اپنے وطن سے سب کو

محبت ہوتی ہے۔ مجھے بھی محبت ہے مگر جب موت کا دھڑکا لگ جائے تو پھر کچھ اچھا نہیں لگتا۔ میں سکون سے رہنا چاہتی ہوں۔ ہنسی خوشی رہنا چاہتی ہوں۔ بھائی بہنوں میں رہنا چاہتی ہوں۔ خالہ خالو میں رہنا چاہتی ہوں---- مگر---- مگر میں سب کچھ آپ لوگوں سے کیوں کہہ رہی ہوں۔ آپ نے تو مجھ سے جھوٹے منہ بھی نہیں کہا کہ "سری داسی" تم یہیں رہو۔ کرناٹک مت جاؤ۔ ٹھیک ہے۔ آپ کیوں کہیں۔ میں آپ کی کون لگتی ہوں۔ آخر غیر ہوں نا۔ میں آپ کے مذہب کی بھی نہیں ہو۔ پھر آپ مجھ سے کیوں واسطہ رکھیں۔ مجھ سے کیوں پوچھیں کہ "سری داسی" تیرے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ میں---- میں----"

اور سری داسی کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ ساون بھادوں کی طرح برسنے لگیں۔ ودود۔ نگارش۔ پرتو سب دم بخود تھے مگر ان کی آنکھیں بھی اشک آلود ہو گئی تھیں۔ سری داسی بے انتہا جذباتی ہو گئی تھی۔ ان لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ سری داسی ان لوگوں کے اس قدر قریب ہو گئی ہے کہ وہ اس گھر کو اپنا گھر سمجھنے لگی ہے۔

گولکنڈہ کے قطب الملک قطب شاہ کے شہزادے کے آگے ہتھیار ڈالنے اور معافی مانگنے کے بعد گولکنڈہ کے ساتھ کرناٹک کے حالات بھی ٹھیک ہو گئے تھے۔ اگر قطب شاہ میں یہ طاقت نہ رہ گئی تھی کہ وہ کرناٹک یا میرجملہ کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ ان سب کا یہی خیال تھا کہ سری داسی اب اپنے گھر' نانا کے گھر واپس چلی جائے گی۔

سری داسی کرناٹک کی راجکماری تھی۔ عبد المعبود کا گھر اگرچہ ایک امیر کا گھر تھا مگر سری داسی کو یہاں کرناٹک کے راج محل جیسا آرام تو نہیں مل سکتا تھا مگر اس وقت کی سری داسی کی جذباتی انداز بیان جس میں کوٹ کوٹ کر سچائی بھری ہوئی تھی' نے یہ بات ظاہر کر دی تھی کہ سری داسی تمام راجکماریوں جیسی نہیں بلکہ اس کے سینہ میں ایک دھڑکتا ہوا دل ہے اور اس دل میں دوسروں کے لئے محبت و پیار ہے۔

سب سے پہلے پرتو نے معذرت پیش کی۔

"سری داسی۔ مجھے افسوس ہے کہ ہم لوگ تمہیں بالکل عام راجکماریوں کی نسل سے سمجھ بیٹھے تھے مگر یہ ہرگز معلوم نہ تھا کہ تمہارے سینہ میں بھی ہمارا ہی جیسا دل ہے اور تم محبت کو محبت اور خلوص کو خلوص سمجھتی ہو۔"

"ہاں سری داسی۔" نگارش نے بھی اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہا۔ "ہم نے یہ تو نہیں سوچا تھا کہ تم یہاں سے نہ جانے کا سوچ سکتی ہو۔ ہم تو یہی سمجھے تھے کہ تمہیں بھی ہم سے جدائی کا اتنا ہی صدمہ ہو گا جتنا ہمیں ہے مگر اب معلوم ہوا کہ تم تو جدائی کے نام کو بھی نہیں سننا چاہتی ہو۔ ہم تمہارے جذبہ کی جس قدر بھی قدر کریں وہ کم ہے۔"

سری داسی کی اس وقت تک روتے روتے ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ پرتو اسے اپنی گود میں لے کر بیٹھ گئی تھی۔ ودود ایک ایک کا منہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے دوستوں سے محبت بھرے شعر سنے تھے۔ محبت بھری باتیں بھی سنی تھیں۔ اس نے ممکن ہے کہ محبت کا کوئی تصور بھی باندھا ہو مگر اس وقت جو صورت حال پیدا ہو گئی تھی وہ جیسے ودود کو بتا رہی تھی کہ او نادان۔ محبت کے اشعار اور محبت کی باتیں ہرچند کہ اچھی لگتی ہیں مگر محبت اور اصل محبت تو وہ ہے جسے وہ اس وقت اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

محبت زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتی ہے۔ محبت مذہب و ملت کے بندھنوں کو بھی توڑ ڈالتی ہے۔ کون تصور کر سکتا تھا کہ راج محل کرناٹک میں پلنے والی ایک اکھڑ لڑکی ایک مسلمان گھرانے میں ایک مسلمان جوان کی محبت میں اس قدر بے خود ہو جائے گی کہ وہ خود مجسم محبت بن جائے گی۔

سری داسی کی یہ کیفیت ایسی نہ تھی جسے نگارش اور پرتو اپنے دل میں چھپا لیتیں اور منہ پر تالے لگا لیتیں۔ ودود تو اسے ضبط کر سکتا تھا۔ خاموش رہ سکتا تھا مگر اس کی بہنیں جو اگرچہ محبت کی تپش سے ابھی تک دور تھیں مگر سری داسی کی بے چینی نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ تمام باتیں اپنے بڑوں یعنی ماں تک ضرور پہنچائیں۔

"اماں--" نگارش نے رات کو ماں سے بات چھیڑی۔ پرتو کو وہ اپنے ساتھ شاید مدد کے لئے لائی تھی۔

ماں نے منہ اٹھا کر "ہوں" کہا پھر سر تکیہ پر رکھ دیا۔

"اماں-- ذرا ہوش میں آ۔ میں تم سے ایک بہت بڑی بات کہنا چاہتی ہوں۔" نگارش نے ماں کو گھبرا دیا۔ وہ اٹھ کے بیٹھ گئیں۔

"کیا بات ہے۔ خیریت تو ہے؟" ماں پریشان ہو گئی۔

"ماں۔ سری داسی کہتی ہے-----" پر بات جیسے اس کے حلق میں اٹک گئی۔ اس

نے پرتو کی طرف شاید مدد کے لئے دیکھا۔

"ہاں ہاں بتاؤ۔ کیا کہتی ہے سری داسی؟" ماں نے حیرت اور دلچسپی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ پوچھا۔

"ماں۔ وہ کہتی ہے ---" مگر نگارش کی آواز پھر بھی حلق میں اٹک گئی۔

"ماں۔ میں بتاتی ہوں ---" پرتو نے نگارش کو ایک طرف دھکیلا اور اس کی جگہ بیٹھ کے بتایا۔ "ماں۔ بات دراصل یہ ہے کہ سری داسی ہمارے گھر سے اپنے گھر واپس نہیں جانا چاہتی۔"

ماں اپنی بچیوں کی سنجیدگی پر ہنس پڑی۔

"ارے پاگل ہو گئی ہو لڑکیو۔ یہ کون سی خاص بات ہے۔ پھر ہم اسے کب گھر سے نکال رہے ہیں۔ بڑی ملنسار بچی ہے سری داسی۔ اس کا دل لگ گیا ہے یہاں۔ مگر تم لوگ پریشان کیوں ہو؟"

"ماں --- ما ---" پرتو بھی جھجکی۔ "آج پائیں باغ میں بھیا بھی ہمارے ساتھ تھے۔"

"تو کیا ہوا ---؟" ماں بولیں۔ "اب تو وہ روز ہی تم لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ میں تو خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ ودود نے گھر میں رہنا تو سیکھا۔ پہلے ہفتوں ادھر ادھر "واہی تواہی" نہ جانے کہاں کہاں گھومتا پھرتا تھا۔ اب دیکھو تو کیسا خوش خوش رہتا ہے تمہارے ساتھ؟"

"ہمارے ساتھ نہیں ماں۔ ودود تو سری داسی کے ساتھ خوش رہتا ہے۔" آخر پرتو نے تیر چلا دیا۔

ماں ہکا بکا رہ گئی۔ پھر سنبھل کے بولی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔ تم لوگ کہنا کیا چاہتی ہو؟"

پرتو کو غصہ آ گیا۔ بولی۔

"اور کیا کہنا ہے۔ سب کچھ کہہ تو دیا ہے۔"

جہاندیدہ ماں بات کی تہہ کو پہنچ گئی تھی۔ وہ دراصل تصدیق کرنا چاہتی تھی۔ بیٹی نے غصہ میں آ کے پرزور طریقے سے تصدیق کر دی۔

"اچھا تو یہ بات ہے ---" مگر غصہ کرنے یا بگڑنے کے بجائے ماں کا چہرہ جیسے کھل گیا تھا۔ ان کی آنکھیں مسکرانے لگی تھیں۔

پرتو اور نگارش دونوں کو تعجب تھا کہ ماں بگڑنے کے بجائے مسکرا رہی تھیں۔ حالانکہ ان کے خیال میں یہ بات بری تھی۔ بڑے بوڑھوں کو انہوں نے بعض لڑکیوں اور لڑکوں کی اس طرح کی باتوں پر ناک منہ چڑھاتے دیکھا اور سنا تھا۔ مگر ان کی ماں تو شاید کسی اور طرح کی عورت تھی۔ وہ تو جیسے خوش ہو گئی یہ بات سن کر۔

ماں نے خود ہی سوال کیا۔

"اچھا پرتو۔ یہ بتا سری داسی تجھے کیسی لگتی ہے؟"

"اچھی --- اور بہت اچھی لگتی ہے --- مگر ---" پرتو کہتے کہتے رکی۔

"اور تجھے ---" ماں نے پلٹ کر نگارش سے وہی سوال کیا۔

"ماں۔ سری داسی تو جیسے پری ہے پری۔" نگارش نے بے دھڑک کہہ دیا۔

"اچھا یہ بتا۔" اب ماں دونوں سے مخاطب تھی۔ "ودود اور سری داسی کا جوڑا کیسا رہے گا؟"

"کیا کہہ رہی ہو ماں۔" پرتو نے احتجاج کیا۔ "سری ہندو ہے اور ہم مسلمان یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ باتیں تمہارے سوچنے کی نہیں۔" ماں نے ذرا سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہر مذہب کی لڑکی سے شادی کی اجازت دی ہے مگر چند قاعدے قرینوں کے ساتھ۔ یہ باتیں تو ہم بعد میں دیکھیں گے۔ پہلے تم لوگ اپنی اپنی پسند بتاؤ؟"

پرتو نے کوئی جواب نہ دیا۔ نگارش ضرور چہکی۔

"ماں اگر سری داسی ہمارے گھر رہ جائے تو بس مزہ آ جائے۔ میں تو سمجھوں گی مجھے تیسری بہن مل گئی ہے۔"

"ہوں۔" نگارش کی ماں بس ہوں کہہ کر رہ گئیں۔

بات آئی گئی تو نہیں ہوئی مگر وقتی طور پر دب گئی۔ اس لئے کہ قطب الملک والی گولکنڈہ کے خلاف گیا ہوا لشکر ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ شہزادہ اورنگ اور اورنگ زیب کا بیٹا شہزادہ محمد سلطان معہ اپنی بیگم یعنی بنت قطب شاہ کے واپس آ گئے تھے لیکن ودود کے

والد عبد المعبود ابھی تک گولکنڈہ میں تھے۔ شہزادے نے ان کے سپرد کچھ کام لگا دیئے تھے۔

پھر دو جشنوں کا غلغلہ اٹھا۔ ایک جشن گولکنڈہ کی فتح کا۔ گولکنڈہ اگرچہ فتح نہ ہوا تھا مگر جس انداز سے صلح نامہ ترتیب دیا گیا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ قطب الملک کا زور ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا ہے۔ اس لئے یہ صلح نامہ ہی فتح کی نشانی تھا۔

دوسرا جشن شہزادہ محمد سلطان کی شادی کا تھا۔ اگرچہ اورنگ زیب دھوم دھام اور باجے گانے کو پسند نہ کرتا تھا مگر اس کے عمائدین نے زور دیا کہ یہ اس کی اولاد کی پہلی خوشی ہے کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی چاہئے۔ چنانچہ یہ "کچھ نہ کچھ" بہت کچھ میں بدل گیا۔ عمائدین اور امراء نے خوب خوب تیاریاں کیں۔ باجا گانا بھی ہوا اور رقص و موسیقی کی محفلیں بھی جمیں۔ غریب غرباء کو بھی جشن میں شریک کیا گیا اور ان میں نقد رقم اور پارچہ جات تقسیم کئے گئے۔

محمد سلطان کے دادا یعنی شہنشاہ ہند شاہجہاں نے بھی پوتے کی شادی کی مبارک باد بھیجی۔ آگرہ سے ایک وزیر خلعت لے کر حاضر ہوا اور وہ خلعت اور ایک لاکھ کی رقم شہزادے کو تحفہ میں دی گئی۔ نیز اس کا منصب بلند کر دیا گیا۔

عبد المعبود گھر واپس آ گئے تھے مگر شہزادے اورنگ زیب نے بیٹے کی شادی کے چند انتظامات بھی ان کے سپرد کر دیئے تھے اس لئے نگارش کی ماں شوہر سے کوشش کے باوجود بیٹے کے سلسلے میں کوئی گفتگو نہ کر سکی۔ بارے اب کچھ اطمینان ہوا تھا۔ جشن کے ہنگامے سرد پڑ چکے تھے۔ عبد المعبود نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ ان کی بیوی ان سے کسی مسئلہ پر گفتگو کی خواہشمند ہے۔

پس ایک دن خود انہوں نے ہی بات چھیڑ دی۔

"کیا بات ہے بیگم۔ تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو؟"

"کہنا تو بہت کچھ چاہتی ہوں مگر آپ کو فرصت تو ملے۔" بیوی بولیں اور مسکرائیں بھی۔

"شکر ہے کہ تم نے مسکراہٹ سے گفتگو شروع کی ہے۔" عبد المعبود نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی فکر و پریشانی کی بات نہیں؟"

"بالکل نہیں ہے---" بیوی اور زیادہ کھل پڑیں۔ "بلکہ خوشی اور بہت بڑی خوشی کی

خبر ہے۔"

"تو پھر نیک کام میں دیر کس بات کی۔" عبد المعبود بھی مسکرا دیئے۔ "فوراً" بتاؤ کس بات کی خوشی ہے یا کون سی خوشی ہونے والی ہے۔"

"خوشی کی بات یہ کہ آپ کے صاحبزادے یعنی ودود بیٹے جوان ہو گئے ہیں۔" ماں بیان کرتے ہوئے خوشی سے کھلی جا رہی تھیں۔

"صاف ظاہر ہے۔ اٹھارہواں سال ہے اس کا---" عبد المعبود نے بڑے فخر سے کہا۔ "جوان تو وہ ہو ہی گیا ہے مگر وہ خوشی کی خبر کون سی ہے جو تم سنانا چاہتی ہو؟"

عبد المعبود کی بیوی کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ بولیں۔

"آپ کا ودود شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"تو پھر بسم اللہ۔ فوراً" شادی کا انتظام کرو۔"

"ودود نے دلہن بھی تلاش کر لی ہے۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ تم ایک بڑی زحمت سے بچ گئیں۔" عبد المعبود کچھ رکے پھر بولے۔ "مگر یہ تو بتاؤ کہ دلہن تمہیں بھی پسند ہے کہ نہیں؟"

"مجھے بھی پسند ہے اور-----"

"تمہاری لڑکیوں یعنی نگارش اور پرتو کو بھی۔ یہی بات ہے نا؟" عبد المعبود نے بڑی مسرت سے کہا۔

بیوی نے حیران نظروں سے شوہر کو دیکھا اور بولیں۔

"آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کون ہے۔ کس کی بیٹی ہے۔ کہاں رہنے والی ہے؟"

"اس کی کیا ضرورت ہے---" عبد المعبود نے کہا۔ "تمہیں بہو پسند ہے۔ لڑکیوں نے بھی بھاوج کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کر دیا ہے۔ ودود نے تو خود ہی اسے منتخب کیا ہو گا۔ پھر میں دخل دینے والا کون ہوں۔ اب آگے بتاؤ۔ کب شادی ہونا ہے اور کیا کیا انتظامات ہونے ہیں؟"

"آپ بھی بہت بھولے ہیں۔ شادی بیاہ کوئی ہنسی کھیل تو نہیں۔" بیوی نے مصنوعی غصے کا اظہار کیا۔ "بڑی دقتیں ہیں اس شادی میں۔ لڑکی کے والدین نہیں ہیں۔ صرف ایک بھائی ہے۔"

"یہ تو اور اچھا ہوا۔ سسرال والوں کی طرف سے کسی اختلاف کا دھڑکا ہی نہیں۔"

"ہاں۔ یہ دھڑکا تو نہیں مگر اس بات کا دھڑکا تو ہے کہ کہیں لڑکی والے وَدود کے ساتھ شادی کرنے سے انکار نہ کریں۔" بیوی نے فکرمند لہجے میں بتایا۔

"تم عجیب عورت ہو نیک بخت۔" عبد المعبود چڑچڑے ہو گئے۔ "لڑکی تم سب نے پسند کی ہے۔ خود ودود کو بھی لڑکی پسند ہے تو پھر لڑکی والے کیوں انکار کریں گے۔ ہم کوئی فقیر تو نہیں ہیں۔ وہ کون اتنا بڑا گھرانہ ہے جو شہزادے بہادر اورنگ زیب کے بیٹے کو لڑکی دینے سے انکار کرے۔"

"اچھا لو۔ میں بتاتی ہوں۔" بیوی سنبھل کے بیٹھ گئیں۔ "تم نے کبھی سری داسی کو غور سے دیکھا ہے؟"

عبد المعبود چونکے، بولے۔

"تو۔۔۔ تو۔۔۔ کیا تم لوگوں نے سری داسی کو پسند کیا ہے؟"

"کیا برائی ہے اس میں۔ لاکھوں میں ایک ہے۔ پڑھی لکھی۔ بڑی پیار کرنے والی بیٹی ہے میری سری داسی۔" بیوی نے قبل از وقت سری داسی کے راگ الاپنا شروع کر دیئے۔

عبد المعبود نے کہا۔

"میں کب کہتا ہوں کہ سری داسی میں کوئی برائی ہے۔ مجھے بھی وہ بچی بہت پسند ہے۔"

"تو پھر طے ہو گیا۔" بیوی خوش ہو گئیں۔ "ہم سب خوش ہیں تو پھر یہ شادی ہو کے رہے گی مگر۔۔۔۔۔"

"مگر کیا؟" عبد المعبود نے پوچھا۔ "صرف مذہب ہی کا تو ذرا سا معاملہ ہے۔ میرے خیال سے کہ "رنگ رائل" میری بات سے انکار نہیں کرے گا۔"

"رنگ رائل کون ہے؟" بیوی نے الجھتے ہوئے کہا۔ "سری داسی نے تو بتایا کہ اس کے نہ ماں ہے نہ باپ کوئی بہن بھی نہیں۔ سوائے ایک بھائی کے اس کا اور کوئی نہیں ہے۔۔۔"

عبد المعبود مسکرائے۔

"ارے یعنی۔ اس کے بھائی کا نام رنگ رائل ہے۔ وہ بھی بہت نیک بچہ ہے۔ تم

فکر نہ کرو۔ میں اسے منا لوں گا۔" عبد المعبود نے ان کی یہ مشکل بھی کسی حد تک آسان کر دی۔

پھر طے ہوا کہ اگلے دن عبد المعبود رنگ رائل سے اس سلسلے میں بات کریں گے۔ اگر وہ راضی ہو گیا تو اسے کرناٹک کے راجہ رام راج کے پاس بھیجیں گے اور امید ہے کہ وہ اجازت لے آئے گا۔

دوسرے دن عبد المعبود، رنگ رائل سے ملنے پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ وہ شہزادے اورنگ زیب کے دربار میں گیا ہوا ہے۔ راجکمار رنگ رائل اور راجکماری سری داسی کو شہزادے اورنگ زیب نے اپنے خاص معتمد عبد المعبود کے حوالے کیا تھا اور عبد المعبود نے ان دونوں کی میزبانی کا فرض بخوشی اپنے ذمہ لیا تھا۔ مگر راجکمار رنگ رائل صرف ایک رات عبد المعبود کی حویلی میں رہنے کے بعد عبد المعبود کی اجازت لے کر اورنگ زیب کے شاہی مہمان خانہ میں منتقل ہو گیا تھا۔

راجکمار رنگ رائل کچھ میراقی دماغ کا جوان تھا۔ شاید وہ کچھ زیادہ آزاد خیال تھا یا پھر خواتین کے ساتھ رہنا پسند نہ کرتا تھا۔ وہ ایک رات جو اس نے عبد المعبود کے گھر پر گزاری وہ بھی اس نے جاگ کے گزاری۔ وہ تمام رات کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر اس نے ایک ملازم سے پوچھا کہ امیر عبد المعبود کے کتنے بیٹے ہیں۔

عبد المعبود کا ملازم بڑا باتونی تھا۔ اس نے مہمان کو نہ صرف یہ بتایا کہ امیر عبد المعبود کے عبد الودود نام کا صرف ایک بیٹا ہے بلکہ ان کے دو بیٹیاں نگارش اور پرتو ہیں پھر اس نے امیر عبد المعبود کے بیٹے اور بیٹیوں کی پیدائش سے لے کر اس وقت کے تمام حالات اس قدر تفصیل سے بیان کئے کہ راجکمار گھبرا گیا اور اسے نیند کا بہانہ کرنا پڑا۔

چنانچہ راجکمار صبح کو پہلے سری داسی سے ملا پھر عبد المعبود سے شاہی مہمان خانہ میں منتقل ہونے کی اجازت مانگی۔ اس نے عبد المعبود کو بتایا کہ سری داسی حویلی ہی میں رہے گی مگر وہ حویلی میں تنہائی محسوس کرتا ہے اس لئے اسے شاہی مہمان خانہ میں جانے کی اجازت دی جائے۔

اس طرح رنگ رائل صرف ایک شب عبد المعبود کی حویلی میں گزار کر دوسرے دن شاہی مہمان خانہ میں آ گیا تھا۔ حویلی کے ملازم نے اسے ودود کے بارے میں بتایا تھا مگر

اس شب چونکہ ودود گھر پر موجود نہ تھا اس لئے ان میں ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ پھر نہ رنگ رائل نے حویلی کا چکر لگایا اور نہ ودود نے سری داسی کے بھائی سے ملنے کی ضرورت محسوس کی۔

دراصل راجکمار مہمان خانہ میں اس لئے منتقل ہوا تھا کہ وہ ہروقت شہزادے اورنگ زیب کے سامنے رہے تاکہ شہزادہ جلد سے جلد کرناٹک کو قطب شاہ کی زیادتیوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے۔ راجکمار اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوا تھا۔ شہزادہ بھی راجکمار کو اپنے ساتھ ہی رکھتا تھا یہاں تک وہ راجکمار کو اپنے ساتھ گولکنڈہ پر فوج کشی کے موقعہ پر بھی لے گیا تھا اور شہزادہ محمد سلطان اور قطب شاہ کی بیٹی کی شادی میں بھی اورنگ زیب نے راجکمار کو آگے آگے رکھا تھا تاکہ اس کی دل شکنی نہ ہو۔

عبد المعبود شاہی مہمان خانہ سے ہوتے ہوئے شہزادے کے دربار میں پہنچے۔ شہزادہ اورنگ زیب اگرچہ شہنشاہ ہند کا جنوبی ہندوستان میں نائب تھا مگر اس کے دربار کے ٹھاٹ باٹ مغل دربار سے کسی طرح کم نہ ہوتے تھے۔ وہی امراء وزراء کا درجہ بدرجہ اپنی نشستوں پر بیٹھنا۔ غلاموں کا اپنے اپنے مقام پر کھڑے ہونا۔ اس کا دربار بھی مختلف قسم کی خوشبوؤں سے مہکتا رہتا تھا۔

اورنگ زیب نے اپنے خاص غلام کو اپنا حاجب بنا لیا تھا جو چاندی کا عصا پکڑ کر اورنگ زیب کی مسند کی دائیں جانب کھڑا ہوتا اور لوگوں کی درخواستیں شہزادے کے حضور پیش کرتا پھر کسی خط یا فرمان کو شہزادے کے حکم پر بلند آواز سے پڑھتا تھا۔

ایسے ماحول امیر عبد المعبود اور راجکمار رنگ رائل میں کس طرح ملاقات ہو سکتی تھی۔ یہ ضرور تھا کہ رنگ رائل نے عبد المعبود کو اور عبد المعبود نے رنگ رائل کو دور سے دیکھ لیا تھا۔ رنگ رائل دربار میں بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے عبد المعبود کو دیکھتے ہی دور سے ہاتھ کا ہلکا سا اشارہ کیا۔ عبد المعبود نے بھی خواہ مخواہ اس کی طرف ہاتھ ہلا دیا تھا حالانکہ وہ تو رنگ رائل سے ملنے اور ضروری باتیں کرنے آیا تھا۔

مختصر یہ کہ دونوں ایک چھت کے نیچے ہونے کے باوجود دن بھر ایک دوسرے سے نہ مل سکے پھر بھی جب دونوں کی نظریں ملتیں تو وہ اپنے خیال کے مطابق کوئی اشارہ کرتے اور دوسری طرف سے وہ اپنی بات کو بھی اشارے میں سمجھانے کی کوشش کرتا۔

دوپہر بعد جب دربار برخاست ہوا تو دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے اور پھر دربار کے باہر راہداری میں ان دونوں کا آخر ٹکراؤ ہو ہی گیا۔ رنگ رائل نے سلام کے بعد ہنستے ہوئے کہا۔

"معزز امیر۔ میں اس وقت آپ کے پاس آنے والا تھا۔"

امیر عبد المعبود بھی مسکرائے اور بولے۔

"میں بھی تم سے ملنا چاہتا تھا۔ اس لئے صبح ہی صبح مہمان خانہ پر گیا تو معلوم ہوا کہ راجکمار دربار جا چکے ہیں پھر میں یہاں آگیا۔"

"معزز امیر۔" رنگ رائل نے ادب سے کہا۔ "آپ نے پیغام بھیج دیا ہوتا۔ میں خود حویلی پر آ جاتا۔ آپ کو زحمت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"ضرورت تھی راجکمار۔ جبھی میں تمہارے پاس آیا ہوں۔" عبد المعبود نے ذرا سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"فرمایئے امیر۔ میں حاضر ہوں۔" رنگ رائل نے جواب دیا۔ "آپ نے تو ہم بہن بھائیوں پر اس قدر احسان کئے ہیں جسے ہم عمر بھر نہیں بھلا سکیں گے۔"

"ایسا نہ کہو رنگ رائل۔" عبد المعبود نے محبت سے کہا۔ "تم مجھے اپنے بیٹے ودود کی طرح عزیز ہو۔ رہی سری داسی۔ وہ تو اتنی اچھی بچی ہے کہ پورا گھر اس پر فریفتہ ہے۔ میری بچیوں کا دل سری داسی کے ساتھ ایسا لگا ہے کہ وہ اس کی جدائی کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔"

دونوں باتیں کرتے ہوئے راہداری کے سرے پر آ گئے تھے۔

راجکمار نے کہا۔

"معزز امیر۔ میں آپ کے ساتھ حویلی پر چلتا ہوں۔ وہاں بیٹھ کے اچھی طرح گفتگو کریں گے۔"

"نہیں راجکمار۔" عبد المعبود نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ "جو بات میں تم سے کہنا چاہتا ہوں وہ میری حویلی پر شاید نہ ہو سکے۔ بہتر ہے کہ ہم شاہی مہمان خانہ چلیں وہاں تو سکون ہی سکون ہوتا ہے۔"

"ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں ـــــ" راجکمار بولا۔ "مہمان خانہ میں اس وقت میرے علاوہ

اور کوئی مہمان نہیں ہے۔"

پھر دونوں شاہی مہمان خانہ کی طرف خاموشی سے چلنے لگے۔ عبد المعبود نے راجکمار کی اس بات پر کوئی خاص توجہ نہ دی تھی کہ وہ ان سے ملنے والا تھا مگر راجکمار کو اس بات کی فکر پڑ گئی کہ وہ کون سی ایسی بات ہو سکتی ہے جسے عبد المعبود اپنی حویلی پر مجھ سے نہیں کر سکتے اور اس کے لئے مہمان خانہ جا رہے ہیں۔

بہرحال دونوں خاموشی سے مہمان خانہ میں داخل ہو گئے۔ داخل ہوتے ہوئے ایک دم راجکمار کی زبان سے نکلا۔

"اس مہمان خانہ نے مجھے بہت آرام پہنچایا۔ آج مجھے اسے چھوڑنے کا بہت غم ہو رہا ہے۔"

عبد المعبود جو ایک نشست پر بیٹھ چکے وہ راجکمار کی بات پر جیسے اچھل پڑے۔ انہوں نے حیرانی سے راجکمار کو دیکھا اور بولے۔

"کیا کہہ رہے ہو راجکمار رنگ رائل۔ کیا تم مہمان خانہ چھوڑ رہے ہو۔ شہزادے بہادر نے تمہارا انتظام کہیں اور کرا دیا ہے کیا؟"

"ایسی بات نہیں ہے معزز امیر ـــــ" راجکمار بڑی مسرت سے بولا۔ "بھگوان کی کرپا سے قطب شاہ کا دماغ ٹھیک ہو گیا ہے۔ اب تو وہ بھول کر بھی ہماری طرف نظر نہیں اٹھائے گا۔ شہزادے بہادر نے ایک دن میرے سامنے قطب شاہ سے کہا تھا کہ قطب شاہ تم ہمارے اب عزیز ہوئے ہو مگر راجکمار ہمیں تم سے پہلے سے عزیز ہے۔ خبردار اب کرناٹک کی طرف تمہاری نظریں نہ اٹھیں۔"

اس کے علاوہ بھی راجکمار نے اور کچھ بھی کہا مگر عبد المعبود تو گم سم ہو چکے تھے۔ وہ راجکمار کے مہمان خانہ چھوڑنے والے جملے ہی سمجھ گئے تھے کہ اب وہ کرناٹک واپس جانا چاہتا ہے۔ کرناٹک واپس جانے کا ان کا حق بھی تھا۔ قطب شاہ شکست کھا چکا تھا۔ حالات پوری طرح درست ہو چکے تھے مگر اب تو یہاں دوسرا ہی مقدمہ شروع ہو گیا تھا۔ کیا ان بدلے ہوئے حالات میں راجکمار رنگ رائل اپنی بہن سری داسی کی شادی امیر زادے ودود سے کرنا پسند کرے گا کہ نہیں۔ ان خیالات نے عبد المعبود کو الجھا کے رکھ دیا تھا۔

راجکمار نے عبد المعبود کو خاموش اور گم سم دیکھا تو اس نے کہا۔

"معزز امیر۔ آپ کس فکر میں گرفتار ہو گئے۔ فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟"

عبد المعبود نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"راجکمار پہلے تم اپنی بات پوری کرو۔ پھر میں بتاؤں ۔۔"

"میری بات تو بس ختم ہو گئی معزز امیر ـــــ" راجکمار خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔ "کل میں نے شہزادے بہادر سے درخواست کی تھی کہ ہم بہن بھائیوں کو کرناٹک واپس جانے کی اجازت دی جائے ـــــ"

راجکمار نے رک کے عبد المعبود کو دیکھا۔ پھر کہا۔

"کیا آپ کو اس بات کی خوشی نہ ہو گی کہ ہم بہن بھائی جو اتنے دنوں سے آپ کے مہمان ہیں۔ اپنے گھر واپس جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ آپ بھی اس بات سے ضرور خوش ہوں گے۔"

"کیوں نہیں راجکمار۔" عبد المعبود نے سینہ پر پتھر رکھ کر کہا۔ "اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ لیکن تم یہ نہیں جانتے کہ تمہارے جانے سے کتنے دل ٹوٹ جائیں گے اور کتنی محبتیں دم گھٹ کر مر جائیں گی۔ بیٹی سری داسی ہم لوگوں میں اس قدر گھل مل گئی ہے کہ ہم لوگ اسے اپنے سے جدا کرنے کا خیال ہی نہیں کر سکتے۔"

"یہ سب آپ لوگوں کی محبت ہے معزز امیر۔" راجکمار نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ "بہرحال شہزادے بہادر نے ہماری درخواست قبول کر لی ہے اور آج میں کرناٹک واپس جانے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ میں دراصل شکریہ کے لئے آپ کے پاس حاضر ہونا چاہتا تھا؟"

عبد المعبود کا دماغ گھوم گیا تھا۔ اب انہوں نے بات کو طول دینے کے بجائے صاف الفاظ میں کہہ دیا۔

"راجکمار۔ میں نے تم سے کہہ دیا ہے کہ ہم بیٹی سری داسی کو اپنے سے جدا کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم سری داسی کو اپنی بہو بنا کے اپنے ساتھ رکھیں گے۔ میں آج یہی بات کہنے تمہارے پاس آیا تھا۔ امید ہے ـــــ"

اب راجکمار پر سکتہ پڑنے کی باری تھی۔ اس کی نظریں عبد المعبود پر تھیں اور منہ کھلا تھا جیسے اسے کسی بات کا یقین نہ آ رہا ہو یا پھر وہ خواب میں یہ باتیں سن رہا ہو۔

اس دفعہ عبد المعبود نے اسے جھنجوڑا۔

""راجکمار سنا تم نے۔ میں نے کیا کہا ہے؟

راجکمار ایک لمبی سانس لے کے چونکا۔ مردہ آواز میں بولا۔

"معزز امیر۔ میں نے سن لیا ہے مگر یہ کس طرح ممکن ہے؟"

"کیوں راجکمار یہ ممکن کیوں نہیں۔ ودود میرا بیٹا ہے اور میں شہزادے اورنگ زیب کا ایک معتمد امیر ہوں۔ تم سے حیثیت میں کسی طرح کم تو نہیں؟

"حیثیت کی بات میں نہیں کر رہا امیر۔" راجکمار نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "بات دراصل مذہب کی ہے۔ آپ مسلمان ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ ہم ہندو ہیں۔ ہمارے آپ کے مذہب میں بڑا فرق ہے۔ پر یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے؟"

"کیا بچوں والی بات کر رہے ہو راجکمار؟" تم شاہی مہمان خانہ میں رہتے ہو۔ وہاں جو پکتا ہے وہ تم کھاتے ہو۔ سری داسی ہمارے ساتھ رہتی ہے۔ ساتھ اٹھتی بیٹھتی اور کھاتی پیتی ہے۔ پرہیز کس بات کا ہے۔ پھر شادی کیوں نہیں ہو سکتی۔"

راجکمار نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ مگر مذہب تو مذہب ہوتا ہے۔ ہم اپنا مذہب کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟"

"چلو ہم مذہب چھوڑنے کو نہیں کہتے۔" عبد المعبود نے فوراً ایک حل پیش کیا۔ "سری داسی کو ہم مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کریں گے۔ شادی کے بعد بھی وہ ہندو رہ سکتی ہے۔"

"واہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے امیر ——" راجکمار کا لہجہ ایک دم تلخ ہو گیا۔ "مسلمان کے ساتھ شادی کرنے سے سری داسی کا مذہب بھرشٹ (ختم) ہو جائے گا۔ اتنا بڑا پاپ ہم نہیں کر سکتے؟"

عبد المعبود کو راجکمار کی بات پر افسوس ہوا۔ انہوں نے کہا۔

"راجکمار۔ تم بہت بھولے ہو۔ تمہیں نہیں معلوم کہ ہندو عورتوں کی شادیاں مسلمانوں سے ہوتی رہی ہیں بلکہ مغل شہنشاہوں کی اکثر ملکائیں ہندو تھیں۔ شہنشاہ اکبر اعظم کی ہندو ملکہ جودھا بائی کو کون نہیں جانتا۔ شہنشاہ جہانگیر کس کا بیٹا تھا؟"

راجکمار چپ ہو گیا۔ اس کا جواب اس کے پاس نہ تھا۔

"بولو راجکمار۔ کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟"

"آپ جھوٹ نہیں کہہ رہے ہیں مگر ——"

امیر عبد المعبود کو غصہ آ گیا۔ اس نے کہا۔

"کیا تمہارے راجہ نے یہ پیشکش نہیں کی تھی کہ اگر شہزادے بہادر کسی اور بات پر آمادہ نہیں تو وہ اپنے پورے خاندان کے اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہیں۔ کیا تمہاری حیثیت راجہ کرناٹک سے بلند ہے کہ تم سری داسی کو ایک امیر کے بیٹے سے بیاہ سے بھی انکار کر رہے ہو۔"

اس ہفتہ امیر عبد المعبود نے شہزادہ عالی جاہ کی خدمت میں عرض کیا۔

"شہزادے بہادر۔ میرا برخوردار عبد الودود۔ راجکمار کی بہن سری داسی سے شادی کرنے کا خواہشمند ہے بشرطیکہ شہزادے بہادر اجازت مرحمت فرمائیں۔"

شہزادے کو ہنسی آ گئی تھی۔ اس نے اپنی ہنسی کو پوشیدہ رکھنے کے لئے اپنا منہ دوسری سمت کر لیا اور دریافت کیا۔

"امیر معبود۔ تم نے اپنے برخوردار کی بات تو سن لی مگر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کیا راجکماری بھی اس رشتہ کو پسند کر لے گی۔"

امیر عبود المعبود گھبرا گیا۔ اس نے کہا۔

"قیاس تو پھر قیاس ہی ہوتا ہے امیر ——" شہزادے نے سنجیدگی اختیار کی۔ "راجکماری کو اس کی مرضی کے خلاف تمہارے برخوردار کی کنیز نہیں بنایا جا سکتا۔ آخر تم نے کس بات سے اندازہ لگایا کہ راجکماری کو بھی یہ رشتہ پسند ہو گا۔"

"شہزادے بہادر —— وہ —— وہ ——" امیر عبد المعبود کوئی یقینی بات نہ کہہ سکا اور خاموش ہو گیا۔

"امیر معبود۔" شہزادے نے کہا۔ "ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ تمہارا قیاس درست ہو اسے یقین میں تبدیل کرنے سے پہلے کوئی قدم اٹھانے کی کوشش نہ کرنا۔"

امیر عبد المعبود بڑے مان کے ساتھ شہزادے کے پاس آیا تھا مگر شہزادے نے اسے مایوس کر دیا۔ وہ اس مایوسی کے عالم میں گھر پہنچا تو وہاں ایک اور ہی محاذ کھلا ہوا تھا۔



امیر عبد المعبود کی حویلی میں ایک چھوٹا سا پائیں باغ تھا۔ دراصل امراء کی رہائش گاہیں حیثیت میں چھوٹے چھوٹے محل ہوتے تھے مگر انہیں محل کے بجائے "حویلی" کا نام دیا جاتا تھا۔ محل کا نام دانیال ریاست، گورنر یا راجہ مہاراجہ کی رہائش گاہ کو کہا جاتا تھا اور کسی امیر کی حویلی چاہے شاہی محل سے بھی بڑی ہو مگر اسے امیر کی وجہ سے حویلی ہی کہتے کیونکہ محل کے معنی یہ سمجھے جاتے تھے وہاں صرف بادشاہ یا اس کے متعلقین ہی رہ سکتے ہیں۔

امیر عبد المعبود سر جھکائے حویلی کی بڑی ڈیوڑھی کے سرے پر پہنچے تو انہیں پائیں باغ میں کسی کے زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ جہاں تھے وہیں ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ یہ آوازیں اس قدر تیز تھیں کہ انہیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ایک آواز مردانی یعنی ان کے بیٹے عبد الودود کی اور دوسری راجکماری سری داسی کی تھی۔ عبد الودود نے واپس ہونے کا ارادہ کیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ اپنے بیٹے اور ان کی مجوزہ بیوی کی باتیں چھپ کے سنیں مگر اس وقت انہیں سری داسی کی زبان سے اپنا نام سنائی دیا۔

سری داسی کہہ رہی تھی۔

"تم کچھ نہیں کر سکتے تو میں خود چچا امیر سے بات کروں گی۔"

سری داسی کی زبان سے اپنا نام سن کر انہوں نے واپسی کا ارادہ بدل دیا۔

"سری۔ اگر امیر بابا نے ہی انکار کر دیا تو کیا کرو گی؟"

"وہ انکار نہیں کر سکتے۔" سری نے بڑے یقین سے کہا۔

"تمہیں اتنا اعتماد کیوں ہے۔" امیر زادہ الجھتے ہوئے بولا۔

"اس لئے کہ وہ سب کچھ جانتے ہیں۔"

"سب کچھ سے تمہارا کیا مطلب ہے۔ وہ کیا جانتے ہیں۔؟"

"ودود۔ تم بات کو کیوں الجھا رہے ہو۔ سمجھتے کیوں نہیں؟"

"سمجھوں کیسے۔ تم کوئی بات کھل کے تو کہتی نہیں ہو؟"

"کھل کے سننا چاہتے ہو تو سنو۔" سری داسی کے لہجے میں ہلکا سا غصہ تھا۔ "چچا امیر جانتے ہیں کہ ـــــ" پھر سری داسی کی آواز رک گئی۔

امیر عبد الودود نے کان لگائے مگر اسے کوئی آواز سنائی نہ دی۔ انہوں نے چند لمحے انتظار کیا پھر ہلکی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر آ گئی۔ اس وقت ودود کی آواز سنائی دی۔

"تم بات کرتے کرتے آخر رک کیوں جاتی ہو۔ میں انتظار کر رہا ہوں اور تم نے چپ کا روزہ رکھ لیا ہے؟"

"ودود۔" سری داسی نے احتجاج کیا۔ "تم اس قدر بھولے تو نہیں ہو؟"

"اس میں بھولے پن کی کیا بات ہے۔ تم بات پوری کرو تو میں سمجھ سکوں آدھی بات سے کیا سمجھوں گا میں؟"

"میں اپنی بات پوری کر چکی ہوں۔" سری داسی چیخ سی پڑی۔ "چچا امیر سب کچھ جانتے ہیں۔"

"آخر کیا جانتے ہیں۔ یہی تو میں پوچھ رہا ہوں؟" ودود الجھتا ہی جا رہا تھا۔

"تم واقعی بدھو ہو ودود۔" سری داسی نے جواب دیا۔ "تم سے زیادہ عقلمند تو تمہاری دونوں بہنیں ہیں۔ انہوں نے پہلے ہی دن سمجھ لیا تھا ـــــ"

"اچھا۔ میں جا رہا ہوں۔ تم نہیں بتاتیں تو نہ بتاؤ۔" پھر یوں محسوس ہوا جیسے ودود نے واپس جانے کے لئے قدم اٹھایا اور سری داسی نے اس کا ہاتھ یا دامن پکڑ لیا ہو۔

"ودود۔ تم واقعی بہت بھولے ہو۔ اس لئے تو میں نے تمہیں اپنا دوست بنایا ہے۔"

"ہونہہ۔ تو تم اب تک مجھے اپنا دوست سمجھتی ہو؟" ودود نے شاید مصنوعی غصہ سے کہا۔

"تو اور کیا سمجھوں؟"

"سمجھو چاہے نہ سمجھو۔ مگر میں صاف کہہ چکا ہوں کہ میں نے تمہیں اپنی بیوی بنانے کا ارادہ بلکہ فیصلہ کر لیا ہے اور شاید ہو کر بھی رہے گا۔" ودود نے زور دے کے کہا۔

"تم ارادے باندھتے اور فیصلہ کرتے ہی رہو گے اور راجکمار بھیا مجھے واپس لے کر چلے بھی جائیں گے۔"

"مگر تم تو کہہ رہی ہو کہ راجکمار نے ابھی تک نہ خود یہاں سے جانے کا فیصلہ کیا ہے

اور نہ تمہارے بارے میں کچھ بتایا ہے۔"

"میں تمہاری طرح سے بدھو نہیں ہوں ودود۔" سری داسی نے جواب دیا۔ "میں انہیں پہچانتی ہوں۔ وہ خود تو جانے کے لئے تیار ہیں مگر میری طرف سے پریشان ہیں۔"

"کیا مطلب۔ تمہاری طرف سے کیوں پریشان ہیں!" ودود نے دریافت کیا۔

سری داسی نے بتایا۔ "انہوں نے مجھ سے کئی بار پوچھا کہ سری تجھے کرناٹک نہیں یاد آتا۔"

"پھر تم نے کیا جواب دیا۔"

میں نے کہہ دیا۔ "میرا یہاں دل لگ گیا ہے۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔"

"سچ۔ کیا تم نے یہ کہا ہے؟"

"ہاں ہاں کہا ہے۔ میں تمہاری طرح سے بات کو دل میں لئے لئے نہیں پھرتی۔ اگر تم نے امیر چچا سے کہہ دیا ہوتا کہ ---- کہ ----"

"اچھا ---- اچھا ---- امیر بابا کو آنے دو۔ میں آج ضرور کہوں گا۔ ان سے"

"میں آگیا ہوں بیٹے۔" یہ کہتے ہوئے امیر عبد المعبود ڈیوڑھی سے نکل کے پائیں باغ میں داخل ہوئے۔

امیر کو دیکھ کے سری داسی بے تحاشہ ایک طرف بھاگی۔

"ادھر آؤ سری داسی۔" امیر نے اسے آواز دی۔

اور سری داسی کے قدموں کو جیسے زمین نے پکڑ لیا۔ وہ واپس آئی اور سر جھکا کر امیر عبد المعبود کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"کسی شخص کی گفتگو چھپ کر سننا ہمارے مذہب میں بہت بری بات ہے بلکہ گناہ ہے" عبد المعبود نے ہولے ہولے کہنا شروع کیا۔ مگر یقین کرو میں جان بوجھ کر اس گناہ کا ذمہ دار نہیں ہوا۔ میں ڈیوڑھی میں تھا کہ تم دونوں کی باتوں کی آواز مجھ تک پہنچی۔ میں وہیں رک کے رہ گیا۔ اس لئے نہیں مجھے تمہاری باتوں سے دلچسپی تھی بلکہ اس لئے کہ میں اپنے بیٹے عبد الودود کے لئے فکرمند تھا۔ میرا خیال تھا کہ ودود اور تم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔"

"پر میں نے غلطی سے شہزادے بہادر سے اس بات کا ذکر کیا کہ راجکماری سری داسی

کو مجھے دے دیا جائے۔ شہزادے بہادر کا سوال تھا کہ تم کیا کرو گے اس گڑیا کا۔ میں نے عرض کیا اعلیحضرت شہزادے ودود نام کا ایک آپ کا غلام میرے گھر ہے میں ان گڑیا گڈے کا بیاہ رچاؤں مگر شہزادے بہادر نے یہ رشتہ نامنظور کر دیا ---"

"نامنظور کر دیا شہزادے بہادر نے؟" ودود کا دل جیسے پھٹنے لگا۔

"امیر چچا۔ میں نے تو سنا ہے کہ شہزادے بہادر بہت دیالو (رحمدل) ہیں انہوں نے یہ ظلم کیسے کیا؟"

"نہیں گڑیا راجکماری۔" عبد المعبود نے کہا۔ "شہزادے بہادر نے انصاف کیا ہے۔ تمہارے ساتھ۔ اس لڑکی کے ساتھ جسے انہوں نے پناہ دی ہے۔ اگر تم دونوں کی شادی میں کر دیتا یا شہزادے بغیر کسی شرط کے اس کی اجازت دے دیتے تو زمانہ یہی کہتا کہ راجہ کرناٹک کی امانت میں اورنگ زیب اور ان کے امیروں نے خیانت کی اور راجکماری کو کرناٹک جانے سے روک دیا۔"

"مگر امیر چچا۔ ایسی تو کوئی بات نہ تھی۔ مجھے تو کسی نے پریشان نہیں کیا۔ میں یہاں آرام سے رہ رہی ہوں۔ کوئی میرا مخالف نہیں۔ میں کسی بات پر مجبور نہیں۔"

"میں جانتا ہوں بیٹی ---- یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" امیر عبد المعبود نے دبے دبے لفظوں میں کہا۔ "مگر ہمارے شہزادے بہادر ایسے معاملات میں بہت سخت ہیں میں نے ان سے اشارتاً کہا تھا کہ میں راجکماری سری داسی کو آپ سے اپنے فرزند کے لئے مانگتا ہوں مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا۔"

سری داسی کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔

"مگر امیر چچا۔ یہ تو سراسر ظلم ہے۔ انہیں میرے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق کس نے دیا۔" پھر آنسو پونچھتے ہوئے بڑے عزم سے بولی۔ "امیر چچا۔ اگر شہزادے بہادر نے مجھ پر اپنی مرضی مسلط کرنے کی کوشش کی تو میں خودکشی کر لوں گی مگر ان کی بات نہیں مانوں گی۔"

امیر عبد المعبود نے جیسے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ دراصل اس تذبذب میں مبتلا ہو گئے تھے کہ پتہ نہیں ودود اور سری داسی ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہیں کہ نہیں کیونکہ دونوں کی اٹھتی جوانیاں تھیں اور جوانی کی انکھیلیاں اکثر پانی کا بلبلہ ثابت ہوتی ہیں اور اسی

خیال سے شہزادے بہادر نے امیر عبد المعبود پر یہ پابندی لگا دی تھی کہ وہ جب تک راجکماری کی مرضی نہ معلوم کرے اس وقت تک کوئی قدم نہ اٹھائے۔

آج ڈیوڑھی میں کھڑے ہو کر اس نے جو کچھ سنا تھا اس سے اس مان کو یقین کا درجہ حاصل ہو گیا تھا مگر پھر بھی وہ سری داسی کی طرف سے اپنا پورا پورا اطمینان کر لینا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے بات کو وقتی" گھما پھرا کر پیش کیا۔

راجکماری کے اس اظہار کے بعد کہ وہ اپنی مرضی پر کسی کی مرضی مسلط ہونے سے پہلے خودکشی بھی کر سکتی ہوں۔ اب تو کسی شبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے امیر عبود المعبود نے کہا۔

"راجکماری سری داسی ہمارے شہزادے اورنگ زیب بہادر تم پر ظلم نہیں کر رہے ہیں بلکہ وہ تمہارے حق کی حفاظت کر رہے ہیں۔"

"واہ امیر چچا۔۔۔۔" سری داسی جیسے باغی ہو گئی۔ "وہ مجھ مجبور پر ستم کر رہے ہیں اور آپ فرما رہے ہیں کہ وہ میرے حق کی حفاظت کر رہے ہیں۔ یہ دو الگ الگ باتیں ہیں۔"

"سری داسی۔ سوچ سمجھ کر بات کرو۔" امیر عبد المعبود نے اسے سمجھایا۔ "شہزادے بہادر نے تو تمہیں اپنا حق استعمال کرنے کا حکم دیا ہے۔ پھر ہمارا اسلام تو یہ کہتا ہے کہ لڑکی کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کر دی جائے اور یہ بات ہو جائے تو نکاح و شادی منسوخ کر دیئے جاتے ہیں۔ شہزادے نے حکم دیا ہے کہ جب تک راجکماری کی مرضی نہ معلوم کر لی جائے اس وقت اس کی شادی کسی جگہ نہیں کی جا سکتی۔"

راجکماری روتے روتے ایک دم ہنس پڑی۔ امیر زادہ ودود جو اس وقت اب گم سم کھڑا تھا جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ تھا۔ اس نے جو یہ سنا تو اچھل پڑا۔ باپ سے تو کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی وہاں اس نے سری داسی کی آنسوؤں سے بھری چمکتی ہوئی آنکھوں میں ضرور جھانکا۔

آخر سری داسی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"چچا امیر اگر امیر زادے نے مجھے پسند کیا ہے تو میں اس گھر میں کنیز بننے کو تیار ہوں۔"

امیر عبد المعبود نے دو قدم بڑھ کے اپنے بازو کھول دیئے اور سری داسی ان کی آغوش شفقت میں سمٹ کر خوشی کے آنسو نچھاور کرتی رہی۔

امیر عبد المعبود نے اسی دن شہزادے بہادر اورنگ زیب کو مطلع کیا کہ راجکماری خود بھی اس رشتے کو پسند کرتی ہے چنانچہ جب راجکمار نے شہزادے سے کرناٹک واپس جانے کی اجازت مانگی تو شہزادے نے کہا۔

"تم کچھ دن اور ٹھہر جاؤ تاکہ راجکماری کی شادی سے بھی فارغ ہو جاؤ۔"

راجکمار نے حیران نظروں سے شہزادے کو دیکھا۔

"مگر شہزادے بہادر۔۔۔" راجکمار کہتے کہتے رک گیا۔

"تمہیں فکر کی ضرورت نہیں۔" شہزادے نے اسے اطمینان دلایا۔ "راجکماری کی رخصتی ہمارے محل سے ہو گی۔ اگر کرناٹک سے کسی کو بلانا ہے تو بلوا لو۔ راجکماری کی رضامندی ہم تک پہنچ چکی ہے۔ شادی کی تاریخ تم خود مقرر کر سکتے ہو۔"

راجکمار کو کچھ کہنے کی ہمت ہی نہ ہوئی اور چپ چاپ چلا گیا۔

پھر دوسری جمعرات کو امراء اور وزراء کی ایک جماعت امیر زادے عبد الودود کی بارات لے کے شاہی مہمان خانے گئے۔ وہاں شہزادے کے حاجب اور دوسرے ارکان حکومت نے بارات کا استقبال کیا اور سری داسی جس کا اسلامی نام خولہ رکھا گیا تھا' کا نکاح امیر زادے عبد الودود کے ساتھ ہوا۔ شہزادے بہادر کی طرف سے دو جڑاؤ ہار اور دو درجن کامدار جوڑے دلہن کو دیئے گئے۔ امیر عبد المعبود نے کوئی جہیز لینے کی فرمائش نہ کی۔ پھر اسی رات تاروں کی چھاؤں میں امیر زادہ ودود نئی دلہن خولہ خانم اور اپنی دونوں نندوں کے ساتھ رخصت ہو کے امیر عبد المعبود کی حویلی میں آ گئیں اور دونوں کا عشق اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

دوسرے دن بعد نماز جمعہ ظہرانہ جو دراصل دعوت ولیمہ تھا' دیا گیا جس میں شہزادے بہادر کے تمام اراکین دوست نے شرکت کی اور خولہ خانم' راجکماری داسی سے امیر عبد المعبود کی حویلی کی بہو اور ان کے خاندان کی رونق بن گئی۔ خدا سب کو ایسی خوشیاں نصیب کرے۔

بیجا پور پر حملہ

گولکنڈہ کی طرح بیجا پور کے حاکم عادل شاہ نے بھی شہنشاہ شاہجہاں کو اپنا نگران اور سرپرست تسلیم کر لیا تھا مگر اس نے اس معاہدہ کی ایک دن بھی پاسداری نہ کی تھی۔ بیجا پور کے گرد کے تمام علاقے خود کو غیر محفوظ سمجھتے تھے اور دربار شاہی میں سلطان عادل کی تک و تاز اور لوٹ مار کی درخواستیں بھجواتے رہتے تھے مگر اس وقت شاہجہاں کچھ ایسا الجھا ہوا تھا کہ دکن کی طرف توجہ نہ دے سکا مگر شہزادے بہادر اور اورنگ زیب نے دکن پہنچتے ہی ایک ایک کر کے تمام باغی حکمرانوں کی خبر لینا شروع کر دی تھی۔ میسور' کونکن' کویری' سیرا وغیرہ ریاستوں کی طرف سے شہزادے کی عادل شاہ کی زیادتیوں کی خبریں تواتر سے مل رہی تھیں پر جس وقت شہزادے نے گولکنڈہ پر حملہ کا مقصد کیا تھا تو حاکم گولکنڈہ کی درخواست پر عادل شاہ نے تیس ہزار کا ایک لشکر گولکنڈہ کی طرف روانہ کر دیا تھا مگر جب اس لشکر کو یہ اطلاع ملی کہ خود شہزادہ اورنگ زیب گولکنڈہ کے محاذ پر پہنچ گیا ہے تو عادل شاہی لشکر کی آگے بڑھنے کی ہمت نہ پڑی اور وہ عادل شاہ کے حکم سے واپس چلا گیا تھا۔

اس بات کی اطلاع شہزادے کو مل گئی تھی اور اس نے فیصلہ کیا تھا کہ گولکنڈہ سے فارغ ہوتے ہی وہ بیجا پور کی ضرور خبر لے گا۔ چنانچہ گولکنڈہ کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد شہزادے نے دربار شاہی میں اطلاع دی بلکہ درخواست دی کہ اسے بیجا پور پر فوج کشی کی اجازت دی جائے تاکہ سلطان عادل شاہ سے تمام پچھلی اور اگلی حرکتوں کا بدلہ لیا جا سکے۔

شاہجہاں' بیجا پور کی طرف سے پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا چنانچہ اس نے نہ صرف فوج کشی کی اجازت دی بلکہ کمک کے طور پر بیس ہزار سوار اور بے شمار پیادے دکن روانہ کئے اور اس لشکر کے ساتھ محمد قلی' مہابت خان' راجہ رائے سنگھ' اخلاص خاں' نصرت خاں' راجہ سبحان سنگھ' دبی سنگھ اور دلیر خاں جیسے نامور سرداروں کو بھیج دیا۔

شہزادہ اورنگ پہلے ہی سے تیاری کر رہا تھا۔ اس لشکر کے آتے ہی اس نے شائستہ خاں کو مالوہ سے بلا کر دولت آباد میں چھوڑا اور خود پورے لاؤ لشکر کے ساتھ بیجا پور روانہ ہوا۔ شاہی لشکر پندرہ دن کے سفر کے بعد بیجا پور کے مضبوط قلعہ بیدر پر پہنچ گیا اور اس کا

محاصرہ کر لیا۔ بیدر کا قلعہ قندھار کے قلعہ سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اس کے گرد دوہری فصیل تھی اور تین تین خندقیں اسے گھیرے ہوئے تھیں۔

بیدر کے قلعے کا حاکم سید مرجان تھا۔ اس کے پاس اگرچہ صرف پانچ ہزار کا لشکر تھا مگر اس کا توپ خانہ اس دور کے بہترین توپ خانوں میں شمار ہوتا تھا۔ شاہی فوج کے محاصرہ کرتے ہی سید مرجان کے توپ خانہ نے آگ برسانا شروع کر دی۔ یہ آتش باری کئی دن تک جاری رہی مگر اس دوران شاہی فوج خندق تک پہنچ گئی اور اس نے خندق پر دو توپیں نصب کر کے قلعہ والوں کو جواب دینا شروع کر دیا۔

اس دوران بیدر کی فوج قلعہ سے کئی بار باہر نکل کر حملہ آور ہوئی مگر شاہی فوج کو ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اس وقت شاہی فوج کا ایک سردار مراد خاں اپنی جمیعت کے ساتھ آگے بڑھا اور قلعہ کی اس سمت پہنچ گیا جہاں کی فصیل سنگ باری کی وجہ سے ٹوٹ چکی تھی۔ وہاں قلعدار سید مرجان اور اس کے بیٹے موجود تھے۔ انہوں نے کمال بہادری کا مظاہرہ کیا مگر مراد خاں کو روکنے میں ناکام رہے۔ سید مرجان شدید زخمی ہوا اور تمام کوششوں کے باوجود شاہی فوجیں قلعہ میں داخل ہو گئیں۔

اورنگ زیب بیدر میں مصروف تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ بیجا پور کی ایک زبردست فوج بیدر کو بچانے کے لئے آ رہی ہے۔ شہزادے نے فوراً" پندرہ ہزار فوج کے ساتھ مہابت خاں کو اس طرف روانہ کیا۔ کچھ ہی فاصلہ پر مخالف فوج کا سامنا شاہی لشکر سے ہو گیا۔ ان کا سردار خان محمد' افضل اور رستم پسر رندولہ ریحان کے بھائی اور بیٹے معتبرہ تھے۔ ان کے ساتھ بیس ہزار کا لشکر تھا مگر مہابت خان نے ایک زبردست لڑائی کے بعد انہیں مار بھگایا۔ مہابت خاں نے دور تک ان کا تعاقب کیا اور بیشتر لشکریوں کو تہہ تیغ کر دیا۔

شہزادے اورنگ زیب کو بیجا پور میں مصروف دیکھ کر مرہٹوں نے سر اٹھایا اور احمد نگر کے مغل علاقوں میں لوٹ مار شروع کر دی۔ شہزادے نے فوراً" ان کی تادیب کے لئے راؤ کرن نصیری اور ایرج خاں کو تین ہزار سواروں کے ساتھ ادھر بھیجا اور خود شہزادہ محمد سلطان کو بیدر میں چھوڑ کر کلیانی کی طرف پیش قدمی کی۔

بیدر کی شکست کے بعد بیجا پوری کلیانی کو بچانے کے لئے انبوہ در انبوہ کلیانی کی

طرف بڑھے اور انہوں نے شاہی لشکر کی سپلائی لائن کاٹ دی۔ شہزادے نے مہابت خاں اور چند بڑے سرداروں کو رسد کی ترسیل کا کام سپرد کیا۔ انہوں نے بیجا پور کو پسپا کر کے سپلائی لائن بحال کر دی۔ پھر کلیانی کو بچانے کے لئے بیجا پوریوں کا تیس ہزار کا لشکر آن پہنچا اور اس نے شاہی لشکر سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی مگر شہزادے نے نصف لشکر کے ساتھ پلٹ کر ان پر حملہ کر دیا اور اس قدر مارا کہ انہیں میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔

بیجا پوری ہزار کوشش کے باوجود قلعہ کلیانی کو نہ بچا سکے اور تین ماہ کے محاصرے کے بعد قلعدار دلاور خاں کے جان کی امان کے وعدہ پر قلعہ کی چابیاں شہزادے اورنگ زیب کے حوالے کر دیں اور قلعہ چھوڑ کر بیجا پور کی طرف روانہ ہو گیا۔ اورنگ زیب نے بیجا پور کے مختلف علاقوں اور قلعہ پر اپنے فوجی دستے روانہ کر دیئے تھے اس طرح پوری ریاست بیجاپور میں ہر طرف قیامت برپا ہو گئی تھی۔

اب شہزادہ اورنگ زیب بیجا پور پہنچ چکا تھا اور اس نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا تھا مگر یہ اس کی خوش قسمتی یا بد قسمتی کہ انہی دنوں شہنشاہ شاہجہاں کی سخت بیماری کی خبر شہزادے اورنگ زیب کو پہنچائی گئی۔ اس خبر میں کچھ حقیقت اور زیادہ تر شہزادہ داراشکوہ کی فریب کاری تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اورنگ زیب کی طاقت دکن ہندس اس قدر زیادہ ہو جائے کہ پھر اس پر قابو پانا ممکن نہ رہے۔ اس لئے اس نے شہنشاہ کی طرف سے جنوب میں جتنے بڑے بڑے سردار تھے سب کو آگرہ طلب کر لیا۔

شہزادے اورنگ زیب کے لئے یہ خبر بڑی وحشت ناک اور خطرناک تھی اسے علی عادل شاہ سلطان بیجا پور سے صلح کا پیغام مل چکا تھا اور ایک کروڑ کا نذرانہ بھی پیش کیا گیا تھا۔ شہزادہ ڈیڑھ کروڑ وصول کرنا چاہتا تھا مگر اسے شہنشاہ کا دوسرا حکمنامہ ملا جس میں اسے حکم دیا گیا تھا کہ ایک کروڑ کا نذرانہ قبول کر کے بیجاپور سے صلح کر لی جائے نیز اسے بھی آگرہ پہنچنے کا حکم دیا گیا تھا۔

بیجا پور کی مہم کے سلسلہ میں تاریخوں میں کئی بیانات ملتے ہیں جن سے دو تین باتیں سامنے آتی ہیں۔ جن کا ذکر ضروری ہے:۔

ا۔ دارا نہیں چاہتا تھا کہ اورنگ زیب بیجا پور فتح کر کے ایک عظیم فاتح بن جائے۔

۲۔ جب بیجا پور کی جنگ شروع ہو گئی تو دارا نے بیجا پور والوں کو درپردہ اکسایا کہ

وہ صلح نہ کریں اور میدان میں ڈٹے رہیں۔

۳۔ جب بیجا پور والے بالکل دل ہار گئے، تو دارا نے شاہجہاں کو بیماری کے بہانے اورنگ زیب کے دو بڑے سردار ان کے لشکر کے دکن سے واپس بلائے۔ وہ دونوں سردار دارا کے وفادار تھے اور انہوں نے واپسی کے وقت شہزادے اورنگ زیب سے اجازت تک نہیں مانگی۔

مگر یہ شہزادے اورنگ زیب کی عقلمندی تھی کہ اس نے بیجاپور سے ایک پروقار صلح کی اور اپنی مختصر فوج کو بیجاپور کے محاذ سے واپس لے آیا۔ اس سلسلہ میں اورنگ زیب کے دکن میں قتل کئے جانے کی سازش کا بھی بار بار ذکر ملتا ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ بیس ہزار کا مغل لشکر دارا شکوہ کی سازش کے تحت دکن ہند سے آگرہ واپس چلا گیا تھا اور پورے جنوبی ہند میں صرف پچیس ہزار مغل فوج باقی تھی وہ بھی ایک جگہ نہیں بلکہ کچھ بیدر میں، کچھ کلیانی میں اور شہزادے کے ساتھ مشکل سے صرف دس ہزار فوج تھی۔

بیجا پوری اگرچہ شکست خوردہ تھے مگر نصف سے زیادہ مغل لشکر واپس جانے کے بعد وہ اورنگ زیب سے بدلہ لینے کی فکر میں تھے۔ ان کی تعداد ایک لاکھ کے قریب تھی مگر اس وقت خان محمد جو بیجا پور کا وزیراعظم اور سپہ سالار تھا، اس نے نہایت شرافت کا ثبوت دیا اور شہزادے کی مجبوری سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس کی اور شہزادے اورنگ زیب کی دوستی کے بھی چرچے پھیل گئے تھے چنانچہ خان محمد نے شہزادے کو نہایت اطمینان سے دکن چھوڑنے کا موقع فراہم کیا۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی مشہور ہے کہ محمد خان وزیراعظم اور سپہ سالار کو اس بناء پر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا کہ اس نے اورنگ زیب کو دکن سے زندہ واپس جانے کا موقعہ دیا تھا۔ کچھ بھی ہوا ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ اگر محمد خاں اپنی دوستی نہ نبھاتا تو اورنگ زیب کو دکن سے نکلنے میں بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا۔

شاہجہاں کی بیماری

شہنشاہ شاہجہاں واقعی بیمار پڑ گیا تھا اور اس کی حالت اس قدر خراب ہو گئی تھی کہ

وہ شاہی جھروکہ میں جا کر عوام کو دیدار دینے کے بھی قابل نہ رہ گیا تھا۔ اس زمانہ میں دستور تھا کہ شاہ وقت روزانہ ایک خاص وقت پر محل کے ایک جھروکے میں جا بیٹھتا تھا۔ جھروکے کے نیچے سے عوام نکلتے اور بادشاہ کو سلام کرتے تھے۔ اس بات کو یہ ثبوت سمجھا جاتا تھا کہ شاہ وقت اس وقت زندہ و سلامت ہے۔

پھر جب بادشاہ جھروکہ میں جانے کے قابل نہ رہا اور کم عقل دارا شکوہ نے تمام انتظام سلطنت اپنے ہاتھ میں لے کر کاروبار سلطنت خود چلانا شروع کر دیئے نیز باہر جانے والے تمام راستوں پر پہرہ لگا دیا گیا کہ بادشاہ کے بارے میں کوئی خبر مشرق' مغرب' جنوب میں نہ جانے پائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ شہنشاہ کا انتقال ہو گیا ہے۔

دربار شاہی میں شہنشاہ شاہ شجاع اور شہزادے مراد کے نمائندے موجود تھے۔ ان دونوں نے شہزادوں کو کہہ دیا تھا کہ امکانات اس بات کے ہیں کہ شہنشاہ کا انتقال ہو گیا ہے اور دارا شکوہ نے تمام انتظام سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ جلد باز شہزادہ مراد نے تو اپنی بادشاہی کا بھی اعلان کر دیا تھا اور بعض شاہی علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ شاہ شجاع بھی اسی قسم کے اقدامات کے لئے پر تول رہا تھا۔

دور اندیش اورنگ زیب بہت غور سے حالات کا مطالعہ کر رہا تھا اور جلد بازی میں کوئی قدم ایسا نہیں اٹھانا چاہتا تھا جس سے بعد میں نقصان پہنچنے کا امکان ہو۔ پھر بھی اورنگ زیب نے اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھے تھے۔ دارا نے اپنے بیٹے سلیمان شکوہ کو بنارس کی طرف بھیج دیا تھا اور احمد آباد کی سمت راجہ جسونت سنگھ کو روانہ کیا تھا کہ وہ مراد سے دو دو ہاتھ کرے۔

اس وقت اورنگ زیب نے صرف ایک قدم اٹھایا۔ وہ یہ کہ شاہی حکم کے تحت مہابت خاں اور راجہ چترسال فوج ایک بیشتر حصہ (تقریبا" تیس ہزار) لے کر آگرہ روانہ ہو گئے تھے مگر شاہی خزانہ' توپ خانہ اور دوسرا ساز و سامان اور ایک بہت معقول دستہ توپچیوں کا معظم خاں یا میرجملہ کے ساتھ تھا جو ابھی بیدر سے آئے تھے اور اکبر آباد جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے ہاتھی اور جواہرات اور خزانے بھی تھے۔

ظاہر ہے کہ اگر میرجملہ اور راجہ یہ ساز و سامان لے کر دارا کے کے پاس پہنچ

جاتے تو اورنگ زیب کی طاقت کو سخت دھچکا لگتا۔ چنانچہ اس نے پہلے میرجملہ کو پیغام بھیجا کہ آگرہ جانے سے پہلے وہ اس سے بھی اورنگ زیب سے ضرور ملیں مگر راجہ اور میرجملہ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ انہیں دربار شاہی سے طلبی کا پیغام مل چکا ہے اس لئے وہ اب جانے میں تاخیر نہیں کر سکتے۔

اس موقعہ پر اورنگ زیب نے فراست سے کام لیتے ہوئے اپنے بیٹے شہزادے محمد سلطان کو میرجملہ کے پاس قاصد بنا کے بھیجا۔ شہزادہ محمد سلطان بہت ذہین اور عقلمند شہزادہ تھا۔ وہ باپ کے مطلب کو سمجھ گیا اور میرجملہ کے پاس پہنچ کر اس نے اس انداز سے گفتگو کی کہ میرجملہ کو یہ یقین ہو گیا کہ شہزادہ اورنگ زیب اس پر پورا پورا اعتبار کرتا ہے اور ولی عہدی کی کوششوں میں میرجملہ کو اپنا ساتھی اور معاون بنانا چاہتا ہے۔

چنانچہ شہزادہ محمد سلطان نے میرجملہ پر کچھ ایسا روغن قاز ملا کہ میرجملہ بلا تکلف اورنگ زیب سے ملنے پر آمادہ ہو گیا اور شہزادے کے ساتھ آ گیا اورنگ زیب نے اس کے انتظامات پہلے ہی کر رکھے تھے چنانچہ جیسے میرجملہ شہزادے کے خیمے میں داخل ہوا' اسے فورا" حراست میں لے لیا گیا۔

اس سلسلہ میں مورخوں نے بڑی بڑی باتیں بنائی ہیں۔ شہزادے اورنگ زیب کو فریب کار تک کہا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر میرجملہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ دارا کے پاس پہنچ جاتا تو اسے بڑی تقویت پہنچتی ا اورنگ زیب کے لئے زیادہ مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ اورنگ زیب کا میرجملہ کو گرفتار کر لینا اس کی بادشاہی کے راستہ کا پہلا قدم تھا تو کچھ زیادہ غلط نہ ہو گا۔

تخت نشینی کی جنگ

شہنشاہ شاہجہاں کے چاروں شہزادوں میں تخت نشینی کی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ بادشاہ اگرچہ سخت بیمار تھا مگر وہ ابھی حیات تھا مگر بڑے شہزادے نے تمام اختیارات خود سنبھال لئے تھے۔ دربار میں دوسرے شہزادوں کے نمائندہ پر قلمی اور زبانی پابندی لگا دی تھی کہ دربار کی کوئی خبر باہر نہ جانے پائے۔

مراد نے بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا۔ شجاع نے اگرچہ بادشاہت کا اعلان نہ کیا تھا مگر وہ بھی ولی عہدی بلکہ بادشاہت کی دوڑ میں لگا ہوا تھا۔ اورنگ زیب شروع ہی سے عقلمند اور سنجیدہ تھا۔ وہ دور دور ہی رہ کے داؤ پیچ چلا رہا تھا۔ دارا کو دارالسلطنت دہلی میں رہنے اور آگرہ پر شاہی خزانہ پر قبضہ ہو جانے کی وجہ سے زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ اس نے مہابت خاں اور راجہ چترسال کو دکن سے بلوا لیا تھا مگر میرجملہ کو اورنگ زیب نے راستہ ہی میں روک لیا تھا۔

دارا نے اپنے پردادا اکبر اعظم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہندوؤں سے گٹھ جوڑ شروع کر دیا تھا۔ کئی ہندو پنڈت اسے اپنے جال میں پھانسے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ ایک ساتھی نے دارا کے سامنے ایک ایسے شخص کو پیش کیا جس نے برملا اور پرزور الفاظ میں دعوی کیا۔

"اگر عالیجاہ (دارا نے خود کو عالیجاہ کہلوانا شروع کرا دیا تھا۔) میرے لئے بیس سال پرانی شراب کا ایک مٹکہ مہیا کرا دیں اور ایک ایسی خوبصورت عورت منگوا دیں جس نے اس سال چاند کی چودھویں کو چودہویں سال میں قدم رکھا ہو تو میں اسے ذبح کرکے اس کے خون کو شراب کہنہ میں ملا کر ایک ایسی تحریر لکھوں گا جو آپ کے مخالفین کو آپ کے تابع کرے گا اور قلعہ پر قلعہ فتح ہونا شروع ہو جائیں گے۔"

دارا کو ایسے لوگوں پر اس قدر اعتماد تھا کہ اس نے فوراً بیس سال پرانی شراب لانے کا حکم دیا۔ کئی خوبصورت دوشیزائیں بھی گوسائیں جی کے سامنے پیش کیں۔ انہوں نے ایک کے بجائے ایک درجن بھر دوشیزاؤں کو ذبح کرنے کے لئے اپنے گؤ شالہ میں رکھ لیا۔ اس کے بعد انہوں نے عمل شروع کیا۔ وہ گوسائیں ہر رات ایک دوشیزہ کے ساتھ داد عیش دیتے۔ جب وہ چیختی چلاتی تو اسے مجدم قتل کرا دیتے اور اس کا تھوڑا سا خون حاصل کر لیتے۔

اس طرح پورا ایک ہفتہ گزر گیا۔ تمام دوشیزائیں گوسائیں مہاراج کی ہوس کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ گوسائیں نے خون سے تحریریں لکھ دی مگر اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگ دارا کے تابع ہونے کے بجائے اس کے مخالف ہو گئے۔ گؤشالہ کے پہریدار کی ایک بیٹی کو بھی گوسائیں جی نے پسند کرکے اپنے پاس بلوا لیا تھا مگر جب وہ قتل کر دی گئی تو پہریدار نے

ادھم مچا دیا اور اسے اس قدر غصہ آیا کہ اس نے گوسائیں مہاراج کو قتل کر ڈالا۔

مگر شہزادے دارا کی توہم پرستی دور نہ ہوئی تھی۔ محاصرہ قندھار کے دوران اس کے ہندو ساتھیوں نے اسے گھیر کر پنڈتوں سے کئی بار فالیں نکلوائیں مگر ان کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا مگر دارا پھر بھی نہ سمجھ سکا کہ اس کا روپیہ برباد کیا جا رہا ہے اور اسے بیوقوف بنایا جا رہا ہے۔ وہ اگرچہ بڑا شہزادہ تھا اور عام طور پر بڑے شہزادے کو بادشاہت ملتی تھی۔ حضرت میاں میر لاہور دارا کے پیر تھے۔ دارا نے ان سے بہت دعا کرائی مگر وہ خود قابل نہ تھا۔ اس کی دعاؤں سے صرف اتنا ہوا کہ وہ صرف چند دن کے لئے بادشاہ بنا اس کے بعد معزول کر دیا گیا۔

اس جگہ اگر شجاع اور مراد کے بارے میں چند جملے کہہ دیئے جائیں تو کچھ مذائقہ نہ ہو گا۔ مراد میں سوائے بہادری کے اور کوئی خوبی نہ تھی۔ وہ میدان جنگ میں جم کے لڑ سکتا تھا مگر جنگ کے معاملات کا اس میں کوئی تجربہ نہ تھا۔ جنگ کہاں' کیسے اور کب شروع کی جائے اس کا اسے بالکل تجربہ نہ تھا۔ رہا شاہ شجاع کا مسئلہ تو اس سیر چشمی اور سخاوت کا مادہ بہت تھا مگر صرف یہ صفات حکمرانی کے لئے کافی نہ تھیں۔

جہاں تک دارا کا معاملہ تھا۔ اس کے دماغ میں شہنشاہی سما گئی تھی۔ وہ بڑا بیٹا تھا۔ شاہجہاں اسے چاہتا بھی تھا اور ولی عہد بنانے کا بھی خواہشمند تھا۔ اس بات نے دارا کو حد درجہ خود سر اور مغرور بنا دیا تھا۔ چنانچہ بادشاہ کی بیماری کی وجہ سے اس نے اورنگ زیب کی طاقت کو توڑنے کے لئے جنوب سے فوجیں بلوا لی تھیں اس لئے اورنگ زیب جیسا جہاندیدہ شہزادہ بہت محتاط ہو گیا تھا۔

چنانچہ اورنگ زیب نے بھی تخت و تاج کے لئے ہاتھ پیر مارنے شروع کئے اور حقیقت میں وہی اس کا اہل بھی تھا۔ اس سلسلہ میں اس نے دارا کے مقابلہ میں اپنے دونوں بھائیوں شجاع اور مراد کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کی۔ وہ دونوں اگرچہ خود شہنشاہ بننا چاہتے تھے مگر انہیں یہ ضرور معلوم تھا کہ دارا کو وہ خود شکست نہیں دے سکتے بلکہ اس کے لئے انہیں اورنگ زیب کا تعاون ضروری ہو گا۔

لطف کی بات یہ تھی تمام بڑے بڑے امراء اپنی اپنی مصلحتوں کے باوجود یہ جانتے تھے مغلوں کی اس عظیم سلطنت کو صرف اورنگ زیب ہی سنبھال سکتا ہے پس اورنگ زیب

نے جب بھائیوں سے نامہ و پیام شروع کئے تو وہ اسے بہت دلچسپی سے دیکھتے اور انتظار کرتے رہے۔

آخر اورنگ زیب' شاہ شجاع اور مراد کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ جو آگے چل کے ایک مکمل معاہدہ کی صورت اختیار کر گئے۔

برہان پور سے روانگی کے وقت مراد اور اورنگ زیب میں جو خط و کتابت ہوئی تھی اس میں مال غنیمت کی تقسیم کے بارے میں کوئی بات چیت نہ تھی۔ البتہ برہان پور میں قیام کے دوران آخری دنوں میں مراد کا جو خط موصول ہوا اس میں آخری الفاظ اس طرح تھے:

"آپ نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے اور جو سلوک کرنا چاہتے ہیں اس کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اورنگ زیب نے مراد کو اپنے سائیہ میں لے لیا تھا اور مراد کو اپنی اس حالت کا کوئی گلہ نہ تھا۔ پھر جب اورنگ زیب' دارا کو شکست دینے کے بعد اکبر آباد میں داخل ہوا تھا اور دارا کے جانشیں کی حیثیت سے اس کے محل میں اترا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ مراد کی حیثیت ثانوی تھی اور اورنگ زیب کی حیثیت اور قوت بالا تھی۔

اورنگ زیب اپنے ایک اگلے خط میں لکھتا ہے:۔

اس وقت جس کا آغاز بھی مبارک ہے اور انجام بھی' جبکہ سعادت اقبال کا سورج بلند ہونے والا ہے اور شہباز بلند پرواز ہوا میں اپنے بال و پر پھیلائے ہوئے ہے تاکہ اپنے مقصود کو پانے اور یہ مقصود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی سربلندی اور حق و صداقت کا اعلان اور الحاد اور زندقہ کو اس ہندوستان جنت نشان سے ختم کرنے کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ ہمارے بھائی برابر عزیز بھائی بھی ہمارے ساتھ ہمارے اس نیک کام کی تکمیل میں شریک ہیں۔ ان سب اور ہم میں مواصات اور مواخات کا جو رشتہ' مستحکم مواثیق اور معاہدہ کی بنا پر پہلے سے قائم ہے اس کی انہوں نے نئے مضبوط وعدوں اور قسموں سے تجدید کی ہے اور انہوں نے خود ہی قرار دیا ہے کہ

دشمن کے استحصال اور استقرار و انتظام اور سلطنت کے بعد وہ درستی اور اتفاق کی پہلی راہ سے سرمو نہیں ہٹیں گے اور ہماری مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کریں گے اور ہر کام' ہر لحظہ اور ہر وقت ہمارے ساتھ رہیں گے۔ ہمارے دوستوں کو دوست سمجھیں گے اور ہمارے دشمنوں کو دشمن سمجھیں گے۔ ان کی درخواست پر جو حصہ ملک ممالک محروسہ میں سے انہیں دیا جائے گا اس پر قناعت کریں گے اور خوش رہیں گے۔ مزید اضافہ کی درخواست نہیں کریں گے۔

برادر عزیز کے اس اقرار و معاہدہ کو بنا قرار دے کر ازروئے شفقت ہم یہ تحریری یقین دلاتے ہیں کہ ہم انشاء اللہ اس وقت تک جب تک ہمارے بھائی یک جہتی اور حق شناسی سے کام لیتے رہیں گے ہماری مہربانی اور شفقت ان پر روز افزوں ہو گی۔ پہلے سے کئے ہوئے وعدہ کی بنا پر صوبہ لاہور' کابل و کشمیر' ملتان و ٹھٹہ اور ان کے متعلق تمام اضلاع ساحل خلیج عمان تک ان کے حق میں واگزار کر دیں گے اور اس میں کسی قسم کی بے وفائی نہیں کریں گے۔ جیسے ہیں اس ملحد کے استیصال اور اس کے شر کو پورے طور پر ہٹانے کا کام انجام کو پہنچ جائے گا جس میں ان برادر کی شرکت' امانت اور رفاقت ناگزیر ہے' آں برادر کو رخصت دے دی جائے گی کہ اپنے علاقہ کو چلے جائیں۔ ہم ان میں وقتاً" کسی قسم کی تاخیر کے لئے راضی نہ ہوں گے اور نہ دوستی کے آئینہ کو شر کے پیدا کئے ہوئے غبار سے آلودہ ہونے دیں گے۔ ہم اس میں دعویٰ کی سچائی کو خدا اور اس کے رسول احمد مجتبیٰ کو گواہ بناتے ہیں اور اس وثیقہ کو برادر عزیز کے مزید اطمینان کی خاطر اپنی مہر اور نقش پنجہ مبارک سے مزین کرتے ہیں۔ اس وقت یہ آئیہ کریمہ ہمارے سامنے ہے۔

"واوفو بالعھد ان العھد کان مسئو لا"

"اپنے وعدوں کی پابندی کرو کیونکہ وعدوں کے متعلق تم سے پوچھا

جائے گا۔"

پتہ نہیں یہ معاہدہ شہزادہ مراد نے پڑھا کہ نہیں مگر یہ معاہدہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ شہزادے اورنگ زیب نے مراد کو بہت کچھ دینے کا وعدہ کر کے اسے بالکل اپنا مطیع اور تابعدار بنا لیا تھا اور مراد اس کی مرضی کے خلاف نوالہ تک نہیں اٹھا سکتا تھا۔ یہ معاہدہ اس وقت مراد کو بھیجا گیا جب دونوں بھائی (اورنگ زیب اور مراد) دارا کی بھیجی ہوئی فوج یعنی پوری مغل فوج سے مقابلہ کے لئے دریائے نربدا کی طرف جا رہے تھے۔ اس معاہدہ میں شہزادہ شاہ شجاع کے بارے میں ایک لفظ میں بھی موجو نہیں۔

اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شاہ شجاع نے جلد بازی سے کام لے ۔ دارا کے بھیجے ہوئے لشکر جس کے سردار جسونت سنگھ اور ہاشم خان تھے' سے جنگ شروع کر دی تھی اور اس میں اسے سخت ہزیمت اٹھانا پڑی تھی۔ یہ اورنگ زیب کی دور اندیشی تھی کہ اس نے برہان پور سے اس وقت تک قدم نہیں بڑھائے جب تک اسے دکن کی طرف سے اطمینان نہیں ہو گیا کہ اس کے شمالی ہند جانے کے بعد دکن میں کسی قسم کی بغاوت نہیں ہو گی۔

اس سلسلہ میں اورنگ زیب نے کرناٹک' گولکنڈہ اور بیجاپور تینوں حکمرانوں کو خاص رعائتیں دیں اور ان کی ہمدردیاں حاصل کر لیں۔ مراد اسے بار بار آگے بڑھ کے قاسم خاں اور راجہ جسونت سنگھ سے مقابلہ پر اصرار کر رہا تھا مگر اورنگ زیب اپنے انتظامات میں لگا رہا۔

پھر ماہ رجب میں اورنگ زیب کے لشکر نے برہان پور سے قدم نکالا اور اس قدر راز داری سے کام لیا کہ جب تک شہزادے کی فوج دریائے نربدا پار نہیں کر گئی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ یہ دونوں بھائیوں کی پانچ سال بعد پہلی ملاقات تھی۔ دونوں بھائی ایک دوسرے سے گلے ملے۔ فوجیں بھی ایک دوسرے سے ملیں۔ چونکہ اب انتظار کا موقعہ نہ تھا اس لئے دونوں لشکر ایک جھنڈے کے نیچے اس سمت روانہ ہوئے جہاں قاسم خاں اور جسونت سنگھ شاہی لشکر کے ساتھ گامزن تھے۔

آخر دھرمات پور کے میدان میں ایک ایسا میدان کارزار گرم ہوا جس نے دنیا کی

عظیم جنگوں کی یاد تازہ کر دی۔ شہزادہ دارا یا یوں کہنا چاہئے کہ شہنشاہ ہند شاہجہاں کا ساٹھ ہزار کا لشکر مہاراجہ جسونت سنگھ اور قاسم خاں کی سرکردگی میں ایک طرف صف آراء تھا اور دوسری طرف شاہجہاں کے دوسرے بیٹے اورنگ زیب' شہزادہ مراد اور اورنگ زیب کا بہادر بیٹا شہزادہ محمد سلطان صف آراء تھا۔

ظاہر ہے کہ اورنگ زیب نے عملی طور پر جنگ کا اس قدر تجربہ حاصل کر لیا تھا کہ اس کی حکمت عملی اور دور اندیشی کو کوئی نہیں پہنچتا تھا۔ اس پر شہزادہ مراد کی بے پناہ شجاعت اور بہادری پر شہزادہ محمد سلطان کی احتیاط اور دانشمندی نے شہزادے اورنگ زیب کو ولی عہدی کی اس پہلی اور آخری جنگ میں فتح دلا دی۔

ہندو اور انگریز مورخین نے شہزادے اورنگ زیب کے لشکر پر طرح طرح کے الزامات لگائے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ مہاراجہ جسونت سنگھ میدان سے نہیں بھاگا تھا بلکہ اس کے سپاہی راسیں پکڑ کے اسے میدان جنگ سے نکال لے گئے تھے مگر یہ باتیں محض باتیں ہیں مراد کے بہادر اور اورنگ زیب کے تجربہ کار لشکر نے شاہی فوجوں کے منہ پھیر دیئے اور انہیں میدان چھوڑ کے بھاگنا پڑا۔

اتنی بڑی شکست کھانے کے بعد بھی شہزادہ دارا کے دماغ سے شہنشاہی کا بھوت نہ اترا۔ اس نے فوراً" باقی لشکر درست کیا اور دھولپور پہنچ کر دریائے چنبلی کا راستہ روک لیا۔ دریائے چنبلی پار کرنے کے بعد ہی لشکر دہلی کی طرف روانہ ہو سکتا تھا۔ اس احمق نے یہ نہ سوچا کہ جس اورنگ زیب نے چالیس ہزار کے تھکے ہوئے لشکر کے ساتھ راجہ جسونت سنگھ اور قاسم خاں کے پچاس ہزار کے لشکر کو شکست دے کر میدان مار لیا ہے' اس کے لئے دریائے چنبلی پار کرنا کیا مشکل ہو سکتا ہے۔

شہزادے اورنگ زیب نے اس وقت حکم دیا کہ ایک راہبر ایسا تلاش کیا جائے جو دریائے چنبلی پر ایسا مقام تلاش کرے جہاں سے فوج بغیر کشتیوں کے گزر سکتی ہو یعنی وہاں دریا پایاب ہونا چاہئے۔ پر دریا میں ایسے مقامات ہوتے ہیں جہاں گھٹنوں گھٹنوں پانی ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی رات کو ایک شخص ایسا مل گیا جو اس مقام کو جانتا تھا اور وہاں سے کئی بار گزر کر دریا پار جا چکا تھا۔

شہزادے نے فوراً" ایک سردار بھیج کر اس مقام کا معائنہ کرایا۔ راستہ بتانے والا

سردار کو ساتھ لے کر دریا میں اترا اور اسے ساتھ لے کر دریا پار کر گیا۔ اس یقین کے بعد سردار نے شہزادے کو یقین دلایا کہ وہ جگہ واقعی محفوظ ہے دریا کو پار کیا جا سکتا ہے۔

ادھر شہزادہ دارا دریائے چنبل پر پورا توپخانہ نصب کئے بیٹھا تھا کہ وہ اورنگ زیب کو دریا پار کر کے آگرہ کی طرف نہ جانے دے گا۔ اورنگ زیب نے ان پر خیمہ وہیں نصب رکھے اور دارا پر ظاہر کیا کہ وہ دریا پار کرنے کے لئے پریشان ہے پھر جب شام ہو گئی تو خیمے ڈیرے اسی طرح چھوڑ کے شہزادہ لشکر کے ساتھ خفیہ راستہ سے معہ توپخانہ کے دریا پار کر گیا اور دوسری جانب پہنچ کے توپوں کو دارا کی سمت نصب کر دیا۔

صبح ہوئی تو دارا یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اورنگ زیب کے خیمے ڈیرے تو دوسری طرف لگے ہیں مگر اس کا لشکر اور توپخانہ اس کے سامنے نصب ہے۔ دارا یہ منظر دیکھ کر ایسا گھبرایا کہ وہ جگہ فوراً" چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اورنگ زیب کا مقصد اس سے جنگ کرنا نہیں بلکہ آگرہ پر قبضہ کرنا تھا۔ چنانچہ اس نے دارا کا تعاقب نہیں کیا۔

جب آگرہ میں خبر پہنچی کہ شہزادے اورنگ زیب نے دارا کے بڑے لشکر کو شکست دینے کے بعد دھولپور پہنچ کے دریائے چنبل بھی پار کر لیا ہے تو شاہجہان اور ان کی پیاری بیٹی جہاں آرا کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس دور کے تمام حالات معلوم ہوتا ہے شہزادی جہاں آرا نے اورنگ زیب کو کبھی پسند نہیں کیا اور اس نے ہر دفعہ اور ہر موقعہ پر دارا کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔

اب بھی اس نے شہنشاہ کی طرف سے اورنگ زیب کو ایک بہت پر اثر اور اس سے زیادہ پر فریب خط بھیجا جس میں اورنگ زیب کو بادشاہ کی صحت یابی کی اطلاع دی اور اسے اس فوج کشی پر نرمی سے ملامت کی پھر باپ اور بڑے بھائی کی عزت کرنے کا مشورہ دیا۔

مگر اورنگ زیب اس سے کہیں زیادہ جہاندیدہ اور تجربہ کار تھا۔ اس نے اس کی تمام چالیں اسی پر الٹا دیں اور یہی لکھا میں شہنشاہ کی قدم بوسی کو حاضر ہو رہا ہوں دارا کو چاہئے کہ وہ اپنی جاگیر "پنجاب" میں چلا جائے تو اس کے لئے بہتر ہو گا۔

بہرحال اس خط و کتابت کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ دارا ساموگڑھ پہنچ گیا اور اس نے وہاں مورچے قائم کر لئے۔ اورنگ زیب کو آگرہ جانے سے روکنے والا کوئی باقی نہ رہ گیا تھا۔

سموگڑھ کی لڑائی

اورنگ زیب اور دارا شکوہ کے درمیان لڑی جانے والی سموگڑھ کی یہ جنگ برصغیر کی عظیم جنگوں میں سے ایک جنگ تھی۔ چھ رمضان ۱۰۶۹ء کو دوپہر کے وقت ایک طرف سے دارا شکوہ اور دوسری طرف سے اورنگ زیب کا لشکر سموگڑھ کے چٹیل میدان میں داخل ہوئے۔ ایک دن بڑی سخت دھوپ تھی اور میدان آگ کی طرح تپ رہا تھا۔ دارا کے لشکر کو فوقیت حاصل تھی۔ اس کے پاس شہنشاہ شاہجہان کا پورا مغل لشکر' لاتعداد ہاتھی اور بہت بڑا توپ خانہ تھا۔ راجپوت دستے الگ اس کی مدد کو موجود تھے۔

دھوپ کی شدت کا تقاضہ تھا کہ لشکر کو آرام دیا جائے مگر دارا نے کسی سوار کو گھوڑے سے اترنے کی اجازت نہ دی جبکہ اورنگ زیب نے فوج کو اترنے اور ستانے کا حکم دیا۔ دارا کا خیال تھا کہ اورنگ زیب فوراً" ہی جنگ شروع کر دے گا مگر اورنگ زیب تجربہ کار جرنیل تھا جبکہ دارا شکوہ کو شاہجہان نے میدان جنگ کا منہ بھی نہ دیکھنے دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں لشکر سخت دھوپ میں تمام دن تپتے رہے۔ فرق یہ رہا کہ دارا کا لشکر سوار رہا اور اورنگ زیب کے لشکری گھوڑوں سے اتر کے ان کے سایہ میں میدان پر نظریں جمائے بیٹھے رہے۔

دارا کو رات کو شب خون کا خطرہ تھا اس لئے اس نے اپنے لشکر کو رات کو بھی ہوشیار اور جگائے رکھا۔ پھر سویرا ہوا دونوں طرف سے صف بندی شروع ہوئی۔ بڑی جنگوں میں صف بندی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اورنگ زیب نے میمنہ (دایاں بازو) پر چھوٹے بھائی مراد کو جس کے ساتھ دس ہزار سوار تھے' مقرر کیا۔ شہزادہ مراد ایک بے مثل لڑاکا جوان تھا۔ میسرہ (بایاں بازو) پر اورنگ زیب نے بڑے بیٹے محمد سلطان کو مقرر کیا جو انتہائی ذہین اور محتاط جوان تھا۔

دونوں بازوؤں کو اور زیادہ مضبوط کرنے کے لئے اورنگ زیب نے اپنے دو بڑے سپہ سالاروں شیخ میر اور بہادر خان کو پانچ پانچ ہزار سوار دے کر حکم دیا کہ دونوں بازوؤں پر نظر رکھیں اور وقت ضرورت مدد کریں۔ قلب فوج میں دس ہزار سواروں کے ساتھ اورنگ زیب نے خود قیام کیا اور دس ہی ہزار سپاہیوں کے ساتھ بلخ میں بہادری کا مظاہرہ کرنے

والے ذوالفقار خان کو ہراول سجایا۔

اس طرح اورنگ زیب کی صف بندی بہترین تھی جسے توڑنا دارا جیسے ناتجربہ کار انسان کا کام نہ تھا حالانکہ اس کے لشکر میں مغل سرداروں میں رستم خاں، خلیل خاں، ظفر خاں، داود خاں، شہباز خاں اور رام سنگھ جیسے وفادار راجپوت موجود تھے۔ مگر دارا کے لشکر میں جوش و ولولہ کی کمی تھی کیونکہ ان کا ہر سردار جانتا تھا کہ اورنگ زیب دارا کے مقابلے میں بادشاہت کا زیادہ اہل ہے اور اس جذبہ نے اورنگ زیب کے لشکر میں ایک طرح کا عزم پیدا کر دیا تھا۔

جنگ کا نقارہ بجتے ہی دونوں لشکر ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ اس کے ساتھ ہی دارا کے توپ خانے نے آگ برسانا شروع کر دی۔ اورنگ زیب کے توپ خانے نے آگ کا جواب آگ سے دیا مگر دارا کا مغل سردار رستم خاں اپنے دس ہزار سواروں کے ساتھ اورنگ زیب کے توپ خانہ پر چڑھ آیا۔ اورنگ زیب نے فوراً بہادر خاں کو اشارہ کیا۔ بہادر خاں بڑی تیزی سے اورنگ زیب کے توپ خانے اور رستم خاں کے درمیان حائل ہو گیا۔

لڑائی نے طول کھینچا۔ بہادر خاں زخمی ہوا۔ اس کے دونوں نائب دلاور اور ہادی خاں مارے گئے۔ مرنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ دارا شکوہ کا رستم خاں آفت مچائے ہوئے تھا اور قریب تھا کہ لڑائی کا پانسہ پلٹ دے کہ اورنگ زیب نے جو دو سردار اسلام خاں اور شیخ مہر کو پانچ پانچ ہزار سواروں کے ساتھ دائیں بائیں کی مدد پر مقرر کیا تھا وہ دونوں طرف سے یلغار کرتے رستم تک پہنچ گئے اور پھر ایسی تلوار چلی کہ دوست دشمن کی تمیز باقی نہ رہی۔

رستم خاں نے بڑی بہادری دکھائی اور بڑی جیداری سے لڑا مگر زخمی ہوا اور زخموں کی تاب نہ لا کر زین سے لٹک گیا۔ اسلام خاں نے آگے بڑھ کے اس کا سر کاٹا اور لا کے اورنگ زیب کے قدموں میں ڈال دیا۔ یہ فتح کا پہلا نشان تھا۔ لڑائی ابھی رکی نہ تھی مگر رخ ضرور بدل گیا تھا۔

مغل لشکر کے راجپوت بہت زور مار رہے تھے۔ روپ راج سنگھ ان کا سردار تھا۔ اس نے مراد پر حملہ کیا۔ مراد ہاتھی پر سوار تھا۔ روپ راج سنگھ نے اس پر تیروں اور

نیزوں کی بارش کر دی۔ مراد کا فیلبان مارا گیا۔ اس کا ہودج چھلنی ہو گیا۔ مراد کو کئی زخم پہنچ چکے تھے مگر وہ ہودج میں کھڑا تیر برسا رہا تھا۔

روپ راج سنگھ جو راٹھور تھا وہ لڑتا پڑتا، نیزا تانے مراد کے ہاتھی کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اس نے مراد پر تاک کر نیز کھینچ مارا۔ مراد غالباً ہوشیار تھا یا اس کی زندگی باقی تھی کہ روپ راج سنگھ کا نشانہ خطا گیا۔ مراد کے سواروں نے روپ راج سنگھ راٹھور کی اس جرات پر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ پھر تو ہر طرف سے راجپوت یلغار کرتے مراد کے ہاتھی پر حملہ آور ہو گئے۔ اوز ہاتھی کے گرد زبردست شمشیر زنی ہوئی۔

اورنگ زیب نے مراد کو راجپوتوں کے گھیرے میں دیکھا تو گھوڑا چھکا کر فوراً ادھر پہنچا۔ اورنگ زیب کے ساتھ پٹھان دستے تھے۔ اب پٹھانوں اوز راجپوتوں میں جنگ شروع ہو گئی۔ راجپوت یہ بھول گئے کہ وہ دارا کے سوار ہیں۔ انہیں تو صرف پٹھان نظر آ رہے تھے اور پٹھان یہ فراموش کر بیٹھے تھے کہ وہ شہزادہ اورنگ زیب کے سوار ہیں۔ انہیں تو اپنے اردگرد صرف راجپوت نظر آ رہے تھے۔ اس طرح یہ جنگ دارا اور اورنگ زیب کے بجائے راجپوت جو ہندو تھے اور پٹھان جو مسلمان تھے، کے درمیان لڑی جانے لگی۔

مراد اور اورنگ زیب کے سر اتارنے کی آرزو ہر راجپوت کے دل میں تھی مگر اورنگ زیب کے پٹھان محافظ دستوں نے ان کے سامنے دیوار چن کر کھڑی کر دی تھی۔ اگر شاہجہاں کو میدان جنگ میں وہ جگہ دکھائی جاتی جہاں راجپوتوں نے اورنگ زیب کا سر اتارنے کی کوشش میں اپنے سر اتروا دیئے تھے تو اسے معلوم ہوتا کہ اس کوشش میں ایک ہزار راجپوتوں نے اپنی گردنیں کٹوا دی تھیں اور ان کی لاشیں اورنگ زیب کے گرد بکھری پڑی تھیں۔

کم و بیش اتنی ہی لاشیں مراد کے ہاتھی کے گرد بھی پڑی ہوئی تھیں۔ یہ سب کے سب راجپوت تھے جو پٹھانوں سے اس لئے لڑ رہے تھے کہ وہ مسلمان تھے اور ان کا قتل ان کے لئے جائز اور ان کی سربلندی کا ضامن تھا۔ شاہجہاں کو دارا کی محبت نے اس قدر اندھا کر دیا تھا کہ اس نے پوری مغل فوج کو سموگڑھ بھیج کے دراصل اپنے دو بیٹے اورنگ زیب اور مراد کی موت کے محضر پر دستخط کر دیئے تھے۔ مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

دراصل مراد کے سواروں اور اورنگ زیب کے پٹھان دستوں نے لڑائی کا پانسہ پلٹ

کے رکھ دیا۔ انہوں نے بے مثال جاں نثاری کا ثبوت دیا۔ دارا کو اپنے راجپوت لشکر اور اس کے سردار چترسال پر بہت ناز تھا۔ مگر جب وہ سب مراد اور اورنگ زیب کو زیر کرنے کی کوشش میں خود ہی اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تو دارا کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونا شروع ہوئے۔

ان خدشات کے باوجود دارا راجپوتوں کی مدد کو پہنچا۔ مگر اس کے ہاتھی کو دیکھتے ہی اورنگ زیب کے توپ خانے نے اپنا رخ اس کی طرف کر دیا اور ہاتھی کے اردگرد گولے گرنے لگے۔ مراد کے ساتھیوں نے یہ دیکھا تو چیخ اٹھے۔

"جان بچایئے۔ ہاتھی سے کود کے گھوڑے پر سوار ہو جایئے۔"

اس کے ساتھیوں کا مشورہ نیک اور بروقت تھا۔ دارا نے اس پر فوراً عمل کیا۔ وہ ہاتھی سے کودا اور جلدی سے گھوڑے پر سوار ہو گیا مگر اورنگ زیب کے دستے اس کی طرف لپکے۔ اس وقت دارا کے چند سواروں نے دارا اور اس کے بیٹے سپہر شکوہ کی باگیں سنبھالیں اور ان کا رخ آگرہ کی طرف کر دیا۔

دارا کی جان تو بچ گئی مگر اسے ہاتھی سے غائب دیکھ کر لشکر نے یہ اندازہ لگایا بلکہ انہیں یقین ہو گیا کہ دارا مارا گیا۔ پس اس کی موت کی خبر ہر طرف پھیل گئی اور بچی کھچی فوج بھی میدان چھوڑ بھاگی۔

اورنگ زیب یہ دیکھ کر جہاں کھڑا تھا وہیں سجدہ ریز ہو گیا اور حق تعالیٰ کے حضور عجز و انکسار سے عرض کیا۔

"اے خداوند۔ یہ سب تیرا کرم ہے کہ تو نے اس عاجز اور گنہگار کو یہ اعزاز عطا فرمایا۔"

ساموگڑھ کی جنگ نے سلطنت مغلیہ کا تخت و تاج اورنگ زیب کے قدموں میں لا ڈالا۔ دارا شکست کھا کر آگرہ پہنچا۔ وہاں سے اس نے مال و خزانہ حاصل کیا اور بغیر باپ (شاہجہاں) سے ملاقات کئے دہلی کی طرف روانہ ہو گیا۔

شہزادہ مراد نے اس جنگ میں اپنی شجاعت اور بہادری کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے۔ اگرچہ وہ کافی زخمی ہوا تھا مگر اس جنگ کا ہیرو اسی کو کہا جا سکتا ہے۔ اورنگ زیب نے اس کی بہادری کی پوری داد دی مگر مفاد پرست ہر جگہ موجود ہوتے ہیں پھر یہ تو تخت و تاج کی

جنگ تھی۔ دارا بھاگ چکا تھا۔ شاہ شجاع اور بنگالی مین تھا۔ سامنے شہزادہ مراد اور اورنگ زیب تھے۔

پس مفاد پرستوں نے مراد کو بھڑکایا۔ پھر جب اورنگ زیب آگرہ کی طرف چلا تو اس نے مراد کو اپنا لشکر لے کر ساتھ چلنے کو کہا مگر مراد ایک تو پہلے ہی سے لاپرواہ انسان تھا دوسرے مفاد پرستوں نے اسے بادشاہت کے خواب دکھائے تھے۔ پس وہ آگرہ کی طرف چلا ضرور مگر اپنا لشکر اورنگ سے کچھ دور پیچھے رکھتا اور اس سے کہیں زیادہ عقلمند تھا۔ اس کی نظریں مراد کے دل تک پہنچ گئی تھیں مگر اس نے خاموشی اختیار کئے رکھی۔

ادھر آگرہ پہنچ کے اورنگ زیب اور شہنشاہ شاہجہاں میں گفتگو شروع ہوئی۔ شہنشاہ نے اورنگ زیب کو قلعہ میں گفتگو کے لئے طلب کیا۔ اورنگ زیب نے امراء اور سرداروں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے اسے قلعہ میں جانے سے روک دیا۔ اورنگ زیب نے صاف طور پر انکار تو نہیں کیا مگر یہ مطالبہ کر دیا کہ قلعہ کا انتظام اس کے آدمیوں کے ہاتھوں میں دے دیا جائے۔

اس طرح کی گفت و شنید اور پیام و سلام کئی دن تک جاری رہے۔ شاہجہاں کی بیٹی حسن آرا جس کی اپنی زندگی باپ کی خدمت کے لئے وقف کر دی تھی وہ خود اورنگ زیب کے پاس آئی۔ اس نے سلطنت مغلیہ کو پانچ حصوں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ پیش کیا۔ چار حصے تو چار بھائیوں کے اور پانچواں حصہ پانچویں آزاد ریاست اورنگ زیب کے بڑے بیٹے سلطان محمد کو دی جائے۔ اس ریاست یا حکومت کے لئے دکن کا علاقہ رکھا گیا تھا جہاں کا گورنر اب تک اورنگ زیب تھا۔

غرض یہ کہ اس تمام گفتگو کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ قلعہ کے دروازے اورنگ زیب پر بند کر دیئے گئے۔ اورنگ زیب نے توپوں کا منہ قلعہ کی طرف کرا دیا۔ کچھ گولے چلے بھی اور آخر شاہجہاں کو قلعہ کا قبضہ اورنگ زیب کو دینا پڑا۔

اب اورنگ زیب کو شہزادہ مراد کی فکر تھی جس کے ساتھ بیس ہزار کا لشکر تھا اور جو ہند کی بادشاہت کے خواب دیکھ رہا تھا۔ یہ بڑا مشہور مقولہ ہے کہ محبت اور جنگ میں ہر بات اور ہر قدم جائز ہوتا ہے۔ اس پر اورنگ زیب نے عمل کیا اور قاصد کے ذریعہ اپنی شدید بیماری کی خبر مراد کو بھجوائی۔ مراد کے دماغ میں جو کچھ ہو مگر بھائی کی بیماری کا حال سن

کر وہ بے چین ہو گیا اور بیوی اور بیٹی کے روکنے کے باوجود اسی وقت گھوڑے پر سوار ہو گیا اور بھائی کے پاس پہنچ گیا۔

اورنگ زیب بہت محبت سے پیش آیا۔ دونوں بھائیوں نے ایک ساتھ کھانا کھایا۔ دونوں دیر تک گفتگو کرتے رہے پھر اورنگ زیب نے مراد کو قیلولہ کرنے کا مشورہ دیا اور دوسرے خیمے میں چلا گیا۔ مراد کا دل بالکل صاف تھا۔ وہ بھائی کی محبت میں بھاگا چلا آیا تھا مگر اورنگ زیب نے واقعی فریب سے کام لیا۔

جب مراد اسلحہ اتار کر سونے کے لئے لیٹ گیا تو اس کے ہتھیار اٹھا لئے گئے اور مراد کو گرفتار کر لیا گیا۔ اسے اسی وقت ہاتھی پر سوار کر کے سخت پہرے میں شاہجہاں آباد روانہ کر دیا گیا۔ اس کی اطلاع جب مراد کے بیس ہزار نیزہ بازوں اور شمشیر زنوں کو پہنچی تو ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا وہ تمام کے تمام اورنگ زیب کی ملازمت میں آ گئے اور ایک سپاہی نے بھی احتجاج نہیں کیا۔

مراد کی گرفتاری اور اس کی فوج کی اطاعت کی اطلاع دارا کو دہلی میں مل گئی تھی۔ وہ بیس ہزار کے نئے لشکر کے زور پر دہلی میں قدم جمانے کی ڈول ڈال رہا تھا مگر اس خبر نے اسے لرزا دیا اور جب اورنگ زیب کی سواری آگرہ سے دہلی چلی تو دارا کو دہلی خالی کر کے لاہور کا رخ کرنا پڑا۔ اس طرح دارا تخت و تاج سے ہمیشہ کے لئے دور ہو گیا۔

اورنگ زیب جس طرح فاتحانہ آگرہ میں داخل ہوا تھا اسی طرح شاہجہاں آباد (دہلی) میں داخل ہوا۔ اس نے تین دن دہلی میں گزارے اور چوتھے روز یعنی بروز جمعہ یکم ذیعقد ۱۰۴۹ء ہجری کو اورنگ زیب نے تخت سلطنت پر قدم رکھا اور ہند کی شاہی کا تاج اپنے سر پر رکھا۔ گو کہ یہ تخت نشینی سادگی سے منائی گئی مگر پروقار تقریب تھی۔ خزانے کے منہ کھل گئے اور غریبوں اور محتاجوں کی مرادیں بھر آئیں۔

اورنگ زیب نے اپنے منصوبہ کے مطابق دہلی سے لاہور کی طرف کوچ کیا تو دارا کے تمام انتظامات دھرے رہ گئے۔ اس نے خبر پاتے ہی لاہور چھوڑا اور ملتان پہنچ گیا۔ لشکر اور سرداروں کے ایک معتدبہ حصہ نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا کیونکہ ہر شخص اور خاص کر شخصی حکومتوں میں لوگ چڑھتے سورج کی پرستش کرنے اور ڈوبتے سورج کی طرف سے منہ موڑ لیا کرتے تھے اور یہ کیفیت آج بھی ہمارے ملک پاکستان میں ہے۔ حکومت بدلتی ہے تو

وفاقی اور صوبائی ممبروں کی وفاداریاں بھی بدل جاتی ہیں۔

اورنگ زیب نے بھی لاہور پہنچ کے ملتان کا رخ کیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اورنگ زیب نے دارا کے تعاقب کی قسم کھا لی تھی۔ دارا کو علم ہوا تو اس نے ملتان کو بھی خیر باد کہا اور سندھ کا رخ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ راجپوتانہ میں وہ شجاع اور اپنے بیٹے سلیمان شکوہ سے مل جائے گا۔ سلیمان شکوہ کو دارا نے شجاع کے خلاف جنگ کے لئے بھیجا تھا مگر جب اورنگ زیب کی کامیابیاں سامنے آنے لگیں تو شجاع اور دارا ایک ہو گئے اور دونوں میں طے ہوا کہ دونوں مل کے اورنگ زیب کا مقابلہ کریں گے۔

دارا اور شجاع میں خفیہ نامہ و پیام جاری تھے اور دونوں کی راجپوتانہ کے کسی مقام پر ملاقات طے ہو چکی تھی۔ چنانچہ شجاع بنگال سے نکلا اور بڑی خاموشی سے پٹنہ پہنچ گیا۔ اب اس کے ارادے ظاہر ہو گئے۔ اورنگ زیب کے بہی خواہوں نے فوراً گھوڑے دوڑائے اور اسے اطلاع بھیجی کہ شجاع آندھی کی طرح اڑتا پٹنہ پہنچ چکا ہے۔

اورنگ زیب اس وقت ملتان میں تھا کہ اسے شجاع کے پٹنہ پہنچنے کی اطلاع ملی۔ یہ خبر بڑی تشویشناک تھی۔ اورنگ زیب نے فوراً شیخ میر اور چند دوسرے سرداروں کے سپرد پندرہ ہزار لشکر کیا اور انہیں دارا کے تعاقب میں پٹنہ روانہ کر دیا اور خود لاہور ہو کر دہلی پھر دہلی سے قنوج کی طرف چلا۔ اس وقت تک شجاع‘ بنارس جون پور اور ایمہ آباد پر قبضہ کر چکا تھا۔

الہ آباد پر پہلے دارا کے گورنر خان دوران عاقل خاں کا قبضہ تھا مگر دارا ہی کے حکم پر اس نے الہ آباد شجاع کے حوالہ کر دیا اور خود کورہ کھاتم پور چلا گیا۔ اورنگ زیب بھی قنوج سے سیدھا کورہ کھاتم پور پہنچا۔ شجاع نے یہ سنا تو خود بھی لشکر لے کر الہ آباد سے کورہ کھاتم پور کا رخ کیا اور اورنگ زیب سے چھ میل کے فاصلہ پر پڑاؤ ڈالا۔

راجہ جسونت سنگھ جس نے دارا کے حکم سے اورنگ زیب کا جنوبی ہند سے آگرہ آتے ہوئے راستہ روکا تھا اور پھر اورنگ زیب کا سورج چڑھتا دیکھ کر دارا کو چھوڑ کے اورنگ زیب کا ہو گیا تھا۔ وہ اس وقت بھی اورنگ زیب کے لشکر میں اپنے دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ موجود تھا مگر جس طرح اس نے دارا کا زوال دیکھ کر اورنگ زیب کا دامن پکڑا تھا‘ آج اسے شجاع کا سورج دکھائی دیا تو فوراً اورنگ زیب سے غداری کی۔

جس صبح کو اورنگ زیب اور شجاع کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابل ہونے والی تھیں، راجہ جسونت سنگھ اپنے دس ہزار سپاہی لے کر چھاؤنی سے نکلا اور شہزادہ سلطان محمد (اورنگ زیب کا بڑا بیٹا) کے گروہ کے خیمے لوٹ لئے۔ کئی مغل سپاہیوں کی گردنیں قلم کر دیں اور خوفناک زلزلے لہراتا پیچھے ہٹ گیا۔

خان دوران نے اس واقعہ کو بہت خوفناک بیان کیا ہے مگر جب اورنگ زیب کو اس واقعہ کی اطلاع دی گئی تو اس نے بڑی بے پروائی سے کہا۔

"جسونت سنگھ کا وجود اور عدم وجود ہمارے نزدیک یکساں ہے۔"

دوسری صبح کو جب اورنگ زیب اور شجاع کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں تو معلوم ہوا کہ جسونت سنگھ کا وجود اور عدم موجود واقعی اورنگ زیب کے لئے برابر تھا۔ اس جنگ میں شہزادہ سلطان محمد، ذوالفقار خاں اور بہادر خاں نے شجاعت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ انہوں نے دشمن کی صفیں الٹ کے رکھ دیں۔ اورنگ زیب ایک تجربہ کار جرنیل کی طرح لشکر کی کمان کر رہا تھا۔ اس نے اس قدر ثابت قدمی کا ثبوت دیا کہ اس کی مثال اس کے کسی بھائی میں نہیں ملتی۔

شجاع کے سپاہیوں کو زیادہ دیر جنگ کرنے کی طاقت نہ تھی۔ عین لڑائی کے دوران مکرم خاں اور اس کی جماعت شجاع سے کٹ کے اورنگ زیب سے آن ملی۔ شجاع یہ حال دیکھ کر میدان چھوڑ گیا اور اس نے بنگال کی راہ لی۔ جسونت سنگھ نے جو غداری کی تھی اس کے لئے وہ تمام ہندوستان میں بدنام ہو گیا۔ اورنگ زیب کو فتح حاصل ہوئی۔ وہ ہاتھی سے اترا اور زمین پر خدائے بزرگ و برتر کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔

اورنگ زیب نے شہزادہ سلطان محمد کو شجاع کے تعاقب میں روانہ کیا اور خود اکبر آباد (آگرہ) آیا۔ راستے میں ہی اسے اطلاع ملی کہ دارا ٹھٹھ کے راستے راجپوتانہ ہوتا ہوا اجمیر گیا ہے۔ یہ خبر ملتے ہی اورنگ زیب بھی اجمیر روانہ ہو گیا۔ دارا جب احمد آباد پہنچا تو اس وقت اورنگ زیب اور شجاع کی جنگ نہیں ہوئی تھی۔

دارا کو جسونت سنگھ کی اورنگ زیب سے غداری کی اطلاع ملی تو اسے نئی امید بندھی۔ اس وقت جسونت سنگھ کی دوستی کا پیغام ملا۔ دارا کی باتیں رکھی گئیں وہ جسونت سنگھ سے ملنے مارواڑ کی طرف بڑھا۔ ادھر شجاع شکست کھا کر بنگال بھاگا اور جسونت سنگھ کو

ہوش آیا کہ دارا میں وہ زور نہیں کہ وہ اورنگ زیب کے مقابلہ پر ٹھہر سکے۔ چنانچہ اس نے فوراً پینترا بدلا اور دارا کو کہلا بھیجا کہ ہمارے پاس نہ آئے۔ دارا نے تحائف دے کر بیٹے کو جسونت سنگھ کے پاس بھیجا مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوا اور صاف صاف کہہ دیا۔

"بابا سے کہنا میرے لئے جہاں پناہ کے مقابلہ پر ان کا ساتھ دینے کا حوصلہ نہیں۔ میں مجبور ہوں۔"

دارا مجبوراً اجمیر میں داخل ہوا۔ وہاں کا گورنر بھاگ کے اورنگ زیب کے پاس پہنچ گیا۔ اورنگ زیب نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ جس دن اورنگ زیب اجمیر میں داخل ہوا دارا لڑائی کے لئے تیاری کر چکا تھا۔ تین دن شدید جنگ ہوئی۔ تیسرے دن دارا کو شکست ہوئی۔ رات ہو چکی تھی۔ دارا نے اندھیرے سے فائدہ اٹھایا اور اہل و عیال کے ساتھ گجرات کی طرف بھاگا۔ راجہ جے سنگھ بیس ہزار سواروں کے ساتھ اس کے تعاقب میں تھا۔

جسونت سنگھ نے دارا سے جو غداری کی تھی اس کے صلہ میں اسے گجرات کی صوبیداری عطا ہوئی۔

دارا اور جے سنگھ میں کئی بار جھڑپیں ہوئیں مگر ہر بار شاہی فوج غالب رہی اور دارا کو بھاگنا پڑا۔ اسی دوران ایک شب شہزادہ سلطان محمد لشکر سے نکل کے چچا کے پاس چلا گیا۔ مگر پھر اپنی غلطی تسلیم کر کے بہادر خاں کے ذریعہ شاہی فوج میں واپس آ گیا۔ وہ سمجھا تھا کہ باپ اسے معاف کر دے گا مگر اورنگ زیب نے اسے مراد کی طرح قلعہ گوالیار میں ہمیشہ کے لئے قید کرا دیا۔

دوسری طرف شجاع نے بنگال کو بھی چھوڑ دیا اور مکہ روانہ ہوا۔ مگر ایک اور بیان کے مطابق شجاع نے آسام کے جنگلوں میں بڑی بے بسی کی موت پائی۔ مراد قلعہ گوالیار میں قید تھا۔ شجاع آسام میں مارا گیا۔ باقی رہا دارا سو وہ کچھ میں بھاگتا ہوا پکڑا گیا۔ اسے دہلی اورنگ زیب کے پاس بھیجا گیا۔ دارا نے جان بخشی کی درخواست کی۔

اورنگ زیب چاہتا تو دارا کو صاف کر سکتا تھا مگر اس نے معاف نہیں کیا اور وہ قتل کرا دیا گیا۔ دارا کے بعد اس کے بیٹے سلیمان شکوہ کی باری آئی۔ وہ قید میں تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کی موت میں اورنگ زیب کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ جیل کے پہریداروں نے اسے خود ہی

ختم کر دیا۔ مگر کیوں؟ اس کا سبب نہیں معلوم ہو سکا۔

اورنگ زیب کے راستے کے تمام کانٹے ختم ہو چکے تھے۔ سوائے شاہجہاں اور مراد کے جو گوالیار میں قید تھا۔ پھر شہزادہ مراد کی بھی موت آئی مگر بڑے دلچسپ اور حیرت انگیز طریقہ سے۔ اورنگ زیب کے شہزادہ مراد کو گوالیار میں قید کرتے وقت اس کی جان کی حفاظت کی ذمہ واری اٹھائی تھی۔ چنانچہ شہزادہ مراد قلعہ گوالیار میں شہزادوں کی طرح رہتا تھا۔ اس کی پنشن اتنی زیادہ مقرر کی گئی تھی کہ نصف پنشن میں اس کے اخراجات پورے ہوتے اور نصف پنشن سے مراد نے قلعہ کے باہر ایک لنگر خانہ کھلوا دیا تھا جس سے محتاجوں اور فقیروں کو کھانا تقسیم کیا جاتا تھا۔

اس لنگر خانہ کا راز بعد میں معلوم ہوا کہ لنگر خانہ کے نام پر مراد کے تمام قدیم ملازم فقیر بن کے اس لنگر خانہ سے کھانا کھاتے تھے اور قلعہ کے اردگرد ہی پھرتے رہتے تھے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ قلعہ والوں کو غافل دیکھ کر شہزادہ مراد کو قلعہ سے آزاد کرا لیا جائے۔ اس کے بعد ان لوگوں کے کیا کیا ارادے تھے ان کا علم نہیں ہو سکا۔

پس جب شہزادے مراد کو قلعہ میں رہتے ہوئے تین سال گزر گئے تو ایک رات بلکہ وہ رات آ گئی جس کا مراد اور اس کے بہی خواہوں کو تین سال سے انتظار تھا۔ رات کے کسی پہر شہزادے کو جگایا گیا اور اس کے ایک غلام نے اطلاع دی۔

”شہزادے بہادر۔ جلدی کیجئے۔ فرار کے تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ قلعہ کی مشرقی فصیل کے ساتھ کمند لٹک رہی ہے۔ آپ اس کے ذریعہ سے نیچے اتر جائیے۔ نیچے لوگ موجود ہیں اور سواری کا بھی انتظام ہے۔ صبح ہونے سے پہلے آپ گوالیار سے بہت دور پہنچ چکے ہوں گے۔“

شہزادے مراد نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اسے تین سال بعد فرار کا موقع فراہم ہوا تھا۔ وہ فوراً غلام کے ساتھ فصیل کی طرف چلا مگر ابھی چند ہی قدم چلا تھا کہ اس کے قدم جیسے زمین نے پکڑ لئے۔ اس نے غلام سے کہا۔

”تو چند لمحے یہیں مرا انتظار کر۔ میں ابھی واپس آتا ہوں۔“

یہ کہہ کر شہزادہ مراد واپس ہونے لگا تو اس کے غلام نے اس کا دامن پکڑ لیا اور روتے ہوئے درخواست کی۔

”شہزادے بہادر۔ جان سے بڑھ کر قیمتی کوئی چیز نہیں۔ آپ وقت ضائع نہ کیجئے۔ فوراً نیچے اتر جائیے۔ جو چیز آپ لینے جا رہے ہیں مجھے بتائیے۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ اس چیز کو آپ تک ضرور پہچا دوں گا۔“

شہزادہ مراد تذبذب میں پڑ گیا۔ اس نے کہا

”میرے اچھے دوست۔ میں تمہارا محبت اور وفاداری کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ دراصل میں کوئی چیز لینے نہیں جا رہا ہوں بلکہ کسی سے رخصت ہونے جانا چاہتا ہوں۔۔۔“

غلام کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ سکا زندگی سے بڑھ کے وہ کون ہستی تھی جس سے رخصت ہونے کے لئے شہزادہ اپنی زندگی اور آزادی کی بھی پرواہ نہ کر رہا تھا۔ اس نے پھر درخواست کی۔

”شہزادے بہادر۔ میری جان آپ پر قربان۔ وقت ضائع نہ کیجئے پہلے جان بچائیے اگر زندگی رہی تو کسی وقت بھی کسی سے مل سکتے ہیں مگر جب موت ہی آ گئی تو پھر کیا حاصل ہو گا۔۔“

شہزادے مراد نے ہلکا سا جھٹکا دے کر اپنا دامن غلام کے ہاتھ سے چھڑا لیا اور بولا۔

”میرے دوست۔ تم مطمئن رہو۔ میں صرف چند لمحوں میں واپس آ جاؤں گا۔ تم میرا یہیں انتظار کرو۔“

یہ کہتا ہوا شہزادہ سیڑھیاں اتر کر نیچے چلا گیا اور غلام اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

شہزادہ مراد کی اس بے چینی اور فیصل سے واپسی کی وجہ یہ تھی کہ جس وقت غلام نے اسے جگا کر آزادی کی نوید دی اور بتایا کہ فصیل کے ساتھ کمند لٹکا دی گئی ہے اور نیچے سواری کے لئے تیز رفتار گھوڑا موجود ہے تو شہزادہ مراد خوشی سے اس قدر پھول گیا کہ اسے سوائے اپنے اور دنیا کے کسی درد کے بارے میں سوچنے کا وقت ہی نہ ملا۔ آزادی کی خوبصورت دیوی اس کے سامنے گھنگرو بجاتی اور ناچتی رہی اور شہزادہ اس کی تھاپ پر غلام کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ کے فصیل پر پہنچ گیا۔

شہزادہ جہاں تک پہنچا تھا وہاں سے صرف چند قدم کے فاصلہ پر فصیل سے کمند لٹکی اس کا انتظار کر رہی تھی کہ اچانک شہزادہ مراد کو اپنی محبوبہ دلنواز سوسن بائی کا خیال آیا اور اس کے قدم اک دم رک گئے۔ اس کا دل زور سے دھڑکا اور آواز دی۔

"اے شہزادے یہ اصول محبت اور طریق دلداری کے خلاف ہے کہ محبوب کو آزادی کی خبر سنائے بغیر قلعہ سے باہر ہو جاؤ۔ آخر یہ کہاں کا دستور ہے اور آئین محبت کا کون سا قانون ہے کہ اپنی محبوبہ کو اس عظیم خوشی کی اطلاع نہ دو۔"

شہزادے کے دل سے اٹھتی ہوئی یہ آواز تھی جو اس کے پیروں میں زنجیر بن کے الجھ گئی اور شہزادہ آگے بڑھنے کے بجائے غلام سے معذرت کر کے سوسن بائی کی خوابگاہ کی طرف چل پڑا۔ سوسن خود اپنی مرضی سے تین سال سے شہزادے کے ساتھ اس قید خانہ میں رہ رہی تھی۔ باہر جانے کے علاوہ اسے دنیا کا تمام عیش و آرام میسر ہے۔

شہزادے مراد نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوس کے رخسار پر انگلی رکھی اور آہستہ سے آواز دی۔

"سوسن"

سوسن کی آنکھوں میں اس وقت بھی شہزادے ہی کے خواب سجے ہوئے تھے۔ وہ شہزادے کی آواز پر بڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔

"شہزادے آپ؟" سوسن نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

شہزادے نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے اسے خاموشی کا اشارہ کیا پھر سرگوشیوں میں کہا۔

"خوش ہو جا سوسن تیرا شہزادہ آج آزاد ہو رہا ہے۔"

"اور میں---؟" سوسن نے بھی سرگوشی کی۔

"بس چند دن کی بات ہے۔ سلطنت سنبھالتے ہی میں تجھے ملکہ بنا کے یہاں سے لے جاؤں گا۔"

"تو کیا تم اکیلے جا رہے ہو شہزادے؟"

"ہاں۔ اس وقت مجبوری ہے۔ اس وقت صرف میری رہائی کا انتظام ہوا ہے مگر تو مت گھبرا۔ میں باہر نکلتے ہی تاجدار ہند بن جاؤں پھر تو تخت شاہی پر ملکہ نور جہاں کی طرح میرے ساتھ رہے گی۔"

اس کے جواب میں سوسن نے بے تابی کے عالم میں کھڑے ہو کر شہزادے مراد کو دبوچ لیا۔ وہ اس سے لپٹ گئی۔ چمٹ گئی۔ دونوں ایک جان دو قالب ہو گئے۔

شہزادہ گھبرا گیا۔ اس نے التجا کی۔

خود کو سنبھال۔ مجھے چھوڑ دے۔ کمند فصیل سے لٹکی ہے۔ میں دم بھر میں قلعہ سے باہر ہو جاؤں گا۔ میں--- میں ہوں گا اور تو' تو ہو گی۔"

"نہیں شہزادے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔" سوسن نے صاف انکار کر دیا۔ "تم اکیلے کیسے جا سکتے ہو۔" مجھے کس پر چھوڑ کے جا رہے ہو۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

شہزادہ بڑی مشکل سے اس کی گرفت سے نکلا۔

"ہوش میں آ سوسن۔ اپنی آواز دھیمی رکھ۔ پہریدار جاگ پڑے تو غضب ہو جائے گا۔"

اور سوسن ایک بار پھر دوڑ کے اس سے لپٹ گئی۔ وہ روتے ہوئے بولی۔

"شہزادے تم میری جان ہو۔ میں تمہیں کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔ مرنا ہے تو دونوں ساتھ مریں گے۔ زندہ بھی ساتھ ہی رہیں گے۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ شہزادے خوشبو کبھی پھول سے جدا ہوئی ہے جو سوسن تمہیں چھوڑ کے جانے دے۔"

ادھر تو دو دیوانوں بلکہ نادانوں کا یہ ڈرامہ ہو رہا تھا۔ ادھر پہریدار فصیل کے اندر باہر لٹک لٹک کے دیکھ رہے تھے کہ یہ آوازیں کدھر سے آ رہی ہیں۔ سینکڑوں شمعوں کی لپکتی زبانیں باہر آ گئی تھیں اور پوری فصیل پر دن کا سماں معلوم ہوتا تھا۔ کچھ پہریدار شمعوں کی روشنی میں تلواریں سونتے چاروں فصیلوں کی تلاشی لے رہے تھے اور کچھ باتوں کی آواز پر ڈھونڈتے ہوئے سوسن کی خوابگاہ تک پہنچ گئے تھے۔

ایک ہی وقت میں فصیل سے لٹکتی کمند پر نظر پڑی اور ایک پہریدار سوسن کی خوابگاہ کا دروازہ دھکیل کر اندر پہنچا۔ سوسن شہزادے سے لپٹی کھڑی تھی اور اسے اس مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی جیسے وہ چھوٹتے ہی اڑ جائے گا۔

"تم کیوں آئے ہو یہاں---" مراد نے ڈپٹ کے کہا۔

پہریدار نے ادب سے جواب دیا۔

"سوسن بائی کی آواز یہاں لے آئی ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ آپ کہاں جا رہے ہیں شہزادے؟"

"میں کہاں جا رہا ہوں؟" شہزادے نے بات بنائی۔ "تمہیں دھوکہ ہوا ہے۔ دراصل

سوسن آج ذرا کچھ زیادہ جذباتی ہو گئی۔ تم مجھے دیکھ رہے ہو۔ میں تو یہیں ہوں۔ میں کہاں جا رہا ہوں۔"

اسی وقت سوسن کی خوابگاہ کا بڑا دروازہ کھلا اور کئی پہریدار تلواریں لہراتے اندر آئے۔ ایک ہاتھ میں وہ کمند تھی جسے فصیل سے لٹکایا گیا تھا۔

ایک پہریدار نے کہا۔

"شہزادے بہادر۔ آپ کے فرار کی سازش ناکام ہو گئی۔ یہ رہی وہ کمند جس سے آپ نے فصیل سے نیچے اترنا تھا۔ فصیل کے نیچے کھڑا گھوڑا اور آپ کے دوسرے ساتھی گرفتار کئے جا چکے ہیں۔ میں آپ کو گرفتار کرنے پر مجبور ہوں۔"

دوسرے پہریدار نے آگے بڑھ کر سوسن کا ہاتھ پکڑا اور جھٹکا دے کر اسے شہزادے سے الگ کر دیا۔ پھر شہزادہ مراد ننگی تلواروں کے سائے میں سوسن کی خوابگاہ سے نکل گیا۔

شاہ شجاع کے معافی مانگنے پر بھی اورنگ زیب نے اسے معاف نہیں کیا تھا اور وہ قتل کر دیا گیا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اورنگ زیب نے مراد کے قتل کا حکم نہیں دیا بلکہ چار سال پہلے قتل ہونے والے بھی نقی کے خون کی پاداش ہیں اورنگ زیب نے اس کے بیٹوں کو قاضی کے حضور بھیج کر دعویٰ دائر کر دیا۔

قاضی نے گوالیار جیل جا کر مراد پر جرح کی۔ اس نے کہا۔

"بادشاہ اگر اپنے الفاظ کا لحاظ کر کے میرے خون سے درگزر کرتے تو ان کی سلطنت کو کوئی ضعف نہ پہنچتا۔ اگر وہ خواہ مخواہ یہ چاہتے ہیں کہ میرا وجود اس دنیا میں نہ رہے تو کسی دوسرے کا بہانہ بنانے سے کیا فائدہ ------"

غرض یہ کہ قاضی نے کھلی نقی کے خون کے قصاص میں مراد کو قتل کی سزا سنا دی اور یہ آخری شہزادہ بھی دنیا سے رخصت ہو گیا۔

سوائے شاہجہاں کے شاہی خاندان کا کوئی فرد اورنگ زیب کے سامنے نہ رہ گیا تھا۔ اورنگ زیب ہر وقت شاہجہاں کی طرف سے محتاط رہتا تھا مگر جب سامنا ہوتا تو اعلیٰ حضرت اور حضور پرنور سے مخاطب کرتا۔ آخر شاہجہاں بھی آٹھ سال کی معزولی اور قید و بند کی سختیوں کے بعد دو ہفتہ کی مختصر بیماری کے بعد چھبیس رجب ۱۰۷۶ھ ہجری کو اس دار فانی سے رخصت ہو گیا۔ اس نے پیاری بیوی ممتاز محل، تین بیٹے دارا، شجاع اور مراد کی موت

کے صدمے اپنے دل پر برداشت کئے تھے۔ شاہجہاں کی موت نے وہ سارے ہنگامے ختم کر دیئے اس کی زندگی میں اورنگ زیب کی وجہ سے اٹھے تھے۔ شاہ جہاں بڑا اچھا اور نرم مزاج بادشاہ تھا۔



اب اورنگ زیب تاجدار ہند تھا۔ سلطنت مغلیہ کا عظیم الشان شہنشاہ تھا۔ اس کا کوئی مد مقابل نہ تھا۔ اس نے عدالتوں، پنچائتوں اور عوام کے دوسرے اختلافات دور کرنے کے لئے ہند کے تمام مشہور اور ممتاز علماء کرام کو قانون کی ایک کتاب یعنی "تعزیرات ہند" تیار کرائی جو فتاویٰ عالمگیری کے نام سے مشہور ہے۔ لوگ غلطی سے اسے عالمگیر کے فتوے سمجھتے ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر فقہی نہیں تھا اور نہ اس نے کبھی فتویٰ جاری کیا تھا۔

اورنگ زیب نے کبھی خلوت جلوت میں سونے چاندی کے تاروں کا لباس نہیں پہنا۔ بہت سادہ لباس پہنتا جس میں پیوند لگے ہوتے۔ وہ انصاف کا اس قدر دلدادہ تھا کہ دن میں دو دو تین تین بار کچہری لگاتا۔ امیر و غریب سب کو اپنی شکات بیان کرنے کی اجازت دی۔ مقدمہ کے دوران کسی کے منہ سے اگر گستاخی کے الفاظ نکل جاتے تو انہیں نظرانداز کر دیتا۔ ہر قسم کے چور اور جرائم پیشہ لوگ دارا لسلطنت سے نکال دیے گئے تھے۔ سرکاری خرچ سے محتاج خانے کھولے گئے تھے جہاں کمزوروں، اپاہجوں اور معذور لوگوں کو دونوں وقت کا اچھا کھانا ملتا تھا۔ مساجد کے تمام اخراجات، تزئیں، پیش امام کی تنخواہ اور دوسرے خرچ سرکاری خزانہ سے دور ہوتے تھے۔

تعلیم بالکل مفت تھی۔ کتابوں کے خرچ کے علاوہ طالبعلم کو کھانے پینے، پہننے اور رہنے کے اخراجات بھی معاف تھے۔

شروع میں اورنگزیب نے موسیقاروں اور مسخروں کی تنخواہوں میں کمی اور عدم دلچسپی کا اظہار کیا پھر جلوس کے گیارہویں سال تمام موسیقاروں اور گویوں کی تنخواہیں قطعاً بند کر دیں۔ اس کے خلاف ایک عام احتجاج ہوا۔ موسیقاروں میں ایک گروہ مسخروں کا بھی تھا۔ انہوں نے بادشاہ کو متاثر کرنے کے لئے پندرہ بیس فرضی جنازے کاندھوں پر اٹھائے اور عین اس وقت جب اورنگ زیب جمعہ کو نماز کے لئے آیا تو وہاں پہنچ گئے۔

اورنگ زیب نے اتنے جنازوں کو دیکھ کے دریافت کیا۔

"یہ کیا ہے۔ ایک ساتھ اتنے جنازے کہاں سے آئے؟"

ایک مسخرے نے آگے بڑھ کے جواب دیا۔

"عالیجاہ یہ جنازے موسیقاروں اور گویوں کے ہیں۔"

اورنگ زیب ان کی بات سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا بلکہ جواب کہلوایا۔

"ان جنازوں کو ذرا احتیاط سے دفن کیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ دوبارہ اٹھ کے واپس آجائیں۔"

اورنگ زیب کے قاضیوں میں قاضی عبد الوہاب' شیخ الاسلام' ابو سعید' خواجہ عبد اللہ' محمد اکرم اور ملا حیدر نے بہت نام پایا۔ وزرا میں اورنگ زیب کو جعفر خاں اور اسد خاں بہت پسند تھے۔ ان دونوں سے پہلے انہیں میر جملہ کا بہت انتظار رہا۔ وہ بنگال کے گورنر تھے۔ اس نے میر جملہ کے لئے وزارت کا عہدہ کئی سال تک خالی رکھا کہ وہ بنگال سے آئیں اور وزارت سنبھالیں مگر وہ بنگال سے نہ آسکے اور ۱۰۷۳ھ میں انتقال کر گئے۔

وزراء کے بعد دیوان کا عہدہ سب سے بڑا تھا۔ ہر صوبہ میں مالیات کا ذمہ دار دیوان ہوتا تھا اور گورنر تک اس سے رجوع کرتے تھے۔ وزیراعظم' دیوان اور قاضی کے بعد میر بخشی کا عہدہ تھا۔ اس کے ذمہ فوجوں کی بھرتی۔ بڑے افسروں کی نگرانی۔ فوج کی تنخواہوں کا حساب رکھنا اور فوجوں کو جنگ پر بھیجنا تھا۔

اورنگ زیب کے زمانہ سلطنت مغلیہ مندرجہ ذیل صوبوں پر مشتمل تھی:۔

اکبر آباد (آگرہ)' شاہجہان آباد (دہلی)' لاہور' ملتان' کشمیر' کابل' احمد آباد' ایسہ آباد' اجمیر' اورنگ آباد' بہار' برار' اڑیسہ' اودھ' مالوہ' خاندیش' بنگال' بیدر اور بیجا پور۔

صوبہ کا سب سے بڑا حاکم صوبیدار ہوتا تھا اورنگ زیب سے پہلے بڑے صوبوں کی حکومت عام طور پر شہزادوں کو ہی دی جاتی تھی۔ اورنگ زیب نے بھی صوبائی حکومتوں پر شہزادے مقرر کئے مگر ان کے لئے خصوصیت نہ تھی۔ صوبیدار اپنے صوبہ کے نظم و نسق کا ذمہ دار ہوتا تھا۔

اورنگ زیب پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسے کیا حق تھا کہ وہ لوگوں کے اخلاق پر احتساب بٹھائے۔ اورنگ زیب نے بالکل اسی طرح احتساب کا محکمہ قائم کیا تھا جس طرح آج کل ہمارے ملک پاکستان میں محتسب اعلیٰ کا محکمہ قائم ہے اور اس کی افادیت کے پیش

نظر پاکستان کے تمام صوبوں میں صوبائی محکمہ احتساب قائم کئے جانے کے امکانات پیدا ہوئے ہیں۔

ہمارا آج کا محتسب اعلیٰ اس قدر با اختیار نہیں جتنا با اختیار اورنگ زیب کا محتسب تھا۔ اورنگ زیب کے محتسب اعلیٰ ملا وجیہہ تھے جو گوران کے رہنے والے تھے اور تقویٰ اور طہارت میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ ملا صاحب کو ایک ہزار سواروں کی فوجی طاقت بھی دی گئی تھی۔ ان کے ۱۲ منصب دار تھے اور تمام محکموں کو ایک فرمان کے ذریعہ ہدایات دی گئی تھیں کہ وہ محتسب کے کام میں تعاون کریں۔

محتسب کو اجازت دی گئی تھی کہ اگر شرپسند' بد معاش اور جواری نشئی سرکشی کریں تو یہ سوار ان کا سر کچل دیں۔ آج ہمارے محتسب کو یہ اختیار نہیں۔ وہ سزا بھی تجویز نہیں کر سکتا صرف سفارش کر سکتا ہے کہ اس غلطی یا زیادتی کا ازالہ کیا جائے۔ مگر اورنگ زیب کا محتسب با اختیار تھا۔ اسے حکم دینے اور اس پر عمل کرانے کا حق تھا۔ اس دائرہ کار صرف آگرہ یا دہلی تک محدود نہ تھا بلکہ پوری مغل سلطنت میں اس کا حکم چلتا تھا۔

مگر کیا کیا جائے کہ اعتراض کرنے والے اس پر بھی اعتراض کرتے ہیں۔

دراصل اس قسم کے اعتراض کرنے والوں میں جادو ناتھ سرکار جیسے متعصب ہندو مورخ پیش پیش ہیں۔ جادو ناتھ سرکار کے حلقہ میں' دتا اور موجمدار وغیرہ بھی شامل ہیں۔ ان لوگوں نے ہر اس مسلمان حکمران اور فاتح پر اعتراضات کئے ہیں جنہوں نے اکبراعظم کی طرح ہندوؤں کو سینے سے نہیں لگایا اور ان کی محبت میں آدھا ہندو' کیوں نہ ہو گیا۔ چنانچہ انہیں اس بات پر سخت اعتراض ہے کہ اورنگ زیب نے شراب' بھنگ' جوا اور فاحشہ عورتوں کی خرید و فروخت پر کیوں پابندی لگائی تھی۔

اس طرح اورنگ زیب نے محکمہ برید (ڈاک) میں قابل قدر ترمیم اور اضافہ کیا تھا۔

اللہ امیر معاویہ پر رحم کرے۔ وہ اسلام میں پہلے شخص تھے جنہوں نے ڈاک کا سلسلہ شروع کیا۔ جناب امیر معاویہ کا نام آیا ہے تو ایک بات جملہ معترضہ کے طور پر عرض کرتا چلوں۔ بعض لوگ مجھے کافر اور بے دین کے نام سے نوازتے ہیں اور جناب معاویہ پر بعض کتابوں کے مطالعہ پر زور دیتے ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ عرض ہے کہ کبر اور غرور صرف خدائے واحد کو سجتا ہے۔ بندہ

ناچیز کی کیا مجال کہ وہ غرور کر سکے اور بڑا بول بولے۔ مگر میں اپنے معترض قارئین کو یہ ضرور بتاؤں گا کہ مجھے اس بات پر ضرور فخر ہے کہ میرے مطالعہ سے ایک لاکھ سے کہیں زیادہ کتابیں گزر چکی ہیں۔ میں خود اس وقت تک پچاس ہزار سے زیادہ صفحات بہ شکل مضامین' کہانیاں اور ناول تحریر کر چکا ہوں جو تمام کے تمام شائع ہو چکے ہیں۔ اس وقت اڑسٹھ (۶۸) کتابوں کا مصنف ہوں اور مزید تیرہ کتابیں آئندہ دو ماہ میں شائع ہونے کی امید ہے۔

مگر میں خود کو تاریخ کا صرف ایک ادنیٰ طالب علم کہتا اور سمجھتا ہوں۔ میں سنی العقیدہ ہوں۔ میں نے امیر معاویہ کی خوبیوں سے کبھی انکار نہیں کیا۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ سوائے ذات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اور دنیا کا کوئی شخص "سرو پا خوبی" اور مکمل انسان نہیں تھا۔ سوائے ذات محمد کے ہر شخص میں خوبیوں کے ساتھ عیب موجود تھے اور تاریخ کے ایک طالب علم کو یہ کسی طرح زیبٔ نہیں دیتا کہ وہ انسان کی صرف خوبیاں بیان کرے اور اس کی غلطیوں کو نظرانداز کر جائے۔

اس جملہ معترضہ کے بعد میں ایک بار پھر اصل موضوع پر آتا ہوں۔

اللہ امیر معاویہ پر رحم کرے کہ وہ اسلام میں پہلے شخص تھے جنہوں نے ڈاک کا سلسلہ شروع کیا۔ مغل جب ہندوستان میں آئے تو انہوں نے اخبار رسانی اور ڈاک لانے لے جانے کا وہی ترقی یافتہ انداز اختیار کیا جسے بنو امیہ نے بنو عباس کو ورثہ میں عطا کیا اور بنو عباس نے آگے سلجوقیوں آل بویہ پھر ترکوں اور مغلوں کو بخشا۔

بنو امیہ نے مسلمانوں کو صرف ڈاک کا سلسلہ ہی نہیں بخشا بلکہ جناب امیر معاویہ نے ہی پہلی بار اسلام میں یوں طاقت کی کمی کو محسوس کیا اور کشتی سازی اور جہاز سازی کی ابتداء کی۔ وہ بنو امیہ ہی تھے جن کے چار جرنل محمد بن قاسم' قتیبہ بن مسلم' طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر نے اس دور کے مشرق اور مغرب کے قلابے ملا دیئے۔ وہ عقبہ بن نافع اموی تھا جس نے پورا شمالی افریقہ فتح کرنے کے بعد اپنا گھوڑا سمندر میں ڈال کر کہا تھا۔

"اے اللہ۔ اگر سمندر درمیان میں حائل نہ ہوتا تو میں تیرا پیغام دنیا کے اس کونے تک پہنچاتا۔۔۔"

اور موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد بھی اموی ہی تھے جنہوں نے مغرب اقصیٰ فتح کیا

پھر طارق بن زیاد جبرالٹر پار کے اسپین (ہسپانیہ۔ اندلس) کے ساحل پر اترا تھا اور جس نے کشتیوں کو آگ لگوا دی تھی تاکہ کوئی مسلمان سوائے فتح کے واپسی کا تصور بھی نہ کر سکے۔

اور وہ قتیبہ بن مسلم بھی بنو امیہ کے گورنر بلاد مشرق حجاج بن یوسف کا ایک سردار تھا جس نے چین کی سرحد میں داخل ہو کر شہنشاہ چین سے خراج طلب کیا تھا اور اس گورنر کے بھتیجے اور داماد محمد بن قاسم نے پہلی بار بھارت کی سرزمین پر مسلم پرچم لہرایا اور ملتان تک کا علاقہ فتح کر کے بنو امیہ کے خلیفہ کا خطبہ پڑھوایا تھا۔

بنو امیہ کی یہ بھی ایک برکت تھی جب ایشیا میں انہوں نے بنو عباس کے ہاتھوں شکست کھائی تو ان کا ایک شہزادہ عبد الرحمٰن افریقہ ہوتا ہوا اسپین (اندلس) پہنچا اور وہاں اموی حکومت کو اس قدر مضبوط کیا کہ اموی وہاں تقریباً" چھ سو سال تک حاکم رہے اور یورپ کو علم و ادب کا درس دیتے رہے۔

بہرحال برید (ڈاک) کی ایجاد کا سہرا امیر معاویہ کے سر ہے اور اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اورنگ زیب سے پہلے یہ سلسلہ پوری مملکت میں قائم تھا۔ مرکز سے صوبوں کے صدر مقامات تک ڈاک ہر ہفتہ آتی جاتی تھی مگر ایسا کوئی مسلسل رشتہ قائم نہیں تھا جو کہ مرکز کی خبریں مملکت کے ہر حصہ میں چند دن کے اندر پہنچانے کا انتظام کرتا۔

اورنگ زیب نے تخت سنبھالتے ہی اس طرف توجہ دی اور حیدر آباد دکن سے صرف چھ دن میں شاہی خطوط دہلی تک پہنچنے لگے۔ چار چار اور پانچ پانچ کوس پر حیدر آباد دکن سے دہلی آنے والی سڑک پر ڈاک چوکیاں قائم کیں۔ ڈاک کے گھوڑے ان چوکیوں پر ہروقت تیار رہتے۔ گھوڑوں کے گلے میں گھنٹیاں بندھی ہوتی تھیں۔ حیدر آباد دکن سے جو ڈاکیہ روانہ ہوتا وہ چھ کوس کے فاصلہ پر گھوڑا بدل لیتا۔ جہاں ڈاکیہ خود تھک جاتا۔ وہاں دوسرا ڈاکیہ اس کی جگہ لے لیتا۔ مملکت میں سرکاری اور غیر سرکاری چٹھیوں کی تقسیم اس طرح ہوتی تھی۔ جس طرح بنو امیہ اور بنو عباس کے زمانے میں اس محکمہ کے تین شعبے تھے اسی طرح اورنگ زیب کے زمانہ میں بھی اس کے تین ہی شعبے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اورنگ زیب نے ہر ضلع اور صدر مقام کو ایک یونٹ کی حیثیت دے دی تھی اس طرح صوبہ دہلی کے تمام اضلاع اور اہم شہروں اور دیہات کے وقائع نویس' ہرکارے اور خفیہ نویس ایک یونٹ شمار ہوتے تھے۔

اورنگ زیب نے اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ جو سلوک کیا اس میں دو رائے ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے اورنگ زیب نے باپ کی زندگی میں تخت نشین ہو کر اسلامی اصول کی خلاف ورزی کی نیز یہ کہ اس کا بھائیوں کے ساتھ سلوک برادران یوسف جیسا تھا مگر دوسرا گروہ اس کا طرفدار ہے۔ اس گروہ کے خیال کے مطابق اورنگ زیب نے جو کچھ کیا وہ احیاء دین کے لئے کیا۔ اگر وہ باپ یا دادا کے سپرد حکومت کر دیتا تو اسلامی اصولوں کی بے حرمتی ہو رہی تھی۔ مثلاً" ہندو عورتوں کا شاہی محلات میں داخل ہونا اور ہندو تہذیب و فلسفہ کا پرچار وغیرہ۔ تو بھارت سے (حاکم بدہن) اسلام ختم ہو جاتا اور جس طرح بھارت میں باہر سے آنے والے تمام قومیں اپنی قومیت بھول کر ہندو ہو گئی تھیں اسی طرح مسلمان بھی ہندو بن جاتے۔

دونوں گروہوں کے اپنے اپنے دلائل ہیں اور ان کے دلائل میں وزن بھی ہے اس طرح ہم اس مسئلہ سے قطع نظر کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

اورنگ زیب نے محکمہ ڈاک ہی میں نہیں بلکہ فوج' تنخواہ' توپ خانہ' بحری بیڑہ اور فوجدار اور صوبیدار کے حقوق و فرائض کا بھی معقول انتظام کیا تھا۔ آج کل ہمارا جو نظام چل رہا ہے۔ یہ تقریباً" بالکل ویسا ہی ہے جیسا اورنگ زیب نے اپنے وقت میں رائج کیا تھا مگر آج کے اور اورنگ زیب کے نظام میں سب سے بڑا بنیادی فرق یہ ہے کہ کوئی عامل' کوئی پٹواری یا مقدم اسلام کے قوانین میں سرمو انحراف نہ کر سکتا تھا مگر آج کل تو لوگوں نے اسلام کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ مفاد پرستی اور خود غرضی کا دور دورہ ہے۔ خدا جانے پاکستان کو ان برائیوں سے کب نجات ملے گی اور دین اسلام کا کب احیاء ہو گا۔

انگریز اور ہندو ایک طرف تو اورنگ زیب پر باپ اور بھائیوں کے ساتھ ظلم کا رونا رو رہا ہے اور دوسری طرف متعصب ہندو تاریخ نویس سر جادو ناتھ سرکار نے یہ الزام بھی لگایا:

"اورنگ زیب نے ہندوؤں کے ساتھ انتہائی مظالم کئے اور انہیں ذمیوں کی حیثیت دے کر ایک قسم کا غلام بنا دیا۔"

اس ہندو مورخ نے مسلمانوں کی پرانی تاریخ پڑھنے کی زحمت گوارہ نہیں کی اور کہہ دیا کہ اورنگ زیب نے ہندوؤں پر خراج اور جزیہ لگا کر انہیں ایک طرح کا غلام بنا دیا۔

حالانکہ اسلام دنیا کا پہلا دین ہے جس نے اپنی رعایا کے ساتھ اس قدر نرم سلوک کیا کہ دوسرے علاقوں کے لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر اسلامی علاقوں میں منتقل ہوتے گئے تاکہ زمین کے مالکوں کے ظلم و ستم سے نجات پا سکیں۔

جزیہ ان ہندوؤں سے لیا جاتا تھا جو کاشتکار نہیں تھے اور خراج ان ہندوؤں سے وصول کیا جاتا تھا جو زمین پر کاشتکاری کرتے تھے۔ مسلم حکمرانوں اور دوسرے حکمرانوں میں سب سے زیادہ نمایاں فرق یہ ہے کہ مسلمانوں نے جب بھی کوئی علاقہ فتح کیا تو وہاں کی زمینوں پر قبضہ نہیں کیا بلکہ زمین ان کے مالکان کے پاس رہنے دی اور وہ پہلے ہی کی طرح زمینوں کے مالک رہے ان سے ایک مقرر ٹیکس یا خراج وصول کیا جاتا تھا۔

اس جزیہ اور ٹیکس کے بدلہ میں مسلمان حکمران اپنی رعایا کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے علاوہ انہیں باہر کے حملہ آوروں سے محفوظ رکھنے کا ذمہ دار بھی ہوتا تھا۔ اگر کوئی باہر سے حملہ کرتا تو رعایا کے بجائے مسلم حکمران اپنی فوجوں سے اس کا مقابلہ کر کے اسے مار بھگاتا تھا۔ اگر وہ کسی وقت اپنے کسی علاقہ کی حفاظت کرنے کے قابل نہ رہتا تو اس علاقہ کی رعایا سے خراج یا جزیہ وصول نہ کرتا اور اگر پہلے وصول کر لیا ہو تو اسے فوراً" واپس کر دیتا۔

اسلامی تاریخ میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ جب مسلمان حکمران نے اپنا کوئی علاقہ چھوڑا تو اس نے جزیہ کی وصول کی ہوئی رقم فوراً" رعایا کو واپس کر دی۔ اس کے باوجود جادو ناتھ سرکار مسلمانوں پر الزام لگاتا ہے کہ وہ جزیہ لے کر رعایا کو غلام بنا لیتے تھے۔

اس متعصب ہندو مورخ نے مسلمانوں پر الزام لگانے سے پہلے کم از کم اپنی قوم (ہندو قوم) کے بارے میں تو کچھ سوچا ہوتا۔ آیئے ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ ہندو قوم خود اپنے قومی بھائیوں کے ساتھ کس قدر ذلیل اور ظالمانہ سلوک کرتی ہے۔ ہندو قوم چار ذاتوں میں تقسیم ہے۔

(۱) برہمن

(۲) راجپوت

(۳) ویش

(۴) شودر

ان ذاتوں میں برہمن کی ذات سب سے اونچی ذات ہے۔ یہ لوگ ہندو مذہب کے ٹھیکیدار ہیں۔ تمام مذہبی مقامات اور مذہبی کام ان کے سپرد ہیں۔ لاکھوں کروڑوں روپیوں کی جائدادیں اور زر سب ان کے مندروں اور دھرم شالوں کے لئے وقف ہیں۔ برہمن دنیا کا کوئی کام نہیں کرتے۔ صرف مندروں اور دھرم شالوں میں پوجا پاٹ کرتے ہیں۔ ان دھرم شالوں میں سینکڑوں اور ہزاروں کنواری ہندو لڑکیاں رہتی ہیں جو دیو داسیاں کہلاتی ہیں بالکل اسی طرح جیسے انگریزوں کے گرجا گھروں میں کنواری ننیں رہتی ہیں۔

کہنے کو تو یہ کنواری لڑکیاں بتوں اور دیوتاؤں کی خدمت کرتی ہیں مگر اصل میں وہ وہاں کے پنڈتوں اور پانڈوں کی خدمت کرتی ہیں اور وہاں ایسی عیاشیاں ہوتی ہیں جن کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چونکہ یہ داسیاں ہمیشہ کے لئے دھرم شالوں اور مندروں کو دے دی جاتی ہیں اس لئے ان کے ماں باپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں رہتا اور وہ صرف پنڈتوں کے رحم و کرم پر ہوتی ہیں۔ ان کے بچے دھرم شالوں کے اندر ہی گرائے جاتے ہیں اگر کوئی دیو داسی کسی پنڈت کی مخالفت کرے تو اسے مار کے وہیں دفن کر دیا جاتا ہے اور ان کے بارے میں کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوتی۔

ہندوؤں کی پہلی ذات یعنی برہمنوں کا تو یہ حال ہے۔ اب ان کی دوسری ذات آتی ہے جسے راجپوت کہا جاتا ہے۔ یہ قوم ملک کے دفاع کی ذمہ وار ہوتی ہے۔ راجہ مہاراجے اور فوج عام طور سے اسی قوم پر مشتمل ہوتی ہے۔ راجہ اور حکمران اگرچہ راجپوت ذات کا ہوتا ہے مگر اسے مندروں اور دھرم شالوں پر کوئی اختیار نہیں ہوتا بلکہ وہ برہمنوں (پنڈتوں) کو ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ برہمنوں کی مخالفت ہندو مذہب کی مخالفت ہوتی ہے۔

ہندوؤں کی تیسری ذات "ویش" ہوتی ہے۔ یہ لوگ بنئے اور تاجر ہوتے ہیں یہ تجارت پیشہ لوگ تیسرے نمبر پر آتے ہیں۔ برہمنوں اور راجپوتوں سے یہ کمتر درجہ کے ہوتے ہیں اور عام طور سے دکانداری اور تجارت سے منسلک رہتے ہیں۔ بڑے بڑے سیٹھ اور مہاجن اسی ذات کے ہوتے ہیں۔

ہندوؤں کی چوتھی ذات اس قوم کی سب سے زیادہ کمتر اور ذلیل ذات ہے جسے شودر۔ اچھوت اور کم ذات کہا جاتا ہے۔ شودروں کا کام اپنے اوپر کی تینوں ذاتوں برہمن۔

راجپوت اور ویش کی خدمت کرنا ہوتا ہے۔ یہ لوگ ہندوؤں کے کسی مندر میں داخل نہیں ہو سکتے ہندوؤں کے کسی برتن کو نہیں چھو سکتے۔ اگر مندر میں داخل ہونے کی کوشش کریں تو قتل کر دینے کا حکم ہے۔ اسی طرح ان کا کسی برتن کو ہاتھ لگ جانے سے وہ برتن گندہ اور ناپاک ہو جاتا ہے۔

ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں درج ہے کہ شودروں کو تعلیم حاصل کرنے کا حق نہیں اگر وہ تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کریں تو ان کے کانوں میں سیسہ پگھلا کے ڈال دیا جائے۔ ان غریب شودروں سے اس قدر پرہیز کیا جاتا ہے کہ اگر ان کا ہاتھ یا کپڑا دھوکے سے بھی اونچی ذات کے ہندو سے چھو جائے تو وہ ناپاک ہو جاتا ہے۔ ان شودروں کی آبادی ہندو آبادی کی مجموعی تعداد کی ایک تہائی سے بھی زیادہ ہے۔

آخر جادو ناتھ سرکار کس منہ سے الزام لگاتا ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے جزیہ لگا کر ہندوؤں کو اپنا غلام بنا لیا۔ جبکہ اسلام میں غلام کے مالک کے برابر حقوق ہوتے ہیں۔ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ جادو ناتھ سرکار کو اسلامی تعلیمات کا علم نہیں تھا اس لئے انہوں نے جزیہ اور خراج کو ایک ظالمانہ فعل قرار دیا اور ذمی کو غلام کا درجہ دیا۔

جناب عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ذمیوں کے ساتھ تو ایسا حسن سلوک تھا کہ ایک بار ان پر ایک ذمی نے دس ہزار درہم کا دعویٰ کیا اور حضرت فاروق نے اس دعویٰ کو تسلیم کر لیا اور اس سے کوئی جرح نہ کی۔

حضرت عمرؓ ہی کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ آپ نے ایک ذمی کو بھیک مانگتے دیکھا تو اس سے سوال کیا۔

"تم بھیک کیوں مانگ رہے ہو؟"

اس نے جواب دیا۔

"میرے پاس نہ کھانے کو ہے اور نہ جزیہ ادا کرنے کے لئے پیسے ہیں۔"

حضرت عمر نے اسی وقت فرمان جاری کیا کہ ذمیوں سے جزیہ نہ لیا جائے اور ان کی تنخواہ مقرر کر کے انہیں بیت المال سے ادائیگی کی جایا کرے۔"

حضرت عمر بن عبد العزیز کے زمانہ میں تو ذمی اس قدر شیر ہو گئے تھے کہ ایک ذمی نے خلیفہ سے مطالبہ کیا کہ اس کو وہ کنیہ (عبادت گاہ) واپس کیا جائے جسے توڑ کر خلیفہ

ولید بن عبد الملک نے مسجد بنوا لی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مسجد توڑ دی جائے تاکہ وہاں پر دوبارہ کنیہ بنایا جا سکے۔

دراصل حضرت عمر بن عبد العزیز نے فرمان جاری کر دیا تھا کہ جس سے کوئی چیز چھینی گئی ہو وہ اسے واپس کی جائے۔ چنانچہ اس فرمان کی روشنی نے ذمی کو یہ حوصلہ دیا کہ اس نے خلیفہ سے کہا۔

"خلیفہ محترم۔ خلیفہ ولید بن عبد الملک نے ہمارا کنیہ یوحنا توڑ کے اس کی جگہ مسجد بنوا دی تھی۔ آپ براہ کرم اپنی مسجد ہٹا لیجئے اور ہمارا کنیہ یوحنا اس جگہ تعمیر کرا دیجئے۔"

یہ مطالبہ اگرچہ نامعقول تھا مگر عمر بن عبد العزیز نے اس کا مطالبہ منظور کر لیا پر عیسائیوں نے اسے خود سمجھایا کہ وہ مسجد کو تڑوانے کے بجائے جن دوسرے گرجوں پر لوگوں نے قبضہ جما لیا ہے خلیفہ سے ان کا سودا کر کے واپس لے لے چنانچہ اس ذمی نے اس کے بجائے بہت سے گرجے واگزار کرا لئے۔

اگر ہندو تعصب کی عینک اتار کے دیکھیں تو انہیں معلوم ہو گا کہ ہندوستان کے بادشاہوں میں اورنگ زیب پہلا بادشاہ تھا جس نے رعایا کے حقوق کی صحیح نگرانی کی۔ ان پر لگے محصولوں کو معاف کر کے کروڑوں روپے سالانہ کا نقصان اٹھایا۔

ہندوستان آنے والے ایک سیاح برنیئر کا بیان ہے :

"وہ دن میں دو یا تین مرتبہ اپنے دیوان عام میں مسکراتا ہوا آتا ہے تاکہ رعایا کی شکایات سنے اور ان کی تکلیف دور کرے۔ رعایا کے افراد اس کے پاس بغیر کسی رکاوٹ کے پہنچتے ہیں اور چونکہ وہ ان کی باتیں بہت توجہ سے سنتا ہے اس لئے لوگ اپنی شکائتیں اور اصل بات بغیر جھجک اور ڈر کے اس کے سامنے بیان کر دیتے ہیں اگر کوئی اس کے سامنے شور مچاتا یا بے ادبی کرتا تو وہ ناخوش نہ ہوتا اور نہ اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار پیدا ہوتے تھے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ شکایت کرنے والوں کے دل دکھے ہوئے ہوتے ہیں۔"

جادو ناتھ سرکار نے سیوا جی کے سفر آگرہ کے حالات لکھے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جب سیوا جی کنور رام سنگھ کے ساتھ بادشاہ کے سامنے پیش ہوا اور نذر گزاری تو بادشاہ نے

اسے دیکھ کر کہا۔

"تشریف لائیے سیوا جی۔ راجہ"

سلام کے بعد سیوا جی کو جو اتنا بڑا مرہٹہ تھا۔ درجہ سوم کے امراء میں جگہ دے کر بادشاہ نے سیوا جی کی دل شکنی کی ہے۔ یہ اعتراض بھی جادو ناتھ سرکار کا ہے۔ اس کے جواب میں درجہ سوم کے امراء کے نام سنئے اور اندازہ لگایئے کہ کیا سیوا جی ان سے زیادہ بڑا سردار تھا۔ ان امراء میں مندرجہ ذیل سردار شامل ہیں :

(۱) شاہنواز خاں : اس امیر کی دو بیٹیاں ایک اورنگ زیب اور دوسری مراد سے بیاہی ہوئی تھی۔

(۲) امیر الامراء شائستہ خاں

(۳) امیر الامراء آصف خاں

(۴) اسلام خاں

(۵) اعظم خاں کوکہ

(۶) خلیل اللہ خاں

(۷) فاضل خاں

(۸) خاں زماں بہادر مرزا امان اللہ

(۹) عالم خاں اخلاص خاں

سیوا جی آگرہ آیا پر جس طرح بھاگ گیا اس کا مختصر ذکر یہ ہے کہ جب اس پر سے پہرے ہٹ گئے اور اسے باہر آنے جانے کی اجازت مل گئی تو وہ آگرہ سے بھیس بدل کر نکل بھاگا۔ اس لئے کہ اس جنگلی اور ڈاکو کے لئے مہذب اور شریفانہ زندگی گزارنا سخت دشوار تھا۔ ہمارے خیال میں سیوا جی بادشاہی دربار کی شان و شوکت دیکھ کر بدحواس ہو گیا اور اس حد تک مرعوب ہوا کہ یہاں سے بھاگنے کے سوا اور کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آ سکی۔

بہرحال اس کے ذاتی تاثرات خواہ کچھ بھی تھے۔ وہ آگرہ میں نہ رک سکا اور تبدیل لباس کر کے اور داڑھی مونچھ منڈا کر آگرہ سے متھرا کی طرف بھاگا۔ متھرا بنارس' بہار' پٹنہ اور چاندہ ہوتا ہوا بہ ہزار دشواری قطب الملک کے ملک میں داخل ہوا۔ پھر حیدر آباد

اور قطب ملک سے ملا۔

اس وقت قطب الملک عبد اللہ شاہ تھا۔ اس نے سیوا جی کی خوب خاطر مدارت کی۔

اس خاطر مدارت کی وجہ یہ تھی کہ قطب شاہی کئی قلعوں پر عادل شاہیوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ عبد اللہ شاہ کو گمان تھا کہ شیوا جی قلعہ گری میں مہارت رکھتا ہے۔ سیوا جی نے بھی اسے یقین دلایا اور قسمیں کھائیں کہ اگر تھوڑی سی فوج اور مصالح قلعہ گری مل جائے تو وہ یہ قلعے عادل شاہیوں سے لے کر قطب شاہ کو دے دے گا بلکہ اس سپاہ کے سپرد کرے گا جو اس کے ساتھ جائیں گے۔

اس کے علاوہ سیوا جی نے کہا تھا کہ جو قلعے اس سے اورنگ زیب نے چھین لئے ہیں وہ اسے فوج کی مدد سے حاصل کر کے اپنے قبضہ میں کرے گا اور قطب شاہ کا ہمیشہ احسانمند رہے گا۔

عبد اللہ شاہ، سیوا جی کے فریب میں آگیا۔ اس نے ایک معقول فوج اس کے ساتھ کر دی اس کے علاوہ قلعہ گری کے لوازمات بھی اسے مہیا کر دیئے۔ ان چنداں کی مدد سے سیوا جی نے اپنے خاص ہنر سے عادل شاہیوں سے بارہ قلعہ چھین لئے اور وہ قلعے بھی حاصل کر لئے جو اس سے مغلوں نے چھینے تھے۔ جب اس کی پوری طرح بحالی ہو گئی تو اس نے قطب شاہی فوج اور ایک قلعہ دے کر رخصت کر دیا۔

یہ وہ سیوا جی تھا جس نے ہزاروں وعدوں اور قسموں سے قطب شاہ سے فوج حاصل کی تھی اور مطلب نکل جانے کے بعد اس کی طرف سے آنکھیں پھیر لی تھیں۔ یہ ہے وہ سیوا جی جسے جادو ناتھ سرکار اپنا ہیرو کہتا ہے۔ سیوا جی نے سورت کے ہندو مسلمان اور نہتے لوگوں پر حملہ کر کے ان کے گھر بار لوٹ لئے۔ انہیں ذبح کر دیا اور گھروں میں آگ لگا دی۔ آدھا شہر راکھ کا ڈھیر بن گیا۔

طاقت حاصل ہوتے ہی سیوا جی نے نئے قلعے بنانا شروع کر دیئے۔ بڑی تلاش کے بعد اس نے کوہ راہ ریری کو اپنا مرکز بنایا۔ یہ پہاڑ آسمان سے باتیں کرتا تھا۔ اس پہاڑ کے راستے بہت دشوار گزار تھے اور علاقہ میں پانچ ماہ تک مسلسل بارش ہوتی تھی۔

اس چوٹی پر سیوا جی نے قلعہ تعمیر کرایا اور نیچے سے اوپر جانے والے تمام راستے مسدود کرا دیئے پھر اعلان کیا جو شخص اس چوٹی پر پہنچ جائے گا اسے وہ سونے کا ایک توڑا

انعام دے گا۔ ایک باہمت آدمی نے سیوا جی کا چیلنج منظور کر لیا اور بڑی کوشش کے بعد پہاڑ کی چوٹی پر جہاں قلعہ تھا، پہنچ گیا۔

اس ظالم لٹیرے نے اسے انعام تو دیا مگر ساتھ ہی اس کے دونوں پیر کٹوا دیئے پھر اس نے اس راستے کو بالکل توڑ پھوڑ دیا جس پر چل کر وہ شخص قلعہ تک پہنچا تھا۔

ہم نے یہ واقعہ اس وجہ سے لکھا ہے کہ سیوا جی واقعی پہاڑی چوٹی تھا۔ اس نے لوگوں سے سنا تھا کہ بڑے بڑے بادشاہ خاص کر مغل بادشاہ اور شہنشاہ لوگوں کی بہادری اور شجاعت کا امتحان لیتے ہیں اور ان کی کامیابی پر انہیں انعام و اکرام سے نوازتے ہیں۔ اس خیال کے پیش نظر اس نے بھی بادشاہوں کی طرح اعلان کر دیا کہ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچنے والے کو سونے کا توڑا عطا کرے گا۔ غالباً اس کا یہ خیال تھا کہ کوئی بہادر اس کے بنائے ہوئے قلعہ کی چوٹی پر نہیں پہنچ سکے گا مگر ایک شخص ہمت کر کے وہاں پہنچ گیا۔ مگر اس بہادر کو اس بزدل پہاڑی چوہے نے کیا انعام دیا کہ اس کی دونوں ٹانگیں کٹوا دیں۔

سیوا جی کی اس حرکت سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے آگرہ سے فرار ہونے کے بعد دکن میں ایسی خطرناک جگہ قلعہ تعمیر کیا تھا جہاں تک انسان کا پہنچنا تقریباً ناممکن تھا۔ چنانچہ اس محفوظ قلعہ میں پناہ لینے کے بعد سیوا جی نے ادھر ادھر ہاتھ مارنا شروع کئے۔

اس علاقہ میں بیجا پوریوں کے کئی قلعے تھے۔ سیوا جی نے ان پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ یہاں تک کہ وہ راج پوری تک پہنچ گیا جو اس ضلع کا صدر مقام تھا اور فتح خاں فوجدار کا مسکن بھی تھا۔ فتح خاں راج پوری چھوڑ کر دریائے شور کے ایک جزیرے میں پناہ گزین ہو گیا۔

فتح خاں، سیوا جی سے اس قدر مرعوب تھا کہ وہ یہ محفوظ جگہ بھی سیوا جی کے سپرد کر دینے پر آمادہ ہو گیا اور اس کے صلہ اس نے سیوا جی سے صرف اپنی جاں بخشی کی درخواست کی۔ اس پہ گفتگو چل رہی تھی کہ فتح خاں نے تین حبشی خدام سیدی سنبل، یاقوت اور سیدی خیریت اپنے مالک کے خلاف ہو گئے اور ایک دن انہوں نے فتح خاں کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔

یہ دونوں خدام وفادار اور دانا تھے۔ انہوں نے ایک طرف تو فتح خاں کے علاقہ کا انتظام سنبھالا دوسری طرف شاہ بیجا پور کو سیوا جی کی حرکتوں سے آگاہ کیا۔ اس کے علاوہ

انہوں نے دکن کے صوبیدار خان جہانی سے بھی مدد کی درخواست کی۔ خان جہاں نے نہ صرف ان کی مدد کی بلکہ انہیں نقد روپیہ اور خلعت فاخرہ سے بھی نوازا۔ صوبیدار کی ہمت افزائی سے تینوں خدام نے سیوا جی سے جنگ شروع کر دی اور جس طرح وہ دوسروں کو پریشان کرتا تھا اسی طرح ان خدام نے اس کی ناک میں دم کر دیا۔

سیوا جی اور ان خدام میں جتنی بحری لڑائیاں ہوئیں ان میں خدام کا پلہ بھاری رہا۔ یہاں تک کہ خدام نے اپنی بہادری اور شجاعت کے زور پر راج پوری کا قلعہ سیوا جی سے چھین لیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدی خدام قلعہ گری کے فن میں سیوا جی سے بھی زیادہ ماہر تھے۔ راج پوری کے قلعہ کی واپسی کے بعد سیدی خدام اور خاص کر سیدی یاقوت کی شہرت سارے علاقے میں پھیل گئی اور اس نے چند دن کے اندر اندر سیوا جی سے مزید چھ اور قلعے چھین لئے۔

سیدی یاقوت کا خوف اس قدر پھیل گیا کہ سیوا جی اس کا نام سن کر ہی دہل جاتا تھا اور وہ ڈر کے مارے اپنے مسکن سے بھی نہ نکلتا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ جادو ناتھ سرکار یا کسی اور ہندو یا انگریز مورخ نے نہ تو خان خاناں کی اس کارگزاری کا ذکر کیا ہے اور نہ سیدی حبشیوں کے متعلق ایک لفظ لکھا ہے حالانکہ خان جہاں بہادر کی کامیابی میں ان سیدیوں کا برار کا حصہ تھا۔ ایک طرف یعنی سمندر کے ذریعے سیدیوں نے سیوا جی کو دبایا دوسری طرف سے خان جہاں بڑے اور اس سرکش اور دھوکہ باز کا سر کچل دیا۔

خان جہاں دکن ۱۰۸۸ ہجری تک رہے۔ ان کے عہدیداروں کا زمانہ تقریباً" ساڑھے چار سال ہے۔ اس پورے عرصہ سیوا جی نے قطعاً" سر نہیں اٹھایا۔ اس کی حال اس قدر خراب و خستہ تھی کہ اس کا بیٹا سنبھا اس کا ساتھ چھوڑ کے خان جہاں کی خدمت میں آگیا تھا اور جب تک خان جہاں دکن میں رہے سنبھا ان کی خدمت میں رہا۔

خان جہاں کے زیر عتاب آنے کے بعد جب انہیں دارالسلطنت واپس جانا پڑا تو سیوا جی نے پھر ہاتھ پیر نکالے اور شاہی علاقوں پر چھاپے مارے۔ جامقہ کا علاقہ سب سے پہلا تختہ مشق بنا اور سیوا بہادر نے جو ہندو قوم کا ہیرو تھا' جامقہ کی آبادیوں کو ویرانوں میں بدل دیا۔

آخر جلوس کے اکیسویں سال سیوا جی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ سیوا جی کی

صورت سے اورنگ زیب کا ایک بڑا دشمن اس کے راستے سے ہٹ گیا اور مغل اور دکن ریاستوں نے اس کی لوٹ مار اور خونریزی سے وقتی طور پر نجات حاصل کر لی۔

سیوا جی کے بعد اس کے بیٹے سنبھا جی نے اس کی جگہ سنبھالی۔ لوگوں نے جب اس کے ظلم و ستم کو دیکھا تو وہ سیوا جی کے ظلم کو بھول گئے۔ سنبھا جی کا سوتیلا بھائی راجہ رام اس وقت زندہ تھا مگر اقتدار اور باپ کی گدی اسے نہ مل سکی اور اسے جان بچا کر بھاگنا پڑا۔

سنبھا جی کو جب یقین ہو گیا کہ اس کی گدی مضبوط ہو گئی ہے تو اس نے اپنے باپ کی منکوحہ بیوی یعنی راجہ رام کی ماں کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا اور اس پر اس قدر ظلم کیا کہ وہ سسک سسک کر مر گئی۔ اس کے ساتھ سنبھا نے راجہ رام کے ہمدرد سواروں کو بھی ایک ایک کر کے مار ڈالا اور ان بڑے مرہٹوں کو بھی عذاب میں مبتلا کر دیا جنہوں نے راجہ رام کی تخت نشینی کی کوششوں میں حصہ لیا تھا۔

مرہٹے اس وجہ سے اور زیادہ شیر ہو گئے تھے ایک تو راجپوت' اورنگ زیب کے خلاف ہو گئے تھے دوسرے یہ کہ شہزادہ اکبر' باپ سے باغی ہو کر سنبھا کی پناہ میں آگیا تھا۔

مرہٹے خان جہاں سے بہت ڈرتے تھے۔ جب تک وہ دکن میں رہا اس نے مرہٹوں کی ناک میں نکیل ڈالے رکھی مگر اسے دربار میں بلا لیا گیا تھا اس لئے مرہٹے پھر کھل پڑے تھے۔ اورنگ زیب راجپوتوں اور شہزادہ اکبر کی وجہ سے مرہٹوں پر توجہ نہ دے سکا مگر جب ان کی زیادتیاں حد سے بڑھ گئیں تو اورنگ زیب نے خان جہاں کو ایک بار پھر دکن بھیج دیا اس نے دکن پہنچتے ہی مرہٹوں کی ناک میں دم کر دیا۔

اورنگ زیب نے خان جہاں کو دکن اس وجہ سے بھیجا تھا کہ سنبھا نے اپنے بیس ہزار مرہٹہ سواروں کے ساتھ برہان پور کی سترہ بیرونی بستیوں کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا۔ یہ بستیاں برہان پور سے تین میل کے فاصلہ پر تھیں اور وہاں صرف ۲۵۰ محافظ سپاہی رہتے تھے۔ سنبھا نے مرہٹہ لشکر کے ساتھ ان بستیوں پر شب خوں مارا اور تمام رات اور دن چڑھے تک لوٹ مار اور قتل و غارت کرتا رہا۔ کہتے ہیں اس کے بازار لوٹ لئے۔ دکانوں کے تالے توڑ کے سامان لے گیا۔ گھروں میں گھس کے زیورات' کپڑا اور قیمتی سامان غرض کہ گھر میں جو کچھ تھا وہ سب لوٹ لیا۔

ان بستیوں میں ایسے غیرت مند مسلمان تھے کہ جب انہیں محسوس ہوا کہ وہ اپنی عورتوں کی حفاظت نہیں کر سکتے تو انہوں نے پہلے خواتین اور جوان لڑکیوں کو قتل کر دیا پھر دشمن سے لڑ کر خود بھی شہید ہو گئے۔ اس ظلم کی باز گشت جب آگرہ کے دربار میں سنائی دی تو اورنگ زیب نے پہلے خان جہاں کو دکن بھیجا پھر خود بھی ایک لشکر لے کر برہان پور پہنچ گیا۔

متعصب ہندو مورخ جادو ناتھ سرکار نے اس بات کا بڑا واویلا کیا ہے کہ مسلمانوں نے ان کے مٹی اور تانبے سے بنے ہوئے بت توڑ دئے۔ اس لیے مسلمان نا منصف اور ظالم ہیں۔ مگر وہ ثابت نہیں کر سکا مسلمانوں نے اپنی فتوحات کے دوران کبھی دشمن پر اس طرح شب خوں مارا ہو جیسا کہ سنبھا جی نے برہان پور کی بیرونی بستیوں پر یلغار کی تھی اور نہتی آبادی کو تہس نہس کر کے ان کی عورتوں کے ساتھ اس قدر زیادتی کی دوسری بستی کے مسلمانوں نے اپنی عورتوں کو قتل کر کے ان سے مقابلہ کیا اور لڑتے لڑتے شہادت حاصل کی۔

اگر اس سلسلہ میں مسلمانوں کا کردار دیکھنا ہو تو حضرت ابوبکرؓ کے اس حکم کو دیکھو کہ جب وہ اسلامی باہر بھیجتے تو انہیں تائید کرتے۔

۱۔ کسی بستی میں آگ نہ لگانا۔
۲۔ کسی پھل دار درخت کو نہ کاٹنا۔
۳۔ کسی عورت یا بوڑھے پر ہاتھ نہ اٹھانا۔
۴۔ اور جب کسی قوم پر حملہ کرنا ہو تو پہلے اسے سلام پیش کرنا پھر خراج کی ادائیگی کی دعوت دینا اور اگر پھر بھی وہ مصالحت پر آمادہ نہ ہوں تو جنگ کرنا۔

مگر ہندوؤں کے ہیرو سیواجی اور اب اس کے بیٹے سنبھا نے شرافت کے اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر برہان پور کی سترہ بستیوں پر شب خون مارا اور نہتے مسلمانوں کو قتل کر دیا۔ عورتوں کے ساتھ ان کا سلوک اس قدر غلیظ تھا کہ مسلمانوں نے پہلے اپنی عورتوں کو خود قتل کر دیا پھر ان سے لڑ کر شہید ہو گئے۔

آخر اسی متعصب ہندو نے خود اقبال کیا۔

مرہٹے تین دن متواتر شہر کو (حالانکہ وہ مضافاتی بستیاں تھیں) لوٹنے کے بعد لوٹ مار

کا مال جمع کر کے' اس ڈر سے بھاگ نکلے کہ کہیں خان جہاں موقعہ پر نہ پہنچ جائے۔ ایک مورخ نے بیان کیا ہے کہ سترہ کی سترہ بستیاں ان غیر شریف انسانوں (مرہٹوں) نے جلا دی تھیں اور ان میں جتنے لوگ آباد تھے وہ سب کے سب سوائے چند کے یا تو جل مرے تھے یا دشمن نے قید کر لئے تھے۔

بستیوں کے ان حملوں میں جن میں امرا اور بڑے تاجر رہتے تھے' بہت بری طرح لوٹا' مرہٹوں نے گھروں کے فرش اور دیواریں توڑ ڈالیں اور مدفون خزانے تک نکال لئے اور بے شمار مال غنیمت جمع کرنے کے بعد بھاگ نکلے۔ ان کی بہادری کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ انہوں نے بھاگنے سے پہلے شہر (برہانپور) پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن جب شہر کی محافظ فوج نے جس کی تعداد محض چند سو تھی ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ان پر آگ برسائی تو وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ اٹھے۔

بہادر قوموں نے شہروں پر حملے کئے ہیں۔ شہریوں پر بھی تلواریں اٹھائی ہیں مگر سنبھا اور اس کے بیس ہزار مرہٹہ سواروں نے بزدلی کا جو مظاہرہ کیا وہ تو محض ایک ڈاکو ہی کر سکتا تھا۔ اس نے رات کے وقت سوتوں پر شب خون مارا' ان کے گھر لوٹے اور انہیں تہہ تیغ کر دیا۔ یہ تھا سنبھا کا مسلمانوں کے ساتھ پہلا تعارف۔ اس ذلیل تعارف کے بعد مسلمان اسے قطعی شریف انسان نہ سمجھ سکتے تھے یہ اور بات ہے کہ ہندو قوم سنبھا کو اپنا ہیرو کہتی ہے۔

یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ برہان پور پر حملہ سے ہر طرف زلزلے لہرا گئے۔ شاہی مخبروں نے فوراً" یہ خبر خان جہاں کو پہنچائی۔ خان جہاں نے بڑی تیزی دکھائی۔ ایک بیان کے مطابق اس نے چار دن کا راستہ صرف ایک دن میں طے کیا مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ سنبھا لوٹا ہوا مال لے کر سالیہ پہنچ چکا تھا۔

اورنگ زیب کو جب اس حادثہ کی اطلاع ہوئی تو وہ خان جہاں پر بہت ناراض ہوا اور اسی وقت برہان پور روانگی کا فیصلہ کیا۔ اورنگ زیب ۱۶۸۲ء میں اورنگ آباد پہنچا۔ اب اس کا اصل مقصد تھا مرہٹہ سردار سنبھا اور باغی شہزادہ اکبر کی سرگرمیوں کو روکنا تھا۔ شہزادہ اکبر نے جو چوپائی کے گاؤں میں سنبھا کی پناہ میں تھا' دو ہزار سپاہیوں پر مشتمل فوج تیار کر لی تھی۔ شہزادہ اکبر اس تمام مدت میں بطور شہنشاہ ہند فرمان جاری کرتا رہا تھا۔ سنبھا جی نے

اسے دہلی کا تخت حاصل کرنے میں فوجی مدد دینے کا وعدہ کیا تھا۔

دوسری طرف اورنگ زیب نے مہاراشٹر کے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دی تھی۔
پھر ۱۶۸۲ء میں اورنگ زیب نے مرہٹوں کے خلاف زبردست کاروائی کا آغاز کر دیا۔ ایک ڈویژن فوج سید حسن علی خاں کی قیادت میں روانہ کی گئی جس نے نو فروری کو کلیان پر قبضہ کر لیا۔ تاہم یہ فوج زبردست مون سون (بارش) کی وجہ سے مئی میں واپس آ گئی۔

دوسرا ڈویژن شہاب الدین خاں کی قیادت میں بھیجا گیا جس نے ناسک پر حملہ کر کے رام سیج کا محاصرہ کر لیا۔ چھ ماہ بعد یہ محاصرہ اٹھا لیا گیا۔ روح اللہ اور شاہ عالم کو احمد نگر کی حفاظت کے لئے اور شہزادہ اعظم کو بیجا پور کی طرف سے مرہٹوں کو ملنے والی مدد روکنے کے لئے روانہ کیا گیا۔ خان جہاں نے مرہٹوں کا دور دور تک تعاقب کیا۔ شہزادہ اعظم نے علاقہ اوڈ پر قبضہ کر لیا۔

خان جہاں اور مرہٹوں میں کئی مقابلے ہو چکے تھے اور مرہٹوں کو ہر بار بھاگنا پڑا تھا۔
اسی دوران مرہٹہ سردار سنبھا نے ایک انتہائی ذلیل حرکت کی۔ اس نے تین ہزار مرہٹہ سواروں کو خان جہاں کے کیمپ کے گرد چھپا دیا اور انہیں حکم دیا کہ جب بھی ان کے پاس سنبھا کا قاصد پہنچے تو وہ فوراً خان جہاں کے کیمپ پر حملہ کر کے اس کے اہل خانہ کو گرفتار کر لے۔

ادھر خان جہاں مرہٹوں کا تعاقب کرتا ہوا اپنے کیمپ سے بہت دور نکل گیا تھا۔
مرہٹہ سردار سنبھا اپنے منصوبہ کے مطابق خان جہاں کو اپنے پیچھے بہت دور تک بھگا لے گیا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ اب خان جہاں اپنے کیمپ کو جلد واپس نہیں پہنچ سکتا تو اس نے اپنا سوار اس دستہ کی طرف بھیجا جو اس نے خان جہاں کے کیمپ کے قریب چھپا رکھا تھا۔ سنبھا کے سوار نے وہاں پہنچ کے اس دستہ کے سردار کو سنبھا کا یہ حکم دیا کہ فوراً خان جہاں کے کیمپ پر حملہ کر کے اس کے اہل خانہ کو گرفتار کر لیں اور انہیں لے کر سنبھا کے پاس پہنچ جائیں۔

خان جہاں کی بیوی جہاں زیب بانو اپنے شوہر کی طرح نہایت نڈر اور بہادر خاتون تھی۔ چونکہ اس کا شوہر عام طور پر کیمپ سے دور ہی رہتا تھا اس لئے کیمپ کی حفاظت یا سردار اپنے طور پر جہاں زیب بانو نے خود ہی سنبھال لی تھی۔ شوہر کی عدم موجودگی میں

کیمپ کے چوکی پہرے کا وہ آپ انتظام کرتی تھی۔ اس نے چار چار سواروں کے پچیس گروپ بنائے تھے اور یہ گروپ ایک دوسرے کے پیچھے کچھ فاصلہ چھوڑ کے تمام رات کیمپ کے گرد ایک دائرے کی شکل میں گشت کرتے رہتے تھے۔
سنبھا جی کے تین ہزار سوار خان جہاں کے کیمپ سے چار پانچ گھنٹے کے فاصلہ پر ایک محفوظ پہاڑی غار میں چھپے ہوئے تھے۔ ان کے پاس سنبھا جی کا پیغام پہنچا تو انہوں نے فوراً گھوڑوں کی باگیں اٹھائیں اور خان جہاں کے کیمپ کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ شب خون مارنے والے سوار رات کے پچھلے پہر خان جہاں کے کیمپ کے قریب پہنچ گئے مگر یہ دیکھ کے حیران رہ گئے کہ کیمپ کے محافظ دور دور تک پہرے پر موجود ہیں اور گشتی سوار اپنی معمول کی گشت پر ہیں۔
سنبھا کے سوار کچھ دور رک کر آپس میں صلاح مشورہ کرنے لگے۔ اس وقت گشتی سواروں نے ان حملہ آوروں کو دیکھ لیا اور ایک سوار کو فوراً کیمپ کی طرف خبر پہنچانے روانہ کر دیا۔ مرہٹوں کی آمد کی خبر پاتے ہی جہاں زیب بانو نے لمحوں میں جسم پر اسلحہ سجایا اور اپنے بارہ سو سواروں کے ساتھ اس طرف فوراً چل پڑی جہاں مرہٹوں کی موجودگی کی اطلاع ملی تھی۔

اس طرف مرہٹوں نے پہلے پہلے یہ طے کیا تھا کہ کیمپ کو گھیرے مین لے کر اچانک حملہ کر دیں گے مگر جب انہیں پہریداروں کو ہوشیار دیکھا تو کیمپ کو گھیرنے کے بجائے ایک ہی طرف سے ایک ساتھ حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا اور گھوڑے اڑا کر کیمپ پر حملہ آور ہوئے۔ مگر کیمپ پر پہنچنے سے پہلے ہی جہاں زیب بانو نے ان کا چمکتی تلواروں سے استقبال کیا۔

وہ چودھویں کی رات تھی اور پورا چاند دور دور تک اپنی صاف شفاف روشنی پھیلا رہا تھا۔ اس لئے مرہٹے اور جہاں زیب بانو کے سوار ایک دوسرے پر اس طرح حملہ آور ہوئے جیسے رات کے بجائے وہ دن میں جنگ کر رہے ہیں۔ ایک طرف تین ہزار سے زیادہ مرہٹہ سوار تھے جو کئی دنوں سے اس وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ خان جہاں کے کیمپ پر وہی آفت ڈھائیں گے جو انہوں نے برہان پور کی سترہ مضافاتی بستیوں پر ڈھائی تھی۔

مگر ان کے تمام منصوبے اور خواب اس وقت چکنا چور ہو گئے جب انہوں نے ہزاروں محافظوں کو مقابلہ کے لئے تیار پایا۔ پھر انہوں نے زبردست یلغار کی تاکہ محافظوں کو مارتے کاٹتے کیمپ پر خان جہاں کے اہل خانہ کو گرفتار کر کے سنبھاجی کی خوشنودی حاصل کریں مگر محافظ سوار ان کے سامنے دیوار بن کے کھڑے ہو گئے۔ محافظوں کی کمان جہاں زیب بانو کر رہی تھی اور اپنے سواروں کے حوصلے بڑھانے کے لئے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر تلوار چلاتی پھر رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے سوار کٹ کٹ کے گر تو رہے تھے مگر ایک قدم پیچھے ہٹنے کا تصور بھی نہ کرتے تھے۔

حملہ آور مرہٹوں کی تعداد تین گنا سے بھی زیادہ تھی مگر ان کی ایک نہ چل رہی تھی اور مرہٹوں کے ہر حملہ کا جواب جوابی حملہ سے دے رہے تھے۔ اس سے جس قدر نقصان جہاں زیب بانو کا ہو رہا تھا اس سے زیادہ نقصان مرہٹوں کو پہنچ رہا تھا۔ تین گھنٹے تک زبردست شمشیرزنی ہوتی رہی مگر مرہٹے پہریداروں کی دیوار کو نہ توڑ سکے اور ان کا اس قدر نقصان ہوا کہ انہیں گھر جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ مرہٹے پسپا ہونا شروع ہو گئے اور آخر انہیں میدان چھوڑ کے بھاگنا پڑا۔

جہاں زیب بانو خدا کا شکر بجا لائی کیونکہ اس وقت تک اس کے نو سو سوار کام آ چکے تھے اور مشکل سے دو ڈھائی سو سوار باقی بچے تھے مگر بزدل مرہٹے ایسے گھبرائے کہ وہ پہریداروں کی تعداد کا اندازہ ہی نہ کر سکے اور جان بچا کر بھاگ گئے۔ جہاں زیب بانو سے زیادہ اس کے باقی بچے سوار خوش تھے۔ انہیں اپنی شکست کا یقین ہو گیا تھا اگر تھوڑی دیر مرہٹے اور ڈٹے رہتے تو ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہو جاتی مگر خدا کو ان کی اور خان جہاں کی بیوی جہاں زیب بانو کی لاج رکھنا تھی کہ اس نے اپنے سے تین گنا زیادہ دشمن کو مار بھگایا تھا۔

کسی ہندو یا انگریز تاریخ میں اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ کیونکہ مرہٹے ان کے ہیرو تھے اور سنبھاجی کو وہ اپنا واحد سہارا سمجھتے تھے۔

اورنگ زیب کئی ماہ تک دکن میں ٹھہرا رہا۔ ایک طرف اس نے شہزادہ اعظم کو سالیر پر قبضہ کے لئے بھیجا تو دوسری طرف شہزادہ معظم کو حکم ہوا کہ وہ رام درہ کوکن کی طرف روانہ ہو۔ اورنگ زیب نے شہزادہ معظم کے ساتھ کئی بڑے بڑے سردار کر دیئے تھے۔

قلعہ سالیر کو ناقابل شکست سمجھا جاتا تھا۔ قلعہ کو جانے والے راستہ کے ایک طرف گہرے گہرے غار تھے اور دوسری طرف موجیں مارتا ہوا دریا۔ اس تنگ راستہ کو پار کرنا ناممکن نظر آتا تھا۔ اس علاقہ کا فوجدار نیک نام خان تھا۔ اس کے دل میں جو نیکی آئی تو اس نے سالیر کے قلعدار کو جو اس کا دوست تھا یہ پیغام بھیجا کہ اگر قلعہ شہزادہ اعظم کے حوالے کر دے تو اسے مغل فوج میں چار ہزاری منصب عطا کیا جائے گا۔

سالیر کے قلعہ دار نے اس شرط پر آمادگی ظاہر کی کہ اس کے اہل خانہ کے علاوہ اس کے پچاس آدمیوں کی بھی جاں بخشی کی جائے۔ نیک نام خاں نے اس سلسلہ میں شہزادہ اعظم سے گفتگو کی۔

شہزادے نے جواب دیا۔

”نیک نام خاں۔ تم نے یہ کیا غضب کیا۔ شہنشاہ نے ہمیں قلعہ کی تسخیر کے لئے بھیجا۔ اس اندرونی خانہ سازش سے قلعہ حاصل کرنے کا حکم نہیں دیا ہے۔“

نیک نام خاں نے شہزادے کو سمجھایا۔

”شہزادے بہادر۔ آپ نے درست فرمایا کہ شہنشاہ نے ہمیں سالیر کی تسخیر کے لئے بھیجا ہے مگر شہنشاہ نے ہمیں یہ تو حکم نہیں دیا کہ اگر قلعہ مفت ہاتھ آتا ہو تو انکار کر دیا جائے۔ اس موقعہ سے ہمیں پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہئے۔“

”مگر نیک نام خاں۔ کیا یہ شہنشاہ کی حکم عدولی نہیں ہو گی؟“ شہزادے نے ذرا سخت لہجہ میں کہا۔ ”شہنشاہ کو کون جواب دے گا۔ میں تو ان کا سامنا بھی نہیں کروں گا۔“

نیک نام خاں نے جواب دیا۔

”اس کی ذمہ داری میں اٹھاتا ہوں شہزادے۔ شہنشاہ سے اچھی بری میں نپٹوں گا۔ میں آپ پر الزام نہیں آنے دوں گا۔“

”نہیں نیک نام خاں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔“ شہزادے نے سختی سے انکار کر دیا۔ ”ہم شہنشاہ کے حکم کے بغیر ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے۔ اگر تمہیں یقین ہے کہ قلعہ اس ترکیب سے حاصل ہو سکتا ہے تو میں شہنشاہ کو لکھ بھیجتا ہوں۔ وہاں سے جو جواب آئے گا اس پر عمل کیا جائے گا۔“

نیک نام خاں کو کچھ غصہ آ گیا۔ اس نے غصہ کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"شہزادے بہادر۔ آخر میں یہاں کا فوجدار ہوں۔ شہنشاہ کا یہ ہمیشہ سے حکم ہے کہ جس علاقہ میں دشمن کے خلاف کاروائی کی جائے' وہاں کے معززین اور مدبرین سے مشورہ ضرور کر لیا جائے۔ اگر آپ میرا مشورہ نہیں مانیں گے تو میں شہنشاہ سے آپ کی شکایت کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

شکایت کے نام پر شہزادہ گھبرا گیا۔ نرم پڑتے ہوئے بولا۔

"اگر تم اپنی ذمہ داری پر کرنا چاہتے ہو تو جیسے چاہو کرو۔ مگر میں شہنشاہ سے ان لوگوں کی جاں بخشی کی سفارش نہیں کروں گا جن کی فہرست سالیر کے قلعدار نے بھیجی ہے۔"

"اس کی ذمہ داری بھی مجھ پر ہے۔" نیک نام خاں نے پوری ذمہ داری قبول کرتے ہوئے کہا۔ "شہزادے بہادر۔ بزرگوں کا یہ قول یاد رکھئے کہ جنگ میں ہر بات جائز ہوتی ہے۔ ہم اس وقت حالت جنگ میں ہیں۔ ہم ہر وہ قدم اٹھائیں گے جس میں ہمارا فائدہ ہو گا۔"

پس نیک نام خاں نے قلعدار کے پاس پیغام بھیج دیا کہ اس کی شرط منظور کی جاتی ہے اور وہ ہمیں آنے کا سگنل دے۔ چنانچہ مغل فوج نے قلعہ کی طرف کوچ کیا قلعدار سالیر نے نیک نام خاں کے وعدوں پر اعتبار کرتے ہوئے قلعہ بغیر لڑے شہزادہ کے سپرد کر دیا۔

شہزادہ اعظم چونکہ ذاتی طور پر اس حکمت عملی کے خلاف تھا لیکن وہ نیک نام خان کی حکمت عملی کو بدلنے کا بھی اختیار نہ رکھتا تھا۔ اس نے شہنشاہ کو لکھ بھیجا کہ نیک نام خاں نے یہ کام مجھ سے پوچھے بغیر کیا ہے۔

شہزادہ نے اس شہنشاہ سے شکوہ و شکایت کی تھی جو سو داناؤں کا ایک دانا تھا اور ایسی حکمت عملی کو پسند کرتا تھا جس میں کم از کم خون خرابہ ہو۔ پھر اس معاملہ میں تو قلعہ سالیر قبضہ میں آگیا اور کسی کی تکسیر تک نہیں ہوئی۔ چنانچہ اس نے شہزادہ کی شکایت کو سفارش میں بدل دیا اور لوگوں کی جاں بخشی کا فرمان جاری کر دیا جن کی جانوں اور مالوں کی حفاظت کے لئے قلعدار سالیر نے درخواست کی تھی۔

تاریخ اسلام میں اسی قسم کا ایک واقعہ عہد فاروقی میں پیش آیا تھا جب خلیفہ کے

ایک غلام نے دشمن کی پوری قوم کو امان دے دی تھی۔ یہ واقعہ عراق کی فتح کے موقعہ پر پیش آیا تھا۔ جب خلیفہ کو معلوم ہوا کہ ایک مسلمان غلام نے پوری بستی کو امان دے دی ہے تو حضرت عمرؓ نے اللہ کا شکر ادا کیا اور غلام کی دی ہوئی امان کو وہی درجہ دیا جیسے وہ خود کسی کو امان دیتے تھے۔

قلعہ سالیر یا سلیر کے بعد قلعہ رام سیج کا محاصرہ شروع ہوا۔ یہاں کا قلعدار بہت جہاندیدہ تھا۔ وہ کسی طرح رشوت سے رام نہ ہو سکا۔ چنانچہ محاصرہ طول پکڑ گیا۔ خان جہاں نے بھی بہت سر مارا۔ سپاہیوں نے بھی اپنی کوششیں کر لیں مگر نتیجہ کچھ نہ نکل سکا۔ اس قلعہ پر قبضہ کے لئے نیک نام خاں کی ہی کوششیں بار آور ہوئیں۔ اس نے سلیر کے قلعدار کی طرح رام سیج کے قلعہ دار کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا اور یوں یہ قلعہ بھی فتح ہو گیا۔

دوسری طرف شہزادہ معظم اپنے کام میں لگا تھا۔ وہ کام زیادہ مشکل تھا۔ شہزادہ نے محمد مراد خان کی قیادت میں بیس ہزار سواروں کی فوج سنبھو کے علاقہ میں داخل کر دی مگر اسے بڑی پریشانیاں اور مصیبتیں اٹھانا پڑیں۔ تنگ پہاڑی راستے۔ ندی نالے اور جنگل پھر دشمن کے چھاپے۔ پر سپاہیوں نے تکلیفیں اٹھا کر سنبھو کے ایک بڑے قلعہ سانپ گاؤں پر قبضہ کر لیا اور رام درہ میں داخل ہو گئے۔

یہ درہ بے حد خوفناک تھا۔ ہر طرف جنگل ہی جنگل' گہرے گہرے غار' اس پر زہریلے سانپوں کی بھرمار۔ ان سانپوں نے سپاہیوں کے علاوہ گھوڑوں کو بھی ڈس ڈس کر ہلاک کر دیا۔ غذا کی کمی ہو گئی۔ گھوڑے ختم ہو گئے۔ بادشاہ کو اس کی خبر ہوئی تو واپسی کی اجازت دے دی۔

اس زمانہ میں اورنگ زیب کو پے در پے خبریں ملیں کہ دو مسلم حکومتیں یعنی گولکنڈہ اور بیجا پور مرہٹوں کی پشت پناہی کر رہی ہیں اور یہ ان کی ہی مدد ہے جس نے سنبھو یا سنبھا کو اس قدر دیدہ دلیر کر دیا ہے۔ چنانچہ اورنگ زیب نے کچھ دنوں کے لئے سنبھا کو گوشمالی روک دی اور گولکنڈہ اور بیجا پور کی خبر لی۔

اورنگ زیب نے ان دونوں حکومتوں کا ایسا دماغ صحیح کیا کہ وہ درست ہو گئے۔ اس کے بعد سنبھا کی کوئی خاص حیثیت نہ رہ گئی۔ پس ۱۱۰۱ ہجری میں شہزادہ محمد اعظم نے بہت سے نامور سرداروں کے ساتھ سنبھا کے خلاف مہم کا از سر نو آغاز کیا۔ ان سرداروں میں

مقرب خاں بھی تھا۔ اسے اس لئے زیادہ شہرت حاصل ہوئی کہ وہی سنبھا کی گرفتاری کا موجب بنا تھا۔

روایت ہے کہ مقرب خاں شاہی چھاؤنی سے اجازت لے کر اپنے دو سو سواروں کے ساتھ کولھا پور کے نواح میں گھوم رہا تھا کہ اس کا ایک جاسوس خبر لایا کہ سنبھا اپنے وزیراعظم کے بنگلہ پر جو سنگ میر کے علاقہ میں تھا' عورت اور شراب سے دل بہلا رہا تھا۔ یہ خبر پاتے ہی مقرب خاں اپنے ساتھیوں کو لے کر ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

سنگ میر' کولھا پور سے تقریباً" ڈیڑھ سو میل کے فاصلہ پر تھا مگر مقرب خاں گھوڑا دوڑاتا اور تکلیفیں اٹھاتا آخر سنگ میر پہنچ گیا۔ مخبر نے اسے صحیح اطلاع دی تھی۔ سنبھا وہاں شراب و کباب سے دل بہلا رہا تھا۔ مقرب خاں نے بنگلہ گھیر لیا۔ سنبھا کے وزیراعظم کے پاس اس وقت ایک ہزار سوار تھے۔ اس نے مقابلہ کیا مگر مقرب خاں جیسے بہادر کے آگے اس کی ایک پیش نہ گئی۔ آخر مقرب خاں نے سنبھا' اس کے بیٹے اور چھبیس دوسرے افراد جن میں مردوں کے علاوہ عورتیں بھی تھیں گرفتار کر لیا اور بڑی شان سے انہیں لے کر اورنگ زیب کی طرف روانہ ہوا۔

جس وقت سنبھا اور اس کے ساتھیوں کا جلوس شاہی خیمے کے قریب پہنچا تو اس منظر کو دیکھنے کے لئے ہزاروں مرد اور عورتیں وہاں جمع تھیں۔ ان میں زیادہ وہ لوگ تھے جنہیں اس بد بخت کے ہاتھوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ان میں صرف مسلمان ہی نہ تھے بلکہ ہندو بھی تھے۔ سنبھا ظالم ہونے کے ساتھ ڈاکو بھی تھا۔ ڈاکہ ڈالتے وقت وہ ہندو مسلمان کی تمیز نہ کرتا تھا اور نہتی آبادیوں کو لوٹ کر جلا دیا کرتا تھا۔

سنبھا اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں زنجیریں تھیں۔ جس وقت انہیں اورنگ زیب کے سامنے پیش کیا گیا تو اورنگ زیب اپنی جگہ سے اٹھ کے دو قدم آگے آ گیا اور قبلہ رو کھڑے ہو کر اس نے دو رکعت شکرانہ کے نفل پڑھے کہ جس نے پہلے اسے شہنشاہ ہند بنایا پھر آج اسے یہ اعزاز بخشا کہ سیوا جی کا بیٹا سنبھا اور اس کا بیٹا دوسرے لوگوں کے ساتھ اس کے سامنے پابہ زنجیر کھڑا تھا۔

مقرب خاں نے یہ بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ اورنگ زیب نے اسے قیمتی تحائف' پچاس ہزار نقد اور سات ہزاری منصب عطا کیا۔ سنبھا نے چونکہ رعایا پر بے پناہ ظلم کیا تھا۔ لوگوں کو طرح طرح کی تکلیفیں دی تھیں۔ عورتوں کو بے عزت کیا تھا۔ بچوں اور بوڑھوں تک کو قتل کر دیا کرتا تھا۔ اس لئے اسے بھی شہنشاہ ہند اورنگ زیب کے حکم سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

سنبھا جی کی موت سے سیوا جی کا بڑا جانشین ختم ہو گیا تھا مگر مرہٹوں نے اپنی جد و جہد نہ چھوڑی اور نہ ان کی جمعیت منتشر ہوئی۔ انہوں نے فوراً" سیوا جی کے دوسرے بیٹے راجہ رام کو اپنا راجہ بنا لیا اور راج گڑھ کے قلعہ کو اپنا مرکز بنایا۔ اب راج گڑھ مرہٹوں کا سب سے بڑا مرکز اور قلعہ تھا۔ راج گڑھ کو بعض تواریخ میں رائے گڑھ لکھا گیا ہے۔

راجہ رام کو چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ مغل سردار اعتقاد خاں نے جلد ہی مرہٹہ دارالسلطنت رائے گڑھ کا محاصرہ کر لیا۔ راجہ رام بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگ نکلا اور ٹھوکریں کھاتا ہوا گنگی پہنچا۔ ادھر رائے گڑھ پر مغل سردار اعتقاد خاں نے قبضہ کر لیا۔ یہی اعتقاد خاں بعد میں نصرت جنگ اور ذوالفقار خاں کے نام سے مشہور ہوا۔

مرہٹہ خاندان کی تمام عورتیں' بچے جن میں سنبھا جی کا سات سالہ بیٹا شاہو جی بھی شامل تھا' اورنگ زیب کے کیمپ پہنچا دیئے گئے۔ اورنگ زیب نے ان سے نہایت با عزت سلوک کیا اور ان کے آرام و آسائش کا پورا خیال رکھا۔

گذشتہ چار سال سے اورنگ زیب بیجا پور کی عادل شاہی سلطنت کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھا سکا تھا کیونکہ اس کی توجہ سنبھا اور شہزادہ اکبر کی طرف تھی۔ اب اورنگ زیب نے پھر عادل شاہی حکومت کی طرف توجہ کی اور عادل شاہ کو دوستانہ خطوط اور خلعتیں روانہ کیں مگر عادل شاہی اس کے دوست بننے پر تیار نہیں ہوتے بلکہ اندر ہی اندر جنگ کی تیاریاں کرتے رہے۔

آخر مغلوں نے بیجا پور کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت فوجوں کی کمان روح اللہ خاں قاسم خاں اور خان جہاں کے پاس تھی مگر یہ محاصرہ ناکام ثابت ہوا۔ اس کی بڑی وجہ مغل کمانڈری کے آپس کے اختلافات تھے۔ مجبوراً" اورنگ زیب کو خود وہاں جانا پڑا۔ اس نے وہاں پہنچتے ہی سخت دباؤ ڈالا اور محاصرے میں اتنی شدت پیدا کی کہ قلعہ والوں کو باہر سے

رسد ملنا بند ہو گئی اور وہاں فاقوں کی نوبت آ گئی۔

مجبور ہو کے عادل شاہی سلسلہ کے آخری تاجدار سکندر نے اپنے امیروں کو اورنگ زیب کی خدمت میں بھیجا۔ اورنگ زیب نے ان کی پذیرائی کی اور صلح کی شرائط طے ہو گئیں۔ سکندر عادل شاہ اپنا دارالسلطنت چھوڑ کے رسول پور میں اورنگ زیب کے کیمپ میں آ گیا۔ اس کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا اور اسے شاہ کی جگہ "خان" کے خطاب سے نوازا گیا۔ اس کے لئے ایک لاکھ سالانہ پنشن بھی منظور ہوئی اور اس کے تمام عہدہ داروں کو مغل ملازمت میں لے لیا گیا۔

اورنگ زیب بیجا پور میں داخل ہوا۔ جس دروازے سے وہ داخل ہوا اس کا نام "فتح دروازہ) رکھا گیا۔ بیجا پور کے حکمران کے محل میں اور آثار شریف میں در و دیوار پر جتنی بھی تصویریں نقش تھیں وہ سب مٹا دی گئیں کیونکہ اورنگ زیب کے خیال وہ احکام قرآنی کے برعکس تھیں۔ بیجا پور کی حیثیت اب دارالسلطنت کے بجائے ایک صوبائی صدر مقام کی ہو گئی۔

اس فتح کے صرف دو سال بعد بیجا پور میں طاعون کی وبا پھیل گئی اور تقریباً" نصف آبادی موت کے گھاٹ اتر گئی۔ اس طرح پورا شہر ایک ویرانہ بن گیا۔ بیجا پور کا سابق حکمران سکندر جو دولت آباد کے قلعہ میں نظربند تھا اس نے ۱۳ اپریل ۱۷۰۰ء میں ۳۲ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

جب تک مغل، مرہٹوں اور بیجا پور سے برسرپیکار رہے، گولکنڈہ کے قطب شاہی بڑے آرام سے رہے۔ قطب شاہ باقاعدگی سے خراج ادا کرتا رہا۔ پر ابو الحسن گولکنڈہ کے تخت پر بیٹھا۔ یہ حکمران سلاطین گولکنڈہ کا آخری تاجدار تھا۔ اس نے حکومت کی تمام ذمہ داریاں اپنے ہندو وزیر کے سپرد کر دیں اور خود رات دن محل میں اپنی داشتاؤں کے ساتھ عیش و عشرت میں مصروف رہتا تھا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا اقتدار مدنہ، اس کے بھائی کے بھتیجے رستم راؤ کے ہاتھوں میں آ گیا۔ اس نے مسلمانوں پر ظلم کرنا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ مدنہ، مرہٹوں سے بھی ساز باز رکھتا تھا۔ انہی دنوں ابو الحسن کا ایک خط پکڑا گیا جس میں ابو الحسن نے شاہی دربار میں اپنے سفیر کو لکھا تھا اورنگ زیب کے بیجا پور کے حکمران کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔

وہ خط اورنگ زیب کے سامنے پیش کیا گیا۔ جس کے نتیجے میں اورنگ زیب نے شاہ عالم کو حیدر آباد پر حملہ کے لئے روانہ کیا۔ شاہ عالم کا راستہ ہی میں قطب شاہی فوج سے مقابلہ ہو گیا۔ دونوں میں جنگ شروع ہو گئی۔ آخر قطب شاہی سپہ سالار نیر محمد ابراہیم مغلوں سے مل گیا۔ جس کی وجہ سے قطب شاہی فوج واپس چلی گئی۔

سپہ سالار کی غداری کی وجہ سے حیدر آباد کے دفاع کو سخت نقصان پہنچا۔ ابو الحسن اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ سب کچھ چھوڑ کے گولکنڈہ کے قلعہ میں پناہ گزین ہو گیا۔ پھر ابو الحسن نے اورنگ زیب کے پاس اطاعت کی درخواست بھیج دی۔ اورنگ زیب نے شاہ عالم کی سفارش پر ابو الحسن کو اس شرط پر معافی دی کہ وہ پچھلے واجبات کے طور پر ایک کروڑ بیس لاکھ روپۓ اور سالانہ دو لاکھ ہن ادا کرے گا۔ اس کے علاوہ مدنہ اور اکنا کو برطرف کر دے گا۔ ابو الحسن، مدنہ کے معاملہ کو معرض التواء میں ڈالنا چاہتا تھا مگر گولکنڈہ کے بازار میں ہجوم مدنہ اور اکنا پر ٹوٹ پڑا اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

آخر قطب شاہی حکمران ابو الحسن نے نہایت خاموشی مگر وقار کے ساتھ تخت سے دست برداری اختیار کر لی۔ پر جب روح اللہ خاں اس کے محل میں اسے گرفتار کرنے پہنچا تو ابو الحسن نے اسے اور اس کے ساتھ آنے والوں کو اپنے ساتھ ناشتہ میں شریک کیا۔ پھر عورتوں اور ملازموں کو تسلیاں دیں اور ایک اسیر کی حیثیت سے مغل کیمپ کی طرف روانہ ہوا۔

شام کو شاہ عالم نے ابو الحسن کو اورنگ زیب کے سامنے پیش کیا۔ اورنگ زیب نے اسے دولت آباد کے قلعہ میں نظربند کرا دیا اور پچاس ہزار سالانہ پنشن مقرر کی۔ گولکنڈہ سے مغلوں کو تقریباً" سات کروڑ نقد اور بہت سا سونا چاندی اور جواہرات حاصل ہوئے۔

اورنگ زیب یہاں سے فتوحات کرتا ہوا بیجا پور پہنچا تو وہاں طاعون پھیل گیا جس میں اورنگ زیب کی بیوی اورنگ آباد محل اور جسونت سنگھ کے بیٹے محمدی راج کے علاوہ بہت سے امراء موت کا لقمہ بن گئے۔ فیروز جنگ بینائی سے محروم ہو گیا۔ اس وبا میں تقریباً" ایک لاکھ افراد ہلاک ہوئے۔

مارواڑ کا محاذ

جب اورنگ زیب راجپوتانہ سے دکن روانہ ہوا تو اس کی فوجوں نے راجپوت ریاست مارواڑ کے اہم شہروں پر قبضہ کر لیا۔ لیکن راٹھور ۲۷ سال تک مغلوں سے نبرد آزما رہے اور صحراؤں اور پہاڑوں پر قبضے کرتے رہے۔ وہ میدانی علاقوں پر حملہ آور ہو کر مختلف قافلوں کو لوٹ لیتے۔ انہوں نے مغل چوکیوں پر بھی قبضے جما لئے۔ اس لوٹ مار اور بد امنی کی وجہ سے فصلوں کی حالت تباہ ہو گئی اور شدید قحط پڑ گیا۔

راٹھوروں کے درمیان خود بھی اختلافات تھے اور آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا سردار ایک بچہ تھا اور قومی رہنما درگا درس دکن میں تھا۔ جنھوں راٹھور مختلف جتھوں کی صورت میں لڑتے رہے۔ ان کی نہ کوئی مرکزی تنظیم تھی اور نہ کوئی مشترکہ لائحہ عمل تھا۔ چونکہ وہ گوریلا جنگ لڑتے تھے اس لئے انہیں اسلحہ کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی اس طرح وہ مغلوں کے لئے مصیبت بنے رہے۔

جب درگاس دکن سے لوٹا اور اجیت سنگھ جو روپوش تھا منظر عام آیا تو دونوں نے مل کر راٹھوروں کی قیادت سنبھالی۔ مارواڑ کے میدانی علاقوں سے دشمن کا صفایا کرنے کے بعد انہوں نے مالپورہ اور پارنڈل پر حملہ کیا۔ پھر انہوں نے اپنا رخ میوات اور دلی کی طرف کر دیا تاہم وہ اپنے علاقے واپس نہیں لے سکے کیونکہ شجاعت خان جودھ پور کا گورنر تھا۔ اس نے راٹھوروں کی ایک نہ چلنے دی اور ۱۴ سال تک مارواڑ پر اپنی بالا دستی قائم رکھی۔

شجاعت خاں کی موت کے بعد اعظم شاہ کو جودھ پور کا گورنر بنا کر بھیجا گیا۔ اجیت سنگھ نے از سر نو اپنی ریشہ دوانیاں شروع کر دیں اور ایک ایک کر کے چھ سال کے عرصہ میں پورا مارواڑ بحال کرا لیا۔

باغی شہزادہ اکبر بھاگتے ہوئے اپنی لڑکی صفیتہ النساء اور لڑکے بلند اختر کو راٹھوروں کے ہاتھوں میں چھوڑ گیا تھا۔ اورنگ زیب انہیں ہر حالت میں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ درگا داس نے اورنگ زیب کے پاس کہلوا بھیجا کہ شہزادی صفیہ اور شہزادہ بلند اختر اس کے پاس شہزادہ اکبر کی امانت ہیں۔ انہیں وہ شہزادہ اکبر ہی کو واپس کرے گا۔

درگا داس نے اورنگ زیب کو یہ اطمینان بھی دلایا تھا کہ شہنشاہ کو ننھی شہزادی اور ننھے شہزادے کی طرف سے بالکل مطمئن رہنا چاہیئے۔ ان دونوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو گی اور ان کے لئے شاہی محل جیسا ماحول پیدا کیا جائے گا تاکہ انہیں اجنبیت محسوس نہ ہو۔

اور یہ حقیقت تھی کہ اجیت سنگھ شہزادی شہزادے کو اپنی اولاد کی طرف نہ صرف چاہتا تھا بلکہ ان کا ہر طرح کا خیال رکھتا تھا۔ کتنے ہی نوکر اور نوکرانیاں دونوں کی دیکھ بھال پر مامور تھے۔

ایک دن اجیت سنگھ نے شہزادی سے پوچھا۔

"شہزادی بیٹی۔ آپ اپنے والد شہزادہ اکبر کے پاس رہنا پسند کریں گی یا اپنے دادا شہنشاہ اورنگ زیب کے پاس جانا چاہیں گی؟"

شہزادی نے فوراً" جواب دیا۔

"میں نہیں جانتی میرا دادا کون ہے۔ میں اپنے باپ کے پاس جاؤں گی۔"

"مگر شہزادی بیٹی۔" اجیت نے سمجھایا۔ "آپ کے والد شہزادے اکبر کا ابھی تک کوئی ٹھکانہ نہیں بنا۔ وہ آپ کے دادا سے خفا ہیں اور ان کے پاس نہیں جانا چاہتے۔ اس لئے تو آپ کو میرے پاس امانت کے طور پر رکھ گئے ہیں۔"

"بس تو پھر میں یہیں رہوں گی۔ میں دادا کے پاس نہیں جاؤں گی۔" شہزادی صفیتہ النساء نے صاف انکار کر دیا۔ پھر ذرا رک کے کہا۔ "آپ کے پاس آنے سے پہلے مجھے ایک استانی پڑھاتی تھیں۔ کیا یہاں کوئی استانی مجھے نہیں پڑھا سکتی؟"

"آپ فکر نہ کیجئے شہزادی۔" اجیت سنگھ نے اسے اطمینان دلایا۔ "میں بہت جلد آپ کے لئے ایک مسلمان استانی کا انتظام کروں گا جو آپ کو اور شہزادے بہادر کو آپ کے دین کی تعلیم دے گی۔"

اجیت سنگھ نے جو کچھ شہزادی سے کہا وہ کر دکھایا۔ دوسرے ہی ہفتہ شاہی خاندان کے دونوں بچوں کے لئے ایک استانی آ گئی۔ جس نے شہزادی اور شہزادے کو اسلامی تعلیم دی اور اسلامی تہذیب و تمدن سے روشناس کرایا۔

پھر جب عرصہ تک شہزادہ اکبر کی کوئی خیر خبر نہ ملی اور ادھر شہنشاہ اورنگ زیب کا

اپنی پوتی پوتا کی واپسی کا اصرار بڑھتا گیا تو شجاعت خاں (وہ اس وقت زندہ تھا) کے ذریعہ شہنشاہ اور اجیت سنگھ اور درگاداس میں گفتگو شروع ہوئی۔ اجیت سنگھ دونوں بچوں کو شاہی محل میں بھیجنے پر آمادہ تھا مگر خود بچے باپ کے پاس جانے کے خواہش مند تھے۔

اجیت سنگھ نے آہستہ آہستہ شہزادی اور شہزادے کو دادا کے پاس جانے پر آمادہ کر لیا۔ پھر اجیت سنگھ نے شاہی خاندان کے افراد کو چند راٹھور سواروں کے پہرے میں شجاعت خاں کے پاس بھجوایا جہاں سے شجاعت خاں نے انہیں شہنشاہ اورنگ زیب کے حضور پہنچا دیا۔

اورنگ زیب پوتی پوتے کو پا کے بہت خوش ہوا بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو لہرانے لگے۔ اس نے شہزادی صفیتہ النساء کو گود میں اٹھا کر پیار کیا اور کہا۔

”شہزادی۔ ہم تم دونوں کے لئے کس قدر بے چین تھے مگر تم ہمارے پاس آنے سے انکار کر رہی تھیں۔ آخر اس کی کیا وجہ تھی؟“

”دادا حضور۔۔۔“ شہزادی نے کہا۔ ”میں نے اور شہزادے نے کتنے دنوں سے ابا حضور کو نہیں دیکھا۔ ہم ان کے پاس جانا چاہتے تھے۔ آپ ابا حضور کو یہاں بلوا لیجئے۔“

شہزادے اکبر کے نام پر اورنگ زیب چپ ہو گیا۔ اس نے شہزادی کو کوئی جواب نہیں دیا مگر اس کے چہرے پر غصہ کے آثار نمودار ہو گئے۔ معصوم شہزادی نے بھی محسوس کر لیا کہ اورنگ زیب کو غصہ آ گیا ہے۔ وہ اس کی گود میں کسمسائی تو اورنگ زیب نے اسے گود سے اتار دیا۔

شہزادی نے کہا۔

”دادا حضور۔ آپ ہمیں چاچا اجیت سنگھ کے پاس واپس بھجوا دیجئے۔ انہوں نے ٹھیک کہا تھا کہ تمہارے دادا حضور ہر وقت غصہ میں بھرے رہتے ہیں۔“

اورنگ زیب لال پیلا ہوتا ہوا بولا۔

”ہوں۔ تو یہ اجیت سنگھ ہے جس نے تمہیں ہمارے خلاف بھڑکایا ہے۔ ہم اسے اس کی سزا ضرور دیں گے۔“

اس وقت شہزادہ بلند اختر جو شہزادی سے دو سال چھوٹا بہت ہی خورد سال تھا۔ بہن

کے برابر آ کے کھڑا ہوا سر بلند کر کے اورنگ زیب کو دیکھا اور کمر میں لٹکی ٹین کی تلوار کو کھینچ کے بلند کرتے ہوئے بولا۔

”دادا حضور۔ اگر آپ چاچا اجیت کو سزا دیں گے تو ہم آپ کو اپنی تلوار سے ماریں گے۔“

اورنگ زیب ننھے شہزادے کی زبان سے اس قدر سخت الفاظ سن کر حیران رہ گیا۔ پھر اس نے فرش پر بیٹھ کر شہزادے کے دونوں ہاتھ پکڑے اور کہا۔

”تم نے جاہل اور ان پڑھ راٹھوروں سے یہی سیکھا ہے کہ اپنے دادا کی توہین کرو۔ اب تمہیں ان کے پاس واپس نہیں جانے دیا جائے گا۔ تم دونوں نرے جانور ہو۔ یہاں ہم تمہیں پڑھا لکھا کر انسان بنائیں گے۔“

”دادا حضور۔۔“ شہزادی نے جواب دیا۔ ”چاچا اجیت سنگھ تے ہمیں پڑھایا۔ ہمیں ایک استاد اور ایک استانی پڑھاتے تھے۔ چاچا نے انہیں شہر سے بلا کے قلعہ میں ہمارے لئے رکھا تھا۔ میں دو سال سے استانی سے پڑھ رہی ہوں۔“

اورنگ زیب نے شہزادی کو گھورا اور پوچھا۔

”کیا پڑھا ہے تم نے استانی سے۔ مسلمانوں کا کلمہ جانتی ہو؟“

”جی دادا حضور۔۔۔“ شہزادی بولی۔ ”میں تمام کلمے جانتی ہوں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ ہمارے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مسلمانوں پر پانچ وقت کی نماز فرض ہے اور مسلمان سال میں ایک ماہ کے روزے رکھتے ہیں۔ وہ دن بھر کچھ نہیں کھاتے اور شام کو کھاتے ہیں۔۔۔“

اورنگ زیب کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ اس نے دوبارہ شہزادی کو گود میں اٹھا لیا اور کہا۔

”واہ بھئی واہ۔ ہماری شہزادی تو سب کچھ پڑھ چکی ہے۔ تمہارا چاچا اجیت سنگھ واقعی ایک اچھا آدمی ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس نے تمہیں اسلامی تعلیم دلوائی ہے۔“

ننھے شہزادے نے چیخ کر کہا۔

”دادا حضور۔ اب تو آپ اجیت چاچا کو کچھ نہیں کہیں گے؟“

اورنگ زیب نے جواب دیا۔

"تمہارے چاچا نے ہم پر احسان کیا ہے۔ ہم اسے انعام دیں گے۔ تم دیکھو گے ہم اسے اپنی نوازشوں سے کس طرح نوازتے ہیں۔"

اورنگ زیب نے اس سلسلہ میں تحقیق کی تو اسے معلوم ہوا کہ راٹھور سرداروں درگا داس اور اجیت سنگھ نے شہنشاہ کے پوتے اور پوتی کی تعلیم و تربیت پر ہر ممکن کوشش کی۔ شہزادی کے لئے ایک مسلمان خاتون کو بطور اتالیق مقرر کیا اور اسے دینی تعلیم دلوائی۔ چنانچہ شہنشاہ اورنگ زیب کے دل میں راٹھوروں کی طرف سے جو کدورت تھی وہ جاتی رہی۔

اورنگ زیب نے راٹھوروں کے اس حسن سلوک کا صلہ یوں دیا کہ نہ صرف اجیت سنگھ کو غیر مشروط طور پر معاف کر دیا بلکہ اسے تین پرگنے بطور جاگیر عطا کر کے اس کا عہدہ بھی مقرر کر دیا۔ دوسری طرف اس نے درگا داس کو تین ہزاری منصب دے کر مغل ملازمت میں لے لیا اور گجرات کی کمان اس کے سپرد کر دی۔

لیکن یہ دونوں راجپوت اورنگ زیب سے مطمئن نہ ہو سکے یا پھر انہیں مارواڑ کی یاد ستانے لگی چنانچہ پہلے درگا داس بھاگ کے مارواڑ چلا گیا پھر اجیت سنگھ بھی اس سے جا ملا۔ مگر مارواڑ کے حالات ان دنوں بہت خراب تھے۔ وہاں قحط پڑ گیا تھا۔ اب ان دونوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور افسوس کرنے لگے۔

ادھر شہزادے اکبر کی بیٹی شہزادی صفیہ اور شہزادہ بلند اختر اپنے ان دونوں محسنوں یعنی درگا داس اور اجیت سنگھ کو یاد کرتے اور دادا سے کہتے تھے۔

"دادا حضور آپ کیسے بادشاہ ہیں۔ ہمارے چچا درگا جی اور اجیت کو نہیں بلا سکتے۔ وہ ہمیں بہت یاد آتے ہیں۔"

اورنگ زیب افسوس سے کہتا۔

"میرے بچو میں نے تو ان کی طرف سے اپنا دل صاف کر لیا تھا مگر انہیں دربار کی عیش و عشرت کی زندگی پسند ہی نہیں۔ وہ پھر جنگلوں پہاڑوں میں اپنے قلعہ میں واپس چلے گئے ہیں۔"

اور شہزادی صفیہ بھولے پن سے کہتی۔

"پھر دادا حضور ہمیں بھی وہیں بھیج دیجئے۔ ہماری ملانی جی بھی تو وہیں رہتی ہیں۔ ہم

ان کے پاس رہیں گے۔

روایت ہے کہ شہنشاہ اورنگ زیب نے سرداروں کے ذریعہ دونوں کو پیغام بھیجا کہ شہزادی صفیہ اور شہزادہ بلند اختر انہیں بہت یاد کرتے ہیں وہ واپس آ جائیں۔ انہیں کچھ نہ کہا جائے گا۔ دونوں راجپوت واپس آنا چاہتے تھے مگر انہیں خوف تھا کہ اورنگ زیب انہیں قید کر لے۔ آخر اورنگ زیب نے دونوں کے بارے میں فرمان جاری کر دیا کہ انہیں معاف کر دیا گیا ہے اور وہ اپنے اپنے مناصب اور عہدوں پر بحال کئے جاتے ہیں۔

اس فرمان کے جاری ہوتے ہی پہلے اجیت سنگھ آگرہ پہنچ کے حاضر دربار ہوا اور معافی پیش کی۔ اورنگ زیب اسے لے کر زنانخانے میں گیا۔ قلعہ میں پردہ کرا دیا گیا تھا مگر شاہی خاندان کی تمام خواتین جھروکوں سے اس اجیت سنگھ کو دیکھنے کے لئے کھڑی ہوئی تھیں جس نے شہزادی صفیہ اور شہزادے بلند اختر کی سفارش پر شہنشاہ نے معاف کر دیا تھا۔

شہزادی اور شہزادہ' اجیت سنگھ کو دور سے دیکھتے ہی بھاگ کے ان کے پاس پہنچے اور پیروں سے لپٹ گئے۔ اجیت سنگھ کے آنسو نکل آئے۔ اس نے دونوں کو گود میں باری باری اٹھا کر سینے سے لگایا۔

اورنگ زیب نے اجیت سنگھ کو ایک جاگیر عطا کر دی۔

کچھ ہی دن بعد درگا داس نے بھی معافی نامہ بھیج دیا اور شہنشاہ نے اسے دربار میں آنے کا حکم دیا۔ درگا داس شہنشاہ کے حضور حاضر ہوا۔ شہزادی اور شہزادے اس سے مل کے بھی بہت خوش ہوئے۔ شہنشاہ کو ہندوؤں کا دشمن کہا جاتا ہے مگر شہنشاہ نے درگا داس پر کمال مہربانی فرمائی اور اسے پرانے عہدے پر بحال کر کے پھر گجرات کا حاکم بنا دیا۔

۱۷۰۶ء کے آخری دنوں میں اورنگ زیب کی تخت نشینی کے لیے کش مکش کا آغاز ہو گیا تھا۔ اورنگ زیب اگرچہ ابھی زندہ تھا مگر دکن میں تیس سال کے دوران اس نے جو کارنامے انجام دیئے تھے اس نے اس کے جسم کو چکنا چور کر دیا تھا مرہٹوں کے تمام قلعوں پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستیں اورنگ زیب کے آگے ہتھیار ڈال چکی تھی۔ پھر وہ اب تک سول اور فوجی دونوں محکموں کے انتظامات سنبھالے ہوئے تھا۔

۱۷۰۷ء میں جب اس کی عمر اکانوے سال ہوئی تو اس کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ وہ وقتی طور پر سنبھل گیا تھا مگر اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کا آخری وقت قریب

ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی موت کے بعد خانہ جنگی کو روکنے کے لیے، ہر ممکن کوشش کی۔ اس نے کام بخش کو بیجاپور کا گورنر مقرر کر کے ۲۰ فروری کو روانہ کر دیا اس کے چار دن بعد اورنگ زیب نے شہزادہ اعظم کو مالوہ کی گورنری دے کر بھیج دیا لیکن شہزادہ اعظم سفر کے دوران روزانہ کہیں نہ کہیں پڑاؤ کرتا تاکہ اس کی رفتار سست رہے اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر اس دوران اورنگ زیب وفات پا جائے تو فوراً واپس آسکے۔

۲۸ فروری کو اورنگ زیب شدید بخار میں مبتلا ہو گیا اس کے باوجود شہنشاہ تین دن تک دربار لگاتا رہا اور نماز پنجگانہ باقاعدگی کے ساتھ ادا کرتا رہا اس دوران اس نے شہزادے اعظم اور کام بخش کو خطوط بھی لکھے جن میں نصیحت کی گئی تھی کہ وہ رعایا کے ساتھ اچھا سلوک کریں اور خانہ جنگی کے بیج بونے کی بجائے بھائیوں کی طرح امن و سکون اور محبت کے ساتھ رہیں۔

اورنگ زیب نے ان خطوط میں فانی دنیا کی ہر فانی چیز کے بارے میں بھی بہت کچھ لکھا پھر ۳ مارچ ۱۷۰۷ء کو وہ علی الصبح اپنی خواب گاہ سے نکلا۔ اس نے فجر کی نماز ادا کی اور پھر تلاوت قرآن پاک شروع کی جس کے اختتام پر اس نے کلمہ پڑھا اور اس کے ساتھ بے ہوش ہو گیا۔ ایک روایت کے مطابق اورنگ زیب عالمگیر کا انتقال صبح آٹھ بجے ہوا۔

شہزادہ محمد اعظم شاہ جس نے دس دن میں صرف چالیس میل کا فاصلہ طے کیا تھا اورنگ زیب کی وفات کی اطلاع پا کر ۴ مارچ کو احمد نگر واپس آ گیا۔ شہزادے اعظم نے شہنشاہ کی تجہیز و تکفین میں حصہ لیا پر کچھ دیر جنازے کے ساتھ چلنے کے بعد واپس آ گیا۔ اورنگ زیب کا جنازہ دولت آباد سے چار میل کے فاصلہ پر شیخ زین الحق کے مزار کے قریب دفن کرنے کو بھیج دیا گیا۔ اس جگہ کا نام خلد آباد رکھا گیا اور اس کے ساتھ ہی اورنگ زیب کے نام کے ساتھ خلد مکان کے الفاظ سرکاری طور پر استعمال کئے جانے لگے۔

اورنگ زیب کی تمام زندگی یہی کوشش رہی کہ برصغیر پر ایک ایسی مضبوط حکومت قائم ہو جہاں انصاف کا دور دورہ ہو لیکن اس کے خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے۔ ہر چند کہ اس نے مرہٹوں کے تمام قلعوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ بیجاپور اور گولکنڈہ بھی سلطنت مغلیہ میں شامل ہو گئے تھے پھر بھی اورنگ زیب کی حکومت کا آخری دور لاقانونیت کی زد میں رہا۔ ضعیف العمری میں وہ بالکل تنہا رہ گیا تھا اور اس تنہائی کا اسے شدید احساس تھا۔ اس کے

تمام پرانے اور قابل اعتماد امرا اور دوست وفات پا چکے تھے۔ صرف ایک اسد خاں زندہ تھا جو نہ صرف اس کا وزیراعظم تھا بلکہ ایک قابل اعتماد دوست بھی تھا۔

آخری زمانہ میں اس کے دربار میں صرف جوان خون نظر آتا لیکن وہ جوان ذمہ داریاں سنبھالنے سے گریزاں اور سازشوں کے ذریعہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔

اورنگ زیب کو آخری زمانہ میں اپنی چاہتی بیٹی زیب النساء کی موت کا بھی شدید صدمہ برداشت کرنا پڑا تھا۔ اس کا باغی بیٹا شہزادہ اکبر تین سال سے جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اورنگ کی آخری بیٹی گوہر آرا نے بھی ایک سال پہلے اسے داغ مفارقت دیا تھا آخری وقت میں اس کا ساتھ صرف اس کی بہن زیب النساء نے دیا۔

اورنگ زیب کے سلسلہ میں اگر ایسٹ انڈیا کمپنی اور مکار انگریز تاجروں کا مختصر سا ذکر نہ کیا جائے تو باب نامکمل رہ جائے گا اس لیے انگریزوں نے بھی اورنگ زیب کو پریشان کرنے کی کوشش کی تھی مگر اورنگ زیب کے سخت انتظام اور مضبوط گرفت کی وجہ سے وہ کچھ نہ کر سکے تھے۔

انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۶۱۲ء میں سورت کی بندرگاہ سے تجارت کا آغاز کیا تھا۔ اس کمپنی نے آگرہ اور دہلی سے چیزیں حاصل کر کے انگلستان کی بنی ہوئی اشیاء وہاں فروخت کرنی شروع کر دیں۔ اس کمپنی کی ایک شاخ مسولی پٹم میں بھی تھی۔ بندرگاہ اس وقت قطب شاہ کے علاقہ میں شامل تھی انگریزوں نے ہری پور میں دو کارخانے بھی کھول دیئے پھر مدراس میں فورٹ سینٹ جارج کی بنیاد رکھی گئی یہ علاقہ مغل سلطنت میں شامل نہ تھا۔

۱۶۵۱ء میں انگریزوں نے ہگلی (بنگال) میں پہلا تجارتی دفتر کھولا۔ انگریز مختلف علاقوں سے ریشم، چینی اور اسی قسم کی اشیاء خرید کر باہر بھیجا کرتے تھے۔ اس وقت صوبہ بنگال کا گورنر شاہجہاں کا بیٹا شہزادہ شجاع تھا۔ اس نے انگریزوں کو تین ہزار روپے سالانہ کے عوض تجارت کرنے کی اجازت دیدی۔

دس سال بعد انگریزوں نے ہندوستان میں تمام انگریز دفاتر کی تنظیم نو کی جو دو آزاد حکومتوں کے قیام کے مترادف تھا۔ مدراس میں صدر دفتر تھا جہاں کمپنی کا سربراہ بیٹھتا تھا

اور سورت اور مدراس کی کمپنیاں اس کے ماتحت کام کرتی تھیں۔ بنگال میں تجارت بڑی تیزی سے بڑھی یہاں تک کہ اس صوبہ سے برآمدات کی مالیت ۳۴ ہزار پونڈ سالانہ ہو گئی۔ انگریزوں نے یورپ سے رنگ ساز بھی بلائے تاکہ وہ ریشم کے رنگ کا معیار بلند کر سکیں۔

شہزادہ شجاع کے بنگال سے واپس جانے کے بعد انگریزوں کو مغلوں سے کچھ شکایات پیدا ہو گئیں۔ پہلے وہ اپنی برآمدات پر سالانہ تین ہزار روپے بطور کسٹم ادا کیا کرتے تھے لیکن اب ان سے برآمدات کے اعتبار سے کسٹم وصول کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ انگریزوں کا کہنا تھا کہ ۱۶۸۰ء کو اورنگ زیب نے فرمان جاری کیا اس کے تحت ساڑھے تین فیصد ڈیوٹی ادا کرنی ہوتی تھی جبکہ انہیں مغل سلطنت میں تمام مقامات پر کسٹم کی ادائیگی کے بعد تجارت کرنے کی اجازت تھی۔

انگریزوں کو دوسری شکایت یہ تھی کہ راہداری کی فیس، تحائف، کلرک کی فیس اور شہنشاہ کے حکم کے تحت بعض مصنوعات کی مفت سپلائی کا سلسلہ ختم کیا جائے۔ انہیں تیسری شکایت یہ تھی کہ بعض افسران کا تجارتی سامان کھول کر معائنہ کرتے پھر بہت سا سامان کم قیمت پر خرید کر اسے مارکیٹ میں فروخت کر دیتے ہیں۔

جہاں تک انگریزوں کے پہلے مطالبہ کا تعلق تھا وہ ناجائز تھا کیونکہ مغل سلطنت میں تمام تاجروں پر ڈھائی فیصد کسٹم ڈیوٹی عائد تھی اس کے مقابلہ میں انگریزوں پر ایک فیصد زیادہ عائد کی گئی کیونکہ وہ جزیہ نہیں دیتے تھے۔ جہاں تک دوسرے اور تیسرے مطالبہ کا تعلق ہے۔ اورنگ زیب نے نہایت سختی کے ساتھ ایسے اقدامات کی ممانعت کر دی تھی اور ایسے اقدامات کو غیر قانونی قرار دیا تھا۔ لہٰذا جو کچھ کرتے وہ اورنگ زیب کے احکامات کے خلاف کرتے تھے۔

اس کے علاوہ اورنگ زیب کے دور حکومت کے دوسرے سال ہی راہداری ختم کر دی گئی تھی اورنگ زیب نے اپنے پوتے عظیم الشان کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ انگریزوں سے زبردستی یا کم قیمت پر کوئی چیز حاصل نہ کرے لیکن انگریزوں نے بعض افسروں کے ساتھ مل کر بدعنوانیاں شروع کیں تو ان افسران نے بھی انگریزوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا اورنگ زیب کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ہر جگہ موجود ہوتا۔

جب مغل حکومت نے انگریزوں کے یہ ناجائز مطالبات منظور نہیں کئے تو انہوں نے

طاقت کے زور پر اپنے مطالبات منوانے کی کوشش شروع کر دی اور بنگال میں جنگ شروع ہو گئی۔ ہوا یہ کہ مغل کمانڈار نے تین انگریز سپاہیوں کو گرفتار کر لیا اس کے جواب میں انگریزوں نے ہگلی کے شہر کو نذر آتش کر کے ایک مغل جہاز اپنے قبضہ میں لے لیا اور بہت سی شاہی کشتیوں کو آگ لگا دی۔ پس بنگال کے گورنر شائستہ خان نے تمام انگریز کارخانوں پر قبضہ کر لیا انگریز ہگلی سے فرار ہو گئے انہوں نے ستیا برج کے قریب ایک عمارت کو آگ لگا دی تھانہ کے حلقہ پر حملہ کر دیا اور اس کے بعد انہوں نے ایک جزیرہ پر بھی قبضہ کر لیا۔

خلیج بنگال میں انگریزوں کی فوجیں اکٹھا ہو گئی تھیں۔ انہوں نے بالا شور کے شہر کو لوٹ کے آگ لگا دی اور مغل جہازوں کو تباہ کر دیا گورنر نے فوراً انگریزوں کی سرکوبی کے لیے فوج روانہ کر دی انگریزوں نے فوراً جزیرہ خالی کر دیا پھر اگست ۱۶۸۷ء میں شائستہ خاں نے انگریزوں کو نئی شرائط کے تحت تجارت شروع کرنے کی اجازت دیدی۔

آئندہ سال ہیتھ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایجنٹ بنا کر بھیجا گیا اس نے بنگال خالی کر دیا اور چٹا گانگ کو تجارت کے لیے ایک محفوظ اور آزاد اڈہ بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ اس نے آتے ہی بالا سور کے قلعہ کے نقصان پہنچایا اور لوگوں پر انتہائی مظالم ڈھائے۔ لیکن ہیتھ کو مدراس واپس بلا لیا گیا۔

اورنگ زیب کو انگریزوں کی ان کارستانیوں کی اطلاع ملی تو اس نے انگریزوں کی گرفتاری کا حکم دیدیا اور پوری مغل سلطنت میں ان کی تجارت پر پابندی لگا دی مگر جلدی ان سے صلح ہو گئی کیونکہ حاجیوں کے جہازوں کو سمندروں میں محفوظ رکھنا ضروری تھا اور انگریز سمندر میں طاقتور تھے۔ ۱۶۹۰ء میں انگریزوں سے ایک معاہدہ ہو گیا اور بنگال کے نئے گورنر ابراہیم خاں نے انگریز ایجنٹ "چارنوک" کو کلکتہ آنے کی اجازت دیدی اور یہی وہ دن تھا جب شمالی ہند میں برطانوی اقتدار کی بنیاد پڑی۔

اس کے بعد ایک اور انگریز بحری قزاق ولیم کڈ اپنے تین سو ہمراہیوں کے ساتھ بحر ہند پر قابض ہو گیا۔ اس نے افریقہ کے جزیرہ مڈغاسکر میں اپنا اسلحہ خانہ بنایا اور وہاں سے پورے بحر ہند میں جہازوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ اس نے ایک ممتاز مغل امیر مخلص خاں کے ایک جہاز پر، اور ایک ولندیزی (ہالینڈ) کے بحری قزاق نے سورت کے حسن ہمدان کے جہاز پر قبضہ کر لیا جو تقریباً پندرہ لاکھ کی مالیت کا تھا۔

ان حالات سے تنگ آ کر مغل حکومت نے انگریزوں ' فرانسیسیوں اور ولندیزوں کے تمام کارخانوں میں بند کرا دیا اور ان کے دوستوں کو بھی سزا دی۔ اس کے بعد ایک اور معاہدہ ہوا جس کے تحت ولندیزوں نے حاجیوں کے جہازوں کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کی۔ انھوں نے ستر ہزار اور انگریز نے تیس ہزار ہرجانہ ادا کیا اور خلیج فارس میں مغل جہازوں کی ذمہ داری قبول کی۔

مگر قزاقوں نے پھر بد عہدی کی۔ انھوں نے سورت کے دو جہاز قبضہ میں لے لئے۔

اس پر سورت کے نئے گورنر اعتبار خاں نے انگریزوں' ولندیزیوں اور مقامی ولندیزیوں سے چھ لاکھ روپیہ بطور ہرجانہ وصول کیا تاہم شہنشاہ اورنگ زیب نے اتنے زیادہ ہرجانہ پر اعتراض کیا اور کچھ رقم انہیں واپس کرا دی اس کے باوجود بد عہد انگریزوں اور ولندیزیوں نے اپنی کارروائیاں جاری رکھیں اور ولندیزیوں نے ایک بار پھر مکہ سے آنے والے زائرین حج کے ایک جہاز پر قبضہ کر لیا۔ جب اورنگ زیب نے محسوس کیا کہ بحری قزاقوں پر انگریزوں اور ولندیزی تاجروں کا کوئی اختیار نہیں تو اس نے فرمان جاری کر دیا کہ تاجروں سے کوئی جرمانہ نہ وصول کیا جائے کیونکہ وہ بے گناہ ہیں۔

اورنگ زیب کا شمار برصغیر کے اہم ترین حکمرانوں میں ہوتا ہے۔ ہندوؤں اور انگریزوں نے اورنگ زیب کو بدنام کرنے کے لیے بہت سے الزام تراشے ہیں مگر یہ حقیقت ہے اورنگ زیب نے کسی مذہب کے لوگوں سے کوئی ناروا سلوک نہیں کیا۔ وہ شروع ہی سے انصاف پسند انسان تھا۔ اس کی پوری زندگی شریعت اسلامی کی پیروی میں گزری۔

اورنگ زیب حلال کمائی پر یقین رکھتا تھا یہی وجہ ہے کہ شہنشاہ ہونے کے باوجود اس کی زندگی سادگی کے ساتھ گزری اسے عیش و عشرت سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اگرچہ ایام شہزادگی میں اس کی طبیعت میں کچھ رنگینی تھی لیکن بادشاہت کی ذمہ داری پڑتے ہی اس سے تمام کام چھوٹ گئے اور وہ ایک دیندار بادشاہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی تمام زندگی امور سلطنت اور حکومت کے استحکام کی کوششوں میں گزری۔ جھوٹ سے نفرت اور انصاف سے محبت اس کی طبیعت کا خاصہ تھا۔

اورنگ زیب صبر و تحمل سے کام لیتا تھا۔ اسی لیے اس نے ابتدائی زندگی ہی سے

اپنے آپ کو حکومت کی ذمہ داری سنبھالنے کا اہل بنا لیا تھا۔ خود اعتمادی' علم' قوت ارادی اور اپنے آپ پر گرفت' یہ وہ خوبیاں تھیں جنہیں اورنگ زیب نے اپنایا علم سے اسے اس قدر عشق تھا کہ موت کے دن تک شدید علالت کے باوجود وہ مطالعہ میں مصروف رہا۔ اسے عربی زبان سے لگاؤ اور فارسی زبان پر عبور حاصل تھا۔ فتاویٰ عالمگیری' قانون شریعت کی منہ بولتی تصویر ہے جس سے عالمگیر کی ذہانت اور مذہب سے بے پناہ عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔

اورنگ زیب نے تخت نشینی سے قبل اپنی ذہانت اور حسن سلوک سے بڑے بڑے درباریوں کو اپنا دوست بنا لیا تھا۔ اس کی ذاتی زندگی' لباس' خوراک' سادگی کا نمونہ تھی۔ شان و شوکت اور دولت و امارت سے اسے ذرہ برابر لگاؤ نہ تھا۔ وہ اپنے آباؤ اجداد کی طرح بہت سی شادیاں بھی کر سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ نرمی کے وقت نرم خو اور سختی کے وقت آہن کی طرح سخت ہو جاتا تھا۔

خوشامد اور غیبت سے اورنگ زیب کو سخت نفرت تھی وہ ان باتوں کو برداشت ہی نہ کر سکتا تھا بلاشبہ وہ اپنے وقت کا ایک ذہین' زیور علم سے آراستہ اور وسیع النظر انسان تھا۔ اس نے عوام کا معیار زندگی بلند کرنے اور انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ وہ شاہی خزانے سے ایک پائی بھی لینا حرام سمجھتا تھا۔ اس کا معمول تھا کہ علی الصبح بیدار ہوتا' نماز فجر ادا کرتا' تلاوت کرتا پھر قرآن حکیم کی کتابت کرتا کلام پاک کے کئی نسخے اس نے اپنے ہاتھ سے لکھے۔ اس کے فارغ اوقات عبادت میں گزرتے یا وہ کلاہ (ٹوپیاں) تیار کر کے انہیں فروخت کرا دیتا۔ بس اسی رقم پر اس کی بسر اوقات ہوتی تھی۔ اورنگ زیب حافظ قرآن تھا اور چوبیس گھنٹے میں صرف تین ساڑھے تین گھنٹے آرام کرتا تھا۔

شہزادہ اعظم کے نام اس نے اپنے ایک خط میں لکھا۔

"میری پیدائش پر لا تعداد لوگوں نے جشن منائے مگر بوقت رخصت میں تنہا ہوں زندگی کے مقاصد عظیم ہوتے ہیں۔ مجھے ان لمحات کے ضیاع کا شدید صدمہ ہے جو خدا کی عبادت اور اس کی یاد کے بغیر گزرے۔ کاش میں لوگوں کی

خدمت اپنی حسب منشاء کر سکتا۔ اسی لیے بعض وقت
احساس ہوتا ہے کہ میری زندگی بے مقصد تھی جو بیکار
گزری۔ مگر اب سوائے تاسف کے اور کیا ہو سکتا ہے۔
وقت اپنی یادوں کے نقوش ثبت کر جاتا ہے۔ میں بے حد
کمزور ہوں اور دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے اپنے گناہوں
کا ایک بار عظیم موجود ہے۔ خدا رحیم اور کریم ہے۔ شاید
میری بخشش کا سامان مہیا کر دے"۔

اورنگ زیب نے حکومت سنبھالتے ہی پرانے صوبوں میں تبدیلیاں کیں اور ان کی حد بندی از سر نو کی گئی اس کے دور میں صوبوں کی تعداد ۲۱ ہو گئی تھی اورنگ زیب نے سلطنت کو اتنی وسعت دی جو اس سے قبل دور مغلیہ کو نصیب نہ ہوئی تھی۔

اورنگ زیب پر مذہبی تعصب کا الزام عائد کیا جاتا ہے حالانکہ اس نے کسی وقت بھی ہندوؤں سے ناروا سلوک نہیں کیا قانون شریعت کا اطلاق ہندوؤں پر نہ تھا وہ صرف جزیہ دیتے تھے اور اپنے مذہب کے عقائد اور رسومات کے تحت زندگی گزارتے تھے۔ ان کے مقدمات کا فیصلہ بھی ان کے قوانین کے تحت کیا جاتا تھا۔ ان کے لیے ہندو جج مقرر کیے گئے تھے۔ انہیں عبادت کرنے اور اپنے تہوار منانے کی مکمل آزادی تھی۔ صرف اخلاقی قوانین کا اطلاق ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں پر یکساں ہوتا تھا۔

"ہندو اہم عہدوں پر فائز تھے۔ ان کا کاروبار چمک رہا تھا۔ بہت سے جاگیردار تھے اور آرام سے زندگی بسر کر رہے تھے"۔ یہ بیان ایک ہندو مورخ موجمدار کا ہے۔

اسی طرح دور عالمگیری کے ایک ہندو شاعر بھگوت داس نے کہا ہے۔

"اورنگ زیب ایک قابل احترام بادشاہ ہے ہر مذہب کے
لوگ آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں اور سب اس سے
محبت کرتے ہیں"۔

ایک اور ہندو مصنف سری رام شرما نے اورنگ زیب کے بارے میں کہا ہے۔

اورنگ زیب کے دور حکومت میں ہندو جن عہدوں پر
تھے ان کی تفصیل اس طرح ہے۔

منصب	ہندوؤں کی تعداد
سات ہزاری منصب	۳
چھ ہزار پر	۷
پانچ ہزاری پر	۱۶
چار ہزاری پر	۱۱
ساڑے تین ہزاری پر	۵
تین ہزاری پر	۲۱
ڈھائی ہزاری پر	۱۱
دو ہزاری پر	۴۶
ایک ہزاری پر	۳۳

ان منصب داروں میں ایسے ہندو بھی تھے جو اورنگ زیب کے بد ترین دشمنوں کے قریبی عزیز تھے مثلاً

۱۔ اچلاجی — شیواجی کا داماد تھا
۲۔ بداجی — شیواجی کا خالہ زاد بھائی تھا
۳۔ راجہ شیواجی کا پوتا تھا

اورنگ زیب کے عہد کے گیارہویں سال میں موسیقی کو ختم کر دیا گیا۔ جو موسیقار دربار سے وابستہ تھے انہیں الگ کر دیا گیا۔ اس سے اگلے سال اورنگ زیب نے تخت نشینی کے موقعہ پر بادشاہ کو سونے میں تولنے کی رسم کو بند کر دیا۔ اس کے بعد سکوں پر کلمہ طیبہ کندہ کرنے کی بھی ممانعت کر دی کیونکہ اس طرح کلمہ کی بے حرمتی ہوتی تھی۔

اورنگ زیب نے نجومیوں کو بھی دربار سے الگ کر دیا۔ قیمتی دھاتوں کے بنے ہوئے قلمدان دربار سے اٹھوا دیئے۔ سونے چاندی کے تاروں سے شاہی ملبوسات کی تیاری بھی ممنوع قرار دیدی۔ تمام منشیات پر سخت پابندی عائد کر دی گئی۔ عصمت فروشی کا کاروبار ممنوع قرار دے کر یہ کاروبار کرنے والی عورتوں کو شادی کا حکم دیا گیا۔ ہندوؤں کی ستی کی رسم پر پابندی لگا دی۔ اورنگ زیب نے ہجری کلنڈر کا استعمال شروع کر دیا۔ ہندوؤں کو بکرمی سال استعمال کرنے کی اجازت تھی۔

اورنگ زیب نے ہندوؤں کے مندروں کی حفاظت کے بھی انتظامات کئے۔ اورنگ زیب پر جن مندروں کے گرانے کا الزام ہے دراصل وہ ایسے مندر تھے جنہیں ہندوؤں نے مسجدیں شہید کرنے کے بعد ان کی بنیادوں اور دیواروں پر مندر بنوائے تھے یا پھر اورنگ زیب نے ایسے مندروں کو گرانے کا حکم دیا جہاں ہندوستان بھر کے تمام بڑے بڑے پنڈت' راجپوت' مرہٹے اور جاٹ مل کر بیٹھتے تھے اور سلطنت مغلیہ کو ختم کرنے کے منصوبے بنایا کرتے تھے۔

ہندوؤں کے مذہب اور تہواروں کے بارے میں یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ اس نے ہندوؤں کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے تہوار گھروں کے اندر منایا کریں اس الزام کی حقیقت یہ ہے کہ گورنر گجرات نے شہنشاہ اورنگ زیب کو لکھا تھا کہ گجرات کے ہندو ہولی دیوالی کے تہواروں پر بہت ادھم مچاتے ہیں۔ وہ آگ جلاتے ہیں تو مسلمانوں کی چیزیں بھی چھین کر اس میں ڈال دیتے ہیں۔ گجرات کے گورنر کے اس خط کے جواب میں اورنگ زیب نے یہ فرمان جاری کیا تھا کہ چونکہ ہندو ہولی اور دیوالی کے تہواروں پر شراب پی کر گلیوں اور محلوں میں شور کرتے ہیں اور غلیظ قسم کی گالیاں ایک دوسرے کو دیتے ہیں اس لیے ہندوؤں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اس طرح کی حرکتوں سے باز آئیں اور ان تہواروں کو اپنے گھروں کی حدود میں منایا کریں۔

طرح طرح کے رنگوں سے ایک دوسرے کے کپڑے رنگنا ہندوؤں کے تہوار کا ایک حصہ ہے لیکن مسلمانوں کو اس سے اس لیے تکلیف ہوتی تھی کہ ان کے نمازی کپڑے رنگ کے گندے پانی سے خراب ہو جاتے تھے اس لیے وہ کوتوال شہر سے شکایت کرتے تھے۔ اس طرح کی شکائتیں جب شہنشاہ تک پہنچیں تو اس نے تہواروں کو گھروں کے اندر منانے کا حکم دیا۔

اورنگ زیب کی سلطنت کشمیر سے کاویری تک اور آسام سے کابل تک پھیلی ہوئی تھی اس کے باوجود اس کا قانون اس قدر سخت تھا کہ بڑے سے بڑا حاکم قانون شکنی نہیں کر سکتا تھا۔ اورنگ زیب' افسروں اور قانون کے معاملہ میں اپنے عزیزوں کی بالکل پروا نہ کرتا تھا۔ وہ خود افسر مقرر کرتے وقت اپنے عزیزوں کے بارے میں کوئی رعایت نہ کرتا اور تمام محکموں کو حکم تھا کہ وہ ملازم رکھتے وقت صرف امیدوار کی اہلیت اور قابلیت دیکھیں یہ نہ

دیکھیں کہ وہ کس کا بھائی ہے اور کس کا بیٹا ہے۔

اورنگ زیب جب کسی کو حاکم بناتا تو اسے زبانی اور تحریری ہدایات دیتا تھا اور عوام کو حکم تھا کہ اپنے حاکم یا خود شہنشاہ کے پاس اپنی شکایت لے کر حاضر ہو سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ گورنر تک کسی پر زیادتی کرنے کی جرات نہ کرتا تھا اور اورنگ زیب کا خود قول ہے کہ اسے کسی کے ساتھ انصاف کر کے جو خوشی حاصل ہوتی ہے وہ اور کسی کام سے حاصل نہیں ہوتی۔

اورنگ زیب کی حکومت کے ۲۱ اور بعض روائتوں کے مطابق ۲۴ صوبے تھے ہر صوبہ کا سربراہ گورنر ہوتا ہے اس کے ماتحت محتسب' قاضی' دیوان اور بخشی ہوتے۔ فوج کا صوبائی سربراہ کماندار (کمانڈو) کہلاتا تھا۔ ماتحت افسران' گورنر کو گورنر' شہنشاہ کو جواب دہ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ رپورٹنگ کا ایک خفیہ ادارہ ہوتا۔ یہ واقعہ نویس کہلاتے تھے۔ یہ لوگ براہ راست شہنشاہ کے ماتحت ہوتے تھے اور اپنے علاقہ کے خاص خاص حالات سے شہنشاہ کو آگاہ کرتے تھے چونکہ یہ گورنر کے ماتحت نہ ہوتے تھے اس لیے گورنر کے بارے میں بھی بالکل صحیح رپورٹ شہنشاہ کو روانہ کرتے۔ اس محکمہ کی اس قدر قدر تھی کہ اگر گورنر کے خلاف رپورٹ جاتی جسے "پرچہ لگانا" کہا جاتا تھا تو گورنر تک اس رپورٹ پر معزول کر دیا جاتا تھا۔

اورنگ زیب سے پہلے عوام ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبے ہوتے تھے۔ ان ٹیکسوں کی تعداد ساٹھ سے اسی تک تھی اورنگ زیب نے لا تعداد ٹیکس منسوخ کر دیئے اس سے اگرچہ سرکاری خزانہ کو نقصان پہنچا مگر پیداوار میں اضافہ ہوا جس سے مالیہ زیادہ ملا اور حکومت کا یہ خسارہ اس سے پورا ہو گیا۔ مسلمانوں سے زکات اور ہندوؤں سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا جزیہ دینے والے ہندوؤں پر کوئی اور ٹیکس نہیں لگتا تھا۔

اورنگ زیب نے پچاس سال حکومت کی۔ اس کے سکے ایسے مقامات پر ڈھلے جہاں اس سے پہلے نہیں ڈھلتے تھے۔ اس کے ٹکسالوں کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

"اکبر آباد (آگرہ) لاہور۔ شاہجہان آباد (دہلی) برہان پورہ' پٹنہ' سورت' کٹھ' کابل' اجمیر' ملتان' ٹرنول' جوناگڑھ' اٹاوہ' اورنگ زیب آباد' گولکنڈہ' مچھلی بندر' احمد نگر' بیجا پور' خیپا پٹن (مدراس) نصرت آباد بریلی' لکھنؤ' عالمگیرپور' ظفرپور اور ظفر آباد۔

فتح واکن کسیرا اورنگ زیب کی آخری بڑی فتح بیان کی جاتی ہے اس نے اس مہم کی ایک ایک بات کی نگرانی کی کہا جا سکتا ہے کہ اس مہم نے اس کے جسم پر کیا کیا اثرات ڈالے کہ جب وہ اس سے آٹھ میل کے فاصلہ پر دیوا پور کے قصبہ میں آرام کے واسطے رکا تھا تو اسے اپنے جسم کی ہر توانائی ساتھ چھوڑتے ہوئے محسوس ہو رہی تھی۔

اس کی بیماری نے پورے لشکر کو دل شکستہ کر دیا تھا۔ ہر شخص پریشان تھا کہ اگر شہنشاہ انتقال کر گیا اور تمام نظام تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر جائے گا۔ خود اورنگ زیب کو بھی اس کا احساس تھا اور یہ اس کی خود اعتمادی تھی کہ صرف دو ہفتہ بیمار رہنے کے بعد اس نے خود کو اپنے معمول کے کاموں میں مصروف کر لیا۔ وہ شکائتیں اور عرضیاں سنتا احکام اور فرمان جاری کرتا دربار لگاتا اور نئے مفتوحہ علاقوں کے نظم و نسق میں دلچسپی لیتا تھا۔

دیوا پور کا قیام عارضی تھا۔ بیماری نے صحت پانے اور وہاں کا انتظام کرنے کے بعد اورنگ زیب احمد نگر روانہ ہوا اور ڈیڑھ ماہ کے سفر کے بعد بہادر گڑھ پہنچا۔ وہاں اس نے رمضان کا مہینہ گذارا۔ باوجود ضعیف اور کمزور ہونے کے اس نے رمضان کے پورے روزے رکھے پھر عید میں اپنی فوج کی مسرتوں میں حصہ لیا اس کے بعد پھر احمد نگر روانہ ہوا۔ احمد نگر میں وہ ایک سال ٹھہرا اور یہ سال اس کی زندگی کا آخری سال تھا۔

اورنگ زیب نے تیس سال تک مرہٹوں سے جنگ کی۔ مرہٹوں پر اس کا اتنا رعب تھا کہ جب وہ دیوا پور سے بہادر گڑھ کی طرف بڑھ رہا تھا تو اس کے کیمپ سے تھوڑے فاصلہ پر مرہٹوں کی ایک بڑی فوج موجود تھی مگر اس بڑی فوج نے شہنشاہ کی پالکی پر حملہ کرنے کی جرات نہ کی بلکہ جب شہنشاہ نے خان عالم کو مرہٹوں کی فوج کی طرف بھیجا تو مرہٹے سر پہ پیر رکھ کر اس طرح بھاگے جیسے اس کا وجود محض ایک افواہ تھی۔

اسی دوران مرہٹے، اورنگ آباد کی سرحد پر ظاہر ہوئے مگر جب بادشاہ نے نصرت جنگ کو ان کے تعاقب میں بھیجا تو مرہٹے بھاگے اور نصرت جنگ انہیں ساٹھ میل تک بھگاتے چلے گئے۔ انہوں نے مرہٹوں کو قدم قدم پر مارا اور انہیں کسی جگہ قدم نہیں جمانے دیئے۔ یہاں تک کہ مرہٹوں کو مہادیو کی پہاڑیوں میں چھپ جانا پڑا۔ چنانچہ اگر یہ کیا جائے کہ بادشاہ کی زندگی کے آخری دنوں میں مرہٹوں کے پاس مہادیو کی پہاڑیاں یا دوسری تنگ اور ناقابل عبور جگہیں تو مرہٹوں کی پناہ گاہیں باقی رہ گئی تھیں ورنہ ان کے پاس چھ سو میل

کے پورے علاقہ میں ایک قلعہ بھی باقی نہ رہ گیا تھا جس پر مغلوں نے قبضہ نہ کر لیا ہو۔

یہی نہیں بلکہ مرہٹوں سے چھینے ہوئے اس پورے علاقہ میں اورنگ زیب کو عدل و انصاف اور امن و امان کا نگراں سمجھا جاتا تھا۔ اس سارے علاقہ کے لوگ دعائیں مانگتے تھے کہ اورگ زیب کا سایہ ان کے سروں پر رہے۔ جب علاقہ مرہٹوں کے پاس تھا تو عوام، مسلمانوں کی آمد کی آرزو کرتے تھے۔

اس زمانہ میں سوزت میں انگریزی فیکٹری کے ایک مینجر نے دوسری فیکٹری کے نام ایک مراسلہ لکھا جس کا مفہوم یہ تھا۔

> "ہماری پریشانیاں روز بروز بڑھ رہی ہیں اور ہم اپنے کارخانہ کی ترقی کا اس وقت تک کوئی توقع نہیں رکھتے جب تک سیواجی مرہٹے کا راج ہے۔ اس نے اور اس کے آدمیوں نے ملک کو اس بری طرح لوٹ لیا ہے کہ لوگوں کے پاس آئندہ فصل کے لیے بیج تک نہیں اور آئندہ سال غلہ کی کمی کے سبب لوگ ایک دوسرے کو کھائیں گے۔ تمام لوگ دعائیں مانگتے ہیں کہ مسلمان پھر سے آ جائیں اور اس ملک پر دوبارہ قبضہ کر لیں"۔

اورنگ زیب کی بے تعصبی کے بارے میں ہندو مورخ سری رام شرما نے لکھا ہے۔

> "اورنگ زیب ہندوؤں کو ان کے تہواروں پر تحفے تحائف اور انعامات سے نوازتا تھا۔ دسہرے پر تو انعامات کی بارش ہو جاتی"۔

اس طرح ایک مغربی سیاح مسٹر برنیر جو اورنگ زیب عالمگیری کے دور سے تعلق رکھتا ہے اس نے لکھا ہے۔

> "میں نے دیکھا ہے کہ دسہرہ کے موقعہ پر گنگا اور جمنا پر ہندو اشنان (غسل) کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ دریا کے دونوں کناروں پر دکانیں لگتی اور میلہ ہوتا ہندو عورتیں، مرد اور بچے، مقدس پانی میں غسل کرتے وہ اورنگ زیب عالمگیر کو

تحفے تحائف پیش کرتے اور شہنشاہ انہیں قبول کرنے کے
بعد انہیں بھی انعام و اکرام اور تحائف سے نوازتا۔ یہ
تحائف بسا اوقات ہاتھیوں تک پر مشتمل ہوتے تھے"۔

مسٹر برنیر کا ذکر آیا ہے تو اس کتاب کے آخری صفحات میں اسی حوالے سے اورنگ زیب عالمگیر کے بارے میں دو رائیں بھی سنتے چلیے۔ یہ دونوں واقعات میں نے بہت عرصہ پہلے کسی جگہ پڑے تھے اور اس کی سند یاد نہیں پڑ رہی تھی۔ اب خیال آیا ہے کہ شاید میں نے یہ دونوں واقعے "شاہجہاں کے ایام اسیری" نام کی کتاب میں پڑھے ہیں۔ یہ خیال اس وجہ سے آیا اس کتاب میں مسٹر برنیر کے حوالے سے بہت سے واقعات کئے گئے ہیں اگر مسئلہ درست ہے تو اپنے حافظہ کے لیے اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں اور سند غلط ہے تو پڑھنے والوں سے التماس ہے کہ جس کسی کو صحیح سند کا علم ہو وہ مجھے لکھ کر ضرور بھیجیں۔ ان کا شکریہ میں پہلے سے ادا کر رہا ہوں اور سند روانہ کرنے پر ایک الگ خط انہیں "شکریہ" کے طور پر لکھوں گا۔

اورنگ زیب کا پہلا واقعہ اس وقت کا ہے جب اس نے نئی نئی شہنشاہی سنبھالی تھی۔ اورنگ زیب کا والد سابق شہنشاہ ہند شاہجہاں قلعہ آگرہ میں قید تھا اور اورنگ زیب اکثر باپ کو دیکھنے یا مزاج پرسی کے لیے اس کے پاس جایا کرتا تھا۔ خیال رہے کہ اورنگ زیب باپ کو قید کر دینے کے باوجود اس نے ظل اللہ اور اعلی حضرت کر کے مخاطب کرتا تھا۔

ایک بار جب اورنگ زیب باپ کو دیکھنے گیا تو اس نے پوچھا۔

"عالی جاہ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟"

شاہجہاں نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔

"شکریہ۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں"۔ پھر ذرا رک کے کہا۔ "ہاں اگر ممکن ہو سکے تو چند بچوں کو میرے پاس پڑھنے کے لیے بھجوا دیا کرو کہ میری تنہائی ختم ہو جائے۔ اکیلے بیٹھے بیٹھے طبیعت گھبرا جاتی ہے؟"

اورنگ زیب نے اس درخواست یا مطالبہ کو غور سے سنا۔ کچھ سوچا اور بولا۔

"عالی جاہ۔ اس خیال کو دماغ سے نکال دیجئے۔ حکومت کی باگ دوڑ آپ کے ہاتھوں سے نکل چکی ہے مگر حکم چلانے کا چسکہ ابھی تک ذہن کے گوشوں میں جاگزیں ہے۔ آپ کا

دل نہیں گھبراتا بلکہ بچے اس لیے پڑھانا چاہتے ہیں کہ بچوں پر حکم چلا کر آپ کی اپنی حکمرانی کے چسکے اور جذبہ کو سکون دینا چاہتے ہیں۔ نہیں یہ اب نہیں ہو سکتا"۔

اور اورنگ زیب نے صاف انکار کر دیا۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ اورنگ زیب نے شاہجہاں کے ساتھ کیا سلوک کیا بلکہ بتانا یہ مقصود ہے کہ اورنگ زیب کس قدر ذہانت اور ذکاوت کا مالک تھا۔ انسانی سرشت کو سمجھنے کا اس میں کس قدر مادہ تھا۔ اس نے فوراً سمجھ لیا کہ شاہجہاں بچوں کو پڑھانے کے بہانے اپنے حکمرانی کے جذبہ کو بہلانا اور سلانا چاہتا ہے۔

اورنگ زیب کا دوسرا واقعہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ یہ تو کسی جگہ لکھا جا چکا کہ شہنشاہ نہایت لحیم و شحیم اور پہلوان قسم کا انسان تھا۔ اورنگ زیب ہر عید پر باپ سے ملنے جاتا تھا۔ عید سے چند دن پہلے شاہجہاں نے وزیراعظم کی معرفت اورنگ زیب کے پاس پیغام بھیجا کہ مجھے قید میں کئی سال گذر چکے ہیں۔ دل کی کدورتیں ختم ہو چکی ہیں مگر اورنگ زیب اب تک کسی عید پر بھی مجھ سے گلے نہیں ملا کہ باپ کے دل کو بیٹے کی قربت اور خوشبو سے تقویت حاصل ہو۔

اورنگ زیب تک شاہجہاں کا پیغام پہنچ گیا اور کچھ ہی دن بعد اورنگ زیب نے جواب بھجوایا کہ اس عید پر ہم اعلیٰ حضرت سے گلے ملیں گے۔ چنانچہ اورنگ زیب نماز عید کے بعد پہلے تمام بڑے بڑے سرداروں اور امیروں سے ملا پھر شاہی قید خانہ گیا کہ شاہجہاں کی آرزو پوری کرے اس وقت شہنشاہ اورنگ زیب پوری شاہی پوشاک سے ملبوس تھا۔ شاہی لباس سے ہیرے جواہرات ٹکے ہوئے تھے اور سچے موتی کی لڑیاں بھی ہوتی تھیں جو ملنے میں آواز دیتی تھیں اور ان آوازوں سے لوگوں کو دور ہی سے معلوم ہو جاتا تھا کہ شہنشاہ کی سواری آ رہی تھی۔

چنانچہ شہنشاہ اپنے چند امیروں کے ساتھ باتیں کرتا ہوا شاہجہاں کے سامنے پہنچا۔ شاہجہاں گھنگروؤں اور موتیوں کی جھنکار سے سمجھ گیا کہ اورنگ زیب آ رہا ہے۔ اس کے علاوہ اورنگ زیب اپنی اونچی آواز میں گفتگو کرتا آ رہا تھا کہ اس کے آنے کی خبر بہت دور ہی سے مل گئی۔ یہ بات واضح رہے کہ شاہجہاں کی آنکھیں اس قدر کمزور ہو گئی تھیں کہ وہ قریب سے آدمی کو بھی نہیں پہچان سکتا تھا۔ چنانچہ شاہجہاں بیٹے کے استقبال اور اس سے

گلے ملنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اورنگ زیب جوں جوں قریب آتا گیا شاہجہاں کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی گئیں پھر اورنگ زیب نے اس کے بالکل قریب پہنچ کے کہا۔

"اعلیٰ حضرت۔ میں آپ کی خواہش کے مطابق آپ سے گلے ملنے آ گیا ہوں"۔

موتیوں کی جھنکار کے ساتھ شاہجہاں کی طرف بڑھا اور اس نے خود کو باپ کے کھلے بازوؤں میں دے دیا۔

پھر لوگوں نے دیکھا کہ طیم سخیم شاہجہاں نے شاہی لباس میں ملبوس اورنگ زیب کو اپنے بازوؤں میں اس قدر زور سے دبایا کہ اس کی صرف ایک چیخ نکلی اور اس کے ساتھ اس کی گردن ایک طرف لٹک گئی۔

پھر شاہجہاں بڑے فخر اور حسرت سے بولا۔

"تم لوگ گواہ رہنا کہ آپ میں نے اورنگ زیب کو اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ کر ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے"۔

اس وقت قریب سے آواز آئی۔

"عالی جاہ۔ آپ نے درست فرمایا۔ مگر انسان کی جان صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔ آپ نے شاہی لباس میں ملبوس جس شخص کو اپنے بازوؤں میں جکڑ کر موت کے گھاٹ اتارا ہے وہ اورنگ زیب بلکہ اس کا غلام ہے۔ میں نے آپ کی درخواست سنتے ہی سمجھ لیا تھا کہ آپ گلے ملنے کے بہانے مجھے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ مگر ——————"

اور شاہجہاں شرمندہ ہو کر رہ گیا۔

ختم شد۔